(جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں)

میری جدوجہد

مصنفہ

ہر اڈولف ہٹلر۔ ڈکٹیٹر جرمنی

وہ معرکۃ الآرا تصنیف جو دنیا بھر کی مہذب زبانوں میں ترجمہ ہو کر

۲۶ لاکھ سے زائد فروخت ہو چکی ہے

اور جس کے انگریزی ترجمے کی ایک مہینے کے اندر چھ ایڈیشنیں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں

مترجم

سری بت شانتی نارائن جی سابق ایڈیٹر بندے ماترم لاہور۔ سوراجیہ الہ آباد

مترجم گیتا رہسیہ (اردو) مصنف لوکمانیہ بھگوان تلک۔ مصنف نارائن رام چرتر۔ کرشن چرتر

پبلشرز

مسیرز نارائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

قیمت فی جلد

بار سوم

میری جدوجہد!

فہرست مضامین

پہلا حصہ

دوسرا حصہ

لالہ خل محمد پرنٹر

ملاپ الیکٹرک پریس لاہور۔

پبلشر

بلراج سہگل

پروپرائیٹر

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب

لوہاری گیٹ لاہور

نذر

جملہ ہندوستانی قوم پرست محبانِ وطن

کی

خواہ وُہ کسی بھی نقطۂ خیال کے کیوں نہ ہوں

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
گر نوشتہ است پند بر دیوار

ناچیز بارِ این مترجم



پہلا اڈیشن دسمبر ۱۹۳۸ء
دوسرا اڈیشن ستمبر ۱۹۳۹ء
تیسرا اڈیشن اپریل ۱۹۴۰ء

چند ابتدائی الفاظ

آج دُنیا میں اگر کوئی شخص اپنی پُرتشدد وحشیانہ قومی طاقت کے لحاظ سے
سب سے زیادہ زبردست و طاقت ور کہا جا سکتا ہے۔ تو بلاشک وشبہ وُہ ہر اڈولف
ہٹلر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نپولین بھی اپنے زمانہ میں ایک عظیم الشان ہستی ہو گذرا
ہے لیکن بلا خوف مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ آج جو عظمت ہیبت اور شان ہٹلر
کی ہے۔ وُہ اپنے وقت میں نپولین کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور جس رعب و داب سے
ایک قطرہ خون بہائے بغیر ہی اس نے آسٹریا اور زیکو سلاویہ کے اُن حصص پر
قبضہ حاصل کر لیا ہے۔ جو شاید ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے سے آسٹریا کے
قبضہ میں تھے۔ اور جنہیں تقریباً بیس سال پہلے جنگ یورپ کی فاتح اقوام نے
اپنے زعم باطل میں جرمنی سے چھین کر چھوٹے زیکو سلاویہ کے حوالے کر دیا تھا۔
اور اس طرح اسے ایک گمنام چھوٹی سی ریاست کے درجہ سے بڑھا کر اس
قابل بنا دیا تھا۔ کہ وُہ بھی کمال فخر و تکبر کے ساتھ

بہم بھی آئیں پانچ سواروں میں

کا مصداق بن بیٹھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آج زیکو سلاویہ کی حالت نہایت
ہی قابلِ رحم ہے۔ اور اس کے بدنصیب باشندے اُس دن کو پچھتا رہے ہیں
جب کہ انہوں نے جنگ عظیم کے فاتح انگلستان اور فرانس سے وفاداری اور
خیر خواہی کے صلہ میں جرمنی اور آسٹریا کے علاقہ جات حاصل کر کے اپنی شان بڑھائی

من مانی کر لینے دے ۔ اور اپنے مخالفوں سے اپنا سب اگلا پچھلا قرضہ انتقام معہ سود در سود کے وصول کرنے میں کسی طرح رخنہ انداز کرنے کی بجائے اُلٹی ان کی حمایت کرے ۔ سچ ہے ۔ ؎

از مکافات عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

اگر یہ سوال کیا جائے ۔ کہ جرمنی کو اس کی یہ موجودہ پُر ہیبت طاقت کس شخص کی بدولت حاصل ہوئی ہے ؟ ۔ تو ہر شخص خواہ وُہ ہٹلر کا دوست ہو یا دشمن ۔ مداح ہو یا بدگو ۔ اس سوال کے جواب میں ہٹلر کا ہی نام لینے کے لئے مجبور ہو گا ۔ گویا ایک طرح زبان قال سے نہیں ۔ تو زبان حال سے ہی سہی ۔ وُہ جرمنی اور جرمنوں کی ان موجودہ شاندار و پیہم کامیابیوں کا سہرہ ہٹلر کے سوا اور کسی کے بھی سر پر نہ باندھ سکے گا ۔

اب دُوسرا سوال جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہو گا ۔ وُہ یہی ہو سکتا ہے کہ دنیا بھر کی عظیم الشان فاتح سلطنتوں کی ایڑیوں میں ایسی بے رحمی و بیدردی سے کچلے ہوئے جرمنوں کو جنہیں دُنیا باوجود اُن کی اس بہادری اور جرأت کے جو انہوں نے گذشتہ عالمگیر جنگ میں ظاہر کی تھی ۔ بالکل بیکس و بے بس اور کمزور و ناتوان سمجھ بیٹھی تھی ۔ ہٹلر نے بیس سال کے اس مختصر و محدود سے عرصے میں اتنا طاقت ور و مضبوط کس طرح بنا دیا ؟ کہ آج وُہ دنیا بھر کے امن و امان کے لئے ایک نہایت زبردست خطرہ بن رہے ہیں ۔ اس سوال کا جواب ہٹلر نے خود ہی اپنی مشہور عالم تصنیف "میری جدوجہد" میں بلا کم و کاست دے دیا ہے ۔ جس کا دنیا بھر کی زبانوں کا ترجمہ ہو کر گذشتہ جولائی سے پہلے پہلے تقریباً ۲۶ لاکھ فروخت ہو چکا ہے ۔ اور دُنیا کا شاید

تھی۔ جو آج اُسے اُن ہی انگلستان اور فرانس کے ارشادات کی تعمیل میں معسود ورسود کے کمال بے کسی و بے بسی کے ساتھ جرمنوں کی محض ایک دھمکی میں ہی اِس ناگفتہ بہ ذلت وخواری سے واپس کرنے پڑ رہے ہیں۔ اور حقیقتاً آج اس بُرے وقت میں ان کے وہی دونوں حمایتی جنھوں نے کبھی زمانے میں اس کی شان کو چار چاند لگائے تھے۔ آج اسی شان کو خاک میں ملانے والے ثابت ہوئے۔ سچ ہے ؎

سیاہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جُدا ہوتا ہے انسان سے

مگر ہر ہٹلر کے تکبر آمیز و خود پرستانہ رویہ اور فسیسٹ خیالات سے خواہ کسی کو کتنی بھی نفرت و مخالفت کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کے پہلو میں انصاف پسند دل ہے۔ اُسے ہٹلر کی قوم پرستی۔ حب الوطنی۔ بلند خیالی۔ عالی دماغی۔ دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کی ضرور ہی داد دینی پڑے گی۔ بلا ساختہ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل جائینگے۔ کہ

اِیں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

جنگ عالمگیر کی فتح کے نشہ سے سرشار ہو کر سمجھئے۔ یا بہادر جرمن قوم کی جانبازی اور سینہ سپری سے خوفزدہ ہو کر خیال کیجئے۔ یورپ کی فاتح اقوام نے مفتوح جرمنوں کو ذلیل کرنے کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی لیکن اس وقت یہ بات کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ گذری ہوگی۔ کہ آج سے بیس سال کے اندر ہی اندر یہی پریشان حال جرمن جو آج کان دبائے ہماری ہر ایک سخت سے سخت شرط کو سر آنکھوں سے تسلیم کر رہے ہیں۔ اتنے زبردست ہو جائیں گے۔ کہ محض دھمکیاں دے دے کر دنیا کی بڑی قوم کو اس امر کے لئے مجبور کر سکیں گے۔ کہ بلا کسی چون و چرا کے انھیں اُن کی

کوسوں دور بھاگتا تھا۔ اور ملازمت بھی صرف بیٹھے بیٹھے قلم گھسانے یعنی محض کلرکی کی۔ جس کے متعلق اس نے خود اپنی نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ کہ مجھے اس خیال تک سے نفرت تھی۔ اور یہ بہت ہی پریشان کن معلوم ہوتا تھا۔ کہ دن بھر دفتر میں بند ھے بیٹھے رہو۔ اور اپنے وقت کے آپ مالک ہونے کی بجائے صرف سرکاری فارموں کی خانہ پُری کرنے میں ہی اپنی ساری عمر ضائع کردو۔

کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اگر ہٹلر کو کلرکی سے نفرت نہ ہوتی اور وہ اپنے والد بزرگوار کی ترغیب میں آکر کہیں کلرک بن بیٹھتا۔ تو آج اس کی زندگی کیسی گمنامی میں بسر ہوتی۔ اور آج جرمنی کی دولت دنیا ہی کس درجے تک پہنچ چکی ہوتی لیکن قدرت کی لامحدود طاقتوں اور ان کے کام کرنے کے طریقوں کو کوئی کس طرح سمجھ سکتا ہے؟

اس کتاب کے مطالعے سے پہلی بات جو ناظرین کے ذہن نشین ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ زمانہ طفولیت سے ہی ہٹلر کا محب وطن اور قوم پرست دل ہمیشہ اس خیال سے بے تاب رہا کرتا تھا۔ کہ میرے وطنِ عزیز یعنی جرمنی کا ایک حصہ آسٹریا والوں کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ اور ہم اپنے وطن کی سرحد کے اتنے قریب رہتے ہوئے بھی اس سے غیر بنے ہوئے غیروں کی سی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ اس خیال نے اس کے دل میں شروع سے اہل آسٹریا اور ان کے منظور نظر زیکوں کے خلاف ایک جذبہ انتقام پیدا کر دیا تھا۔ جس نے اب یہ شکل اختیار کی ہے۔ کہ اس نے جرمنی کی تمام سیاسی و فوجی طاقتوں پر قبضہ اقتدار حاصل کرتے ہی سب سے پہلا وار آسٹریا پر اور دوسرا وار زیکوسلاوکیہ پر کیا ہے۔ اور جرمن نژاد لوگوں سے بسا ہوا اچھا بھی علاقہ کسی نہ کسی طرح ان کے قابو میں آگیا۔ اسے ان سے واپس لے کر اور ایک مرتبہ پھر جرمنی میں شامل کر کے اپنے وطن عزیز کی

کوئی مدبر و سیاست دان ایسا ہوگا۔ جس نے کہ اس کتاب کو کامل غور و خوص سے ایک کیا کئی کئی بار نہ پڑھا ہو۔ اور اس کے اوراق سے کچھ نہ کچھ سبق حاصل نہ کیا ہو۔ کیونکہ ہر ایک عقلمند اور دور اندیش شخص حضرت شیخ سعدی کی مندرجہ ذیل نصیحت پر عمل پیرا ہونا اپنا پہلا فرض سمجھتا ہے ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
گر نوشت است پند بر دیوار

یعنی ایک ہوشیار اور دانش مند آدمی کو ہر شخص اور ہر جگہ سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ دیوار پر ہی کیوں نہ لکھی ہو۔ جرمنوں کی نظروں میں تو اس کتاب کی عظمت انجیل مقدس سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ ان کے نقطہ سے جو اہمیت و شان انہیں اس کتاب میں مندرج ہدایت پر عمل کرنے سے نصیب ہوئی ہے۔ وہ انجیل پر عمل کرنے سے شاید قیامت تک بھی حاصل نہ ہو سکتی۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ناظرین پر یہ روز روشن کی طرح عیاں ہو جائیگا۔ کہ ہٹلر نے ایک معمولی سے سرکاری ملازم کے فرزند کی حیثیت سے بڑھتے بڑھتے یہ بعید از قیاس ترقی کس طرح کی ہے۔ اس نے اپنی اس تصنیف میں اپنے والد بزرگوار کے عہدے کی طرف کوئی اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ اور سوائے اس کے کچھ بھی نہیں لکھا کہ اُن کی نظیر اس کے سامنے بار بار پیش کر کے اُسے سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کی ترغیب دی جایا کرتی تھی۔ لیکن اپنے عزیزوں کی خلاف توقع اس کا دل سرکاری ملازمت سے کچھ ایسا متنفر تھا۔ کہ انکی کوئی بھی ترغیب اسپر کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ اسکا آزادی پرست دل ملازمت کے نام سے

ضرورتِ مذہب وسیاست کی علیحدگی زراعت و کاشتکاری کی اہمیت وغیرہ وغیرہ مضامین پر جن مدبرانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ بھی خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ اور زراعتی پالیسی کے متعلق تو اس نے جو پروگرام کتاب کے آخر میں دیا ہے۔ وہ اس قابل ہے۔ کہ ہر ایک قوم پرست حکومت اسے اپنے پیش نظر رکھے۔ اور اپنے مقامی حالات کے مطابق اس میں مناسب ترمیم و تنسیخ کرکے اس کی زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک پیروی کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
گر نوشت است پند بر دیوار

دہلی
مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء

خیراندیش
"نارائن"



کو خطرے میں ڈالنا کہاں کی دانائی ہے۔ اس لئے اس کو قربان کر دینا ہی مناسب ہے۔ جب جرمنی نے اپنے جرمن لوگوں سے آباد خطے سب مجھ سے چھین لئے تو دوسرے ہمسایوں نے بھی۔

"مُوئے پر سَو دُرّے"

کے مصداق میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہر طرح جائز و مناسب خیال کر کے میرے ان علاقوں پر دستبرد شروع کر دی۔ جس میں ان کے ہم نسل لوگ آباد ہیں۔ اور جن میں سے بعض شاید اس جنگ سے بھی بہت پہلے سے میرے قبضہ اقتدار میں چلے آئے تھے۔

غرضیکہ آج زیکوسلاویکیہ کی حالت اس سے بھی کہیں بد تر ہے۔ جیسی کہ آغاز جنگ سے پہلے تھی۔ اب نہ تو آسٹریا ہی اس کا سرپرست ہے۔ نہ انگلستان یا فرانس ہی۔ روس۔ ہنگری اور پولینڈ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اسی لئے اسے بالآخر بین الاقوامیت کا سب نشہ اسطرح ہرن ہو جانے کے بعد اسی جرمنی کے قدموں میں جگہ تلاش کرنی پڑی ہے۔ جس نے کہ اُسے بُری طرح ٹھکرا کر دنیا بھر میں یوں ذلیل و خوار کیا ہے۔ آہ کتنا عبرت انگیز منظر ہے۔ بشرطیکہ کوئی آنکھ کھول کر دیکھے۔ اور اس سے کچھ سبق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

چونکہ اس مختصر سے دیباچے میں تمام کتاب سے حاصل ہونے والے بے شمار اسباق کا ذکر کرنے سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جسے شاید میرے مہربان پبلشر برداشت نہ کر سکیں۔ کیونکہ انہیں اس کتاب کی طباعت کی بہت جلدی ہے۔ اس لئے میں اسے یہیں ختم کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ لیکن اشارۃً اتنا ضرور عرض کرونگا۔ کہ اس کے دوراندیش اور دانشمند مصنف نے مندرجہ بالا امور کے علاوہ لازمی اور جبری قومی و فوجی تعلیم کی

مصنف کی تمہید

۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو یعنی پیدائش کے چوتھے سال نیشنل یعنی حکومت جرمنی نے نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی کو ممنوع قرار دے دیا ۔ اس لئے ہم نے اسے توڑ ڈالا +

یکم اپریل ۱۹۲۴ء کو مجھے میونخ کی نیشنل کورٹ آف جسٹس یعنی قومی عدالت انصاف سے سزا ہو گئی ۔ اور میں لینڈز برگ ایم لیچ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا ۔

اس سے مجھے سالہا سال کی پیہم اور مسلسل محنت و مشقت سے پہلی مرتبہ اتنی فرصت ملی ۔ کہ میں اس کام کو شروع کر سکوں جس کا کہ بہت سے احباب مطالبہ کر رہے تھے ۔ اور جسے میں خود بھی تحریک کے لئے بہت مفید خیال کرتا تھا ۔ اسلئے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ۔ کہ میں ایک کتاب لکھ کر اپنی تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتا ہوا اس کی نشوونما کی ایک تصویر دنیا کے سامنے پیش کر دوں ۔ کیونکہ میری رائے میں اس سے بہ نسبت کسی خاص اصولی تصنیف کے زیادہ سبق حاصل کر لیا جا سکے گا +

اس سے مجھے اپنے متعلق بھی کچھ لکھنے کا موقع مل گیا ۔ لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک کہ میں اس کتاب کو قابل فہم بنانے میں مدد حاصل کر سکتا ہوں ۔ اور ان بے بنیادی قیاسی افسانوں کی تردید میں کامیاب ہو سکتا ہوں ۔ جو یہودی پریس نے میرے متعلق دنیا میں پھیلا رکھے ہیں +

اس کتاب میں اجنبی ناظرین سے میرا خطاب نہیں بلکہ میں نے صرف اُن

دیباچہ مترجم انگریزی

ہرہٹلر کی اس تصنیف کے خلاصے میں، مَیں نے مصنف کے ان تمام جذبات وتخیلات متعلقہ حکومت کو پیش کیا ہے۔ جن کا اُس نے اپنی مکمل ومفصل تصنیف میں اظہار کیا ہے +

اس کتاب کے صفحے صفحے میں اس کی یہ خواہش بھری پڑی ہے۔ کہ کسی طرح میری قوم ونسل کو ایک نئی زندگی نصیب ہو۔ اور اُسے نوجوانان جرمنی کے سینوں میں اپنے تخیلات کی وہ آگ روشن کرنے میں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ جہاں تک اس کتاب سے اندازہ لگ سکتا ہے۔ ہرہٹلر اپنی تحریک سے یہ اُمید رکھتا ہے۔ کہ جرمن قوم اسی قسم کی حکومت کا مطالبہ کرے گی جسے کہ وُہ بہترین خیال کرتا ہے۔ اور اگر ضرورت پڑی۔ تو اُن تمام عناصر کو بزور کچل ڈالے گی۔ جو کہ اس کی مخالفت کی کوشش کریں گے +

ہرہٹلر نے ملک کے اندرونی انتظامات کی نسبت اپنی غیرملکی پالیسی کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ اس کتاب کو تحریر کرتے ہوئے شاید وُہ اپنے تعمیری کام کو زیادہ تر اتنا ہی محدود خیال کرتا تھا۔ کہ جرمنی برابر سیدھے راستے پر آگے بڑھتا چلا جائے۔ اور جہاں پہنچ جائے وہاں ہی قائم رہے۔ اور اس سے پیچھے کبھی نہ ہٹے +



میری جدوجہد

یا

کشمکش حیات

پیارا وطن

(۱)

خوش قسمتی سے میرا جنم براؤن شائر کی سرائے میں ہوا - یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے - جو اُن دونوں جرمن سلطنتوں یعنی جرمنی اور آسٹریا کی درمیانی حد پر واقع تھا - جن کو ایک مرتبہ پھر ملا کر ایک ناقابل شکست رشتہ اتحاد میں جکڑ دینا - ہم جرمن نوجوانوں کا سب سے زیادہ دل پسند خواب نہیں! نہیں! بلکہ خواہش عظیم اور زندگی کا ایک واحد مقصد ہے کیونکہ جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد کی بنیاد کسی مالی یا اقتصادی نقطۂ خیال پر نہیں - بلکہ خالص جرمن حب الوطنی اور قومی خدمت کی دلی خواہش پر ہے - جو ایک سنگین چٹان کی مانند مضبوط و قائم ہے - صرف یہ ہی نہیں - بلکہ اس اتحاد و اشتراک کے سوال پر جب ہم کسی مالی نقطۂ خیال سے غور کرتے ہیں - اس کے بغیر ہونے والے نقصانات کی تصویر پیش نظر سے

اصحاب ہی کو مخاطب کیا ہے۔ جو کہ تحریک کے پیرو ہیں۔ اور اپنے گوشۂ دل میں اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز اس کے متعلق کچھ واقفیت اور روشنی حاصل کرنے کے خواہاں ہیں ۔

میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ کہ کسی تحریر کا اثر تقریر کی مانند نہیں ہو سکتا۔ اور دنیا کی ہر ایک بڑی تحریک کی ترقی کا دارو مدار مصنفوں اور محرروں کی نسبت تقاروں اور لیکچراروں پر زیادہ تر رہا ہے ۔

لیکن پھر بھی کسی عقیدے کے اظہار میں یکسانیت اور اس کی حمایت میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کے لئے اس کے دائمی اصولوں کا قلمبند کیا جانا بھی لازمی ولابدی ہے۔ کاش کہ یہ کتاب اس عمارت کا بنیادی پتھر ثابت ہو۔ جس کے لئے ہم سب نے مل جل کر کام کیا ہے۔ اسی لئے میں اسے پیش کرتا ہوں ۔

آج ہماری پارٹی سلطنت بھر میں فخر سے سر اونچا کئے کھڑی ہے۔ اور ہم پہلے ہر زمانے کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم سمجھتے ہیں۔

ایڈولف ہٹلر

دل میں ایک عجیب طرح کی بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ اور بالآخر میں اسی نتیجہ پر پہنچتا تھا۔ کہ وہ حقیقت سبھی جرمن اس وقت بسمارک کے خاندان کے لوگوں کی خوش قسمتی اور صاحب اقبال نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ ناقابل تقسیم طور پر گٹھ کر ایک نہ ہو جائیں +

شروع سے ہی مجھے سرکاری نوکری کے نام سے نفرت تھی۔ اور میں اس خیال تک سے کوسوں دور بھاگا کرتا تھا۔ طرح طرح کی دلیل بازی بھی میری نفرت دور کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ میرے والد بزرگوار ہر چند میرے بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں سرکاری ملازمت کی تعریف کے پل باندھ باندھ کر مجھے سبز باغ دکھلایا کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں شاید اس میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ اور وہ بہت ہی خوش و مطمئن ہوتے۔ اگر میں کسی سرکاری دفتر میں کسی اعلےٰ عہدے پر ممتاز ہو جاتا۔ لیکن میرے خیالات اس سے بالکل برعکس و متضاد تھے میں نوکری کا خیال تک بھی کبھی اپنے دل میں لانا گوارا نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ خیال میرے دل میں ایک نہایت ہی گہری جگہ حاصل کر چکا تھا۔ کہ ایک مرتبہ ملازمت کی دلدل میں پھنستے ہی وقت کی پابندی کے ساتھ دفتر میں بیٹھے بیٹھے مختلف طرح کے فارم بھرتے بھرتے ہی میری زندگی فضول گذر جائے گی۔ اور میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔

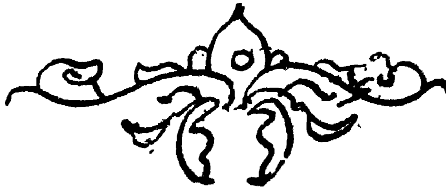
اب بھی جب کبھی میں اپنے ان خیالات پر غور کرتا ہوں۔ تو مجھے یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان سے میں نے دو فائدے حاصل کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات میرے دل میں پیدا ہو سکے اور دوسرے یہ کہ تاریخ کو صحیح صحیح طور پر پڑھنے اور سمجھنے نیز اس سے ٹھیک ٹھیک نتائج اخذ کرنے کی طاقت مجھ میں رونما ہو گئی +

ہماری گردن جھکا دیتی ہے۔ مگر پھر بھی ہمیں جرمنی اور آسٹریا کی یک رنگی و یک جہتی
اٹل اور لابدی نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہمارا خون ایک ہے۔ نسل ایک ہے۔ اور
ضروریات زمانہ کے مطابق ہمارے اغراض و مقاصد اور دلی منشا و مدعا بھی ایک
ہی ہیں +

میرا یہ عقیدہ ہے۔ کہ اپنے ہم نسل اور ہم وطن بھائیوں کا اس طرح سنگھٹن
مضبوط کرکے جرمن نسل کی ان دونوں حکومتوں کو اتحاد و اتفاق کی مضبوط بلکہ اٹوٹ
زنجیروں میں ایک مرتبہ پھر جکڑے بغیر۔ جرمن نوآبادیوں کے متعلق کسی پالیسی کے
سوال پر زبان تک ہلانے کا بھی حق ہمیں کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حالات
موجودہ میں جرمنی کس اخلاقی بنیاد پر یہ خواہش ظاہر کرسکتا ہے۔ کہ وہ کسی نوآبادی
کا قبضہ حاصل کرکے اس سے اپنی ضروریات کی تکمیل کرے ؟ یہ اس وقت تک
ہرگز ممکن نہیں۔ جب تک کہ تمام جرمن قوم ایک نہ ہو جائے۔ اور اس کے
دلوں میں اتفاق و اتحاد کی آگ مشتعل ہو کر ایک برادری اور قومیت کے پاک
جذبات اسے کسی ایک آدرش کی طرف قدم بڑھانے کا حکم نہ دیں۔ کیونکہ
ہماری برادرانہ الفت و محبت کا یہ جوش اور یہ جذبہ ہی ہماری دولت و ثروت
عظمت و جلال اور ترقی و عروج کا ایک واحد نشان ہو سکتا ہے۔ اسی لئے
جرمن آسٹرین سرحد کا یہ چھوٹا سا شہر مجھے ہمیشہ ایک عظیم الشان مقصد کی تکمیل
کی تعبیر سا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ وہاں جنم لینے کو میں نے
خوش قسمتی ظاہر کیا ہے +

بچپن میں یہ سوال اکثر میرے دل کو ایک عجیب جوش اور جذبے سے
بھرپور کر دیتا تھا۔ کہ کیا ہم بھی دوسرے جرمنوں کی طرح بھائی بھائی ہونے
کا دعوے نہیں رکھتے۔ جب میں اس سوال پر غور کرتا تھا۔ تب ہی میرے

دکٹ پیپیز) کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی اپنی پیٹھ پہ لادے ہوئے دیآنا کی طرف روانہ ہُوا۔ کیونکہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا۔ کہ میں بھی اپنے والد بزرگوار کی مانند اپنے کاروبار میں ہی سب سے پہلے اپنی قسمت آزمائی کروں۔ کیونکہ میں کچھ بننا چاہتا تھا۔ اور میری خواہش دُنیا میں کچھ کام کر دکھانے کی تھی۔ لیکن سرکاری ملازمت کے ذریعہ کسی حالت میں نہیں +



بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔کہ اپنی اس نوجوانی کی عمر میں یہ حقیقت میرے شیشۂ دل پر نقش ہو گئی تھی۔کہ جرمن ہماری قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبات ہرگز ہرگز حکومت پرستی کے حامی اور فرمانبردار نہیں ہو سکتے۔اور میں یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ہیپسبرگ خاندان جو آسٹریا پر حکمران ہے۔اس کا منشا و مدعا جرمن قوم کی ہستی وعظمت کو ملیا میٹ کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

اگرچہ یہ خیالات بچپن سے ہی میرے دماغ کو بہت پریشان و مضطرب کرتے تھے۔لیکن جوانی کے ساتھ ہی ساتھ خوفناک جبر و تشدد ظلم و ستم کے جو لرزہ خیز مناظر میری نظروں کے سامنے آنے شروع ہوئے۔وہ رفتہ رفتہ میرے متذکرہ بالا خیالات کو عملی صورت اختیار کرنے کے لئے بھی مجبور کرتے گئے۔اور اسی زمانے سے یہ خیال میری زندگی کا ایک واحد مقصد بن گیا۔کہ اپنی جرمن آسٹرین مادری بھومی کی سیوا کرتے کرتے موجودہ آسٹرین حکومت کا جلد سے جلد خاتمہ کرنا چاہیئے۔

لیکن ہمارے خاندان کی مالی حالت بہت خراب تھی۔اس لئے بدقسمتی سے پیٹ بھرنے اور کمانے کا سوال بھی نہایت بے وقت میرے سامنے آکھڑا ہوا۔اگرچہ یہ خیال کبھی خواب میں بھی میرے دل میں نہ گذرا تھا۔کہ یہ بلائے ناگہانی اتنی جلد میرے سر پر نازل ہو گی۔اور والد بزرگوار کا سایہ عاطفت تو پہلے ہی سر سے اُٹھ چکا تھا۔والدہ کو بھی جلد ہی فرشتۂ اجل آگھیرے گا۔اس طرح یتیم رہ جانے پر سرکار کی طرف سے جو پنشن ہمارے لئے منظور ہوئی۔وہ چونکہ خاندان بھر کی باعزت پرورش اور گذر بسر کے لئے کافی نہ تھی۔اس لئے یہ محض قدرتی تھا۔کہ میں حالات سے مجبور ہو کر تلاش روزگار میں وطن سے باہر نکلوں چنانچہ بالآخر میں اپنے مستقبل کے متعلق گوناگوں حوصلہ افزا امیدوں کو پہلو میں لئے اور طرح طرح کے دل پسند خواب دیکھتا ہوا مختلف قسم کے کپڑوں

افزائی کر رہی تھیں۔ اسی لئے پایہ تخت آسٹریا کے ایوانِ حکومت نیز اس کے افسروں اور ماتحت کارکنوں کے حلقوں میں اس سے ایک عجیب سراسیمگی و پریشانی سی پیدا ہو رہی تھی۔

دیانا اگر اپنی سیاسی اہمیت و عظمت کے لحاظ سے نہیں۔ تو حکومتی شان و شوکت اور دھوم دھام کے نقطہ خیال سے تو ضرور ہی ساحل ڈینیوب کی اس شاہی حکومت کا مرکزی مقام تھا۔ ساتھ ہی اس کے خاندان شاہی کے اور بے شمار اعلیٰ و ماتحت افسران و کارکنانِ حکومت نیز جاہ پرست سرمایہ داران فاضل۔ اجل علماء اور ماہرین فن کے پہلو بہ پہلو افلاس تنگ دستی اور فاقہ مستی کے لاتعداد دستکاروں یعنی محنتی جفاکش مزدوروں اور دیگر غریب و غربا کا مسکن بھی وہیں تھا۔ اس لئے ان ایام میں جبکہ میں دیانا پہنچا۔ . . . .

وہاں کے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان ایک زبردست کشمکش اور جد و جہد جاری تھی۔ جس میں غریب و بے کس جور و ظلم کی چکی میں پیسے جا رہے تھے۔ اور سرمایہ پرست اور ان کے خیر اندیشوں کا بول بالا تھا +

ہزاروں بے کار و بے روزگار طرح طرح کے الزامات لگا لگا کر ہنگری کے شاہی محلات کے ارد گرد بے قصور پھانسی پر لٹکائے جا چکے تھے۔ اور ہزاروں خانہ بدوش۔ بے گھر۔ بے در خاندان کال کوٹھڑی سے بھی زیادہ خوفناک اور بدتر مکانوں میں پُر از مصیبت زندگی کے دن بسر کرنے پر مجبور تھے۔ روز بروز بے کاری بڑھتی جا رہی تھی۔ اور آئے دن سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرد عورت بیکار بے روزگار ہوتے جاتے تھے۔ ہزاروں گھروں میں صرف ایک ہی وقت کھانا پکتا تھا۔ اور سینکڑوں بدنصیبوں کو تو برابر تین تین دن تک فاقہ کشی کرتے رہنے کی نوبت آجاتی تھی۔ غرضیکہ اس طرح تمام شہر ہی نہیں

ویانا میں

(۲)

جب میں ویانا پہنچا۔ تو وہاں کے جاہ پسند سرمایہ پرستوں اور ان کے جبر و تشدد کے شکار مفلس و فاقہ زدہ جفاکش و محنت پیشہ مزدوروں میں ایک زبردست کشمکش جاری تھی۔ شہر مرکزی حصہ جو ڈھائی کروڑ باشندگان ملک کی قسمتوں کا مالک و مختار ہونے کا دعوے دار تھا۔ اپنی پُر رعب شان اور ہمت خیز دبدبے کا اظہار کرتا ہوا کبھی نہ تھکتا تھا۔ مگر اس عالمگیر بیداری اور عام انقلاب کے زمانہ میں ان کی اس کوشش کو عام و خاص طبقات میں ایک فضول و بیہودہ کشیدگی و مغائرت پیدا کرنے والی لغو و بیہودہ باتوں کے سوا اور کچھ بھی نہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی حصے میں نام نہاد عدالتیں واقع تھیں۔ جو اپنے عدل و انصاف سے نہیں۔ بلکہ محض اپنی سر بفلک عمارتوں کی بے معنی نمایش میں مصروف نظر آتی تھیں۔ اور حکمران خاندان ہیپسبرگ کی دورنگی چالوں کی تائید و تصدیق سے عوام کو اس کی سرپرستی کا مداح و خیر اندیش بنانے دبے اثر کوششوں سے گھر پھونک تماشہ دیکھنے کی مشہور عالم ضرب المثل کا عملی نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر رہی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ یہ تمام باتیں عوام پر ان کی تنظیم اور سنگھٹن کی زبردست ضرورت کو اور بھی نمایاں کر کے ان کی حوصلہ

کیسا ہی زبردست کیوں نہ ہو۔ اسی طرح جھوٹے وہم سے پُر خیالات بھی کبھی عوام کی حالت میں کوئی بہتری پیدا نہیں کر سکتے۔ خواہ ان کے اظہار میں بھی فصاحت و بلاغت سے کیوں نہ کام لیا جائے۔

اس سلسلے میں ان سرمایہ پرستوں کا نقشہ میری نظروں کے سامنے کھنچ جاتا تھا۔ جو غریب فاقہ کش مزدوروں کے ساتھ اپنی نمایشی ہمدردی کے اظہار میں کبھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ یہی حال فیشن ایبل عورتوں کا تھا۔ جو زبانی طور پر کہنے کے لئے تو اصلاح اور سدھار کا ہر طریق اور راستہ بتلاتے اور دکھلانے کو ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ لیکن عملی طور پر کوئی کام کرنے کا وقت جب کبھی بھی سامنے آتا ہے۔ تو ان کی نانی مر جاتی ہے۔ مگر ایسے بھی لوگ کسی لاعلمی اور بھول سے ہی اس پوشیدہ گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ بلکہ ہمیشہ جان بوجھ کر اپنی جان اور کھال بچاتے ہوئے اس کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں۔ کہ

چڑھ جا بچہ سولی۔ رب بھلی کریں گے!

یہی وجہ ہے۔ کہ ان کی اس نام نہاد ملکی خدمت کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عوام کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت و حقارت کا ایک نہایت زبردست جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی اپنی اس پُر فریب قومی خدمت کا یہ انجام دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنے کی بجائے وہ کمال ہٹ دھرمی اور ڈھیٹھ پن سے عوام کو حق ناشناس اور احسان فراموش کہتے ہوئے کبھی نہیں شرماتے۔

ایسے بزرگ حضرات ملکی و قومی خدمت کی اندرونی عظمت و اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے میں ان پر یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ کسی بھی قومی

بلکہ تمام ملک میں دور و نزدیک ایک بے چینی و اضطراب کی فضا پھیل رہی تھی۔ اور اس کا مرکز ویانا بن گیا تھا۔

یہ شان تھی۔ اس وقت آسٹریا کے شاہی خاندان ہیپسبرگ کی حکومت کی اور اس طرح اس کے ظلم و ستم۔ جور و تشدد کا ہر طرف ننگا ناچ ہو رہا تھا۔ مگر نشۂ حکومت سے سرشار حکمرانوں اور اس کے ماتحت افسروں و کارکنوں کو اتنے پر بھی صبر نہ تھا۔ اور وہ اس جبر و تعدی کو بھی کافی نہ سمجھتے تھے۔ ان کا پتھر سے بھی زیادہ سخت و بے رحم دل ابھی بے کس عوام کی حالت اس سے بھی بڑھ چڑھ کر بدرجہا بدتر و ناگفتہ بہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اور نکتہ رس شاعر کی پُر از صداقت نصیحت کو بالکل بھول بیٹھا تھا۔ کہ ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید

جرمنی اور آسٹریا کی مجلسی حالت کا علم کیسی اور شہر کی نسبت ویانا میں زیادہ اچھی طرح ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کسی سانپ کے زہر کی تیزی کا علم صرف اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ کسی کو ڈنگ مار دے۔ اس سے پہلے کبھی نہیں!
اسی طرح مجھے بھی اس مجلسی و انقلابی زہر کی تیزی کا علم جو کہ عوام کی رگ رگ اور نس نس میں سرایت کر چکا تھا۔ اس وقت ہوا جبکہ ویانا میں پہنچ کر میدانِ عمل میں کام کرنے لگا۔ ممکن ہے کہ کسی اور کی نظر میں عوام کی وہ حالت کچھ زیادہ خراب نہ ہو۔ لیکن میں تو اسے خرابی سے خالی نہ سمجھتا تھا۔ وہ محض نمائشی ہونے کے باعث ایک غلط خیال و اندازہ پیدا کرنے والی تھی۔ اس لئے اسے زبانی لپا پی اور بجز اس کے سوا کچھ اور نہ کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ نمائشی اصولوں سے عوام کے کسی بھی مطالبے کا پورا ہونا ممکن نہیں۔ خواہ وہ مطالبہ کتنا ہی اہم اور

خیالات کی پیدائش ونشوونما ممکن ہے۔ ورنہ اسکی کوئی بھی نہیں ہوسکتی۔
ویانا میں اپنے اس قیام کے دوران میں ہی مجھے یہ معلوم ہوگیا۔ کہ حقیقی بےغرض اور سچے کارکنوں کی ملک میں کتنی کمی ہے۔ نیز ان کی صادقانہ و بے لوث خدمات ہی ملک کی اقتصادی اور اخلاقی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کرسکتی ہیں۔ اس لئے میں جان ودل سے ایسے سچے اور بے غرض کارکنوں کی تلاش میں مصروف ہوگیا۔ اور ملک اور قوم کو آئندہ خوفناک و تباہ کن غلطیوں اور مشکلات سے محفوظ رکھنے کے مختلف طریقے سوچنے لگا +
آسٹریا کی حکمران جماعت اس وقت تمام مجلسی و جماعتی اطلاعات کے اصول کی طرف سے لاپرواہی اور غفلت شعاری کا اظہار ہی اپنے لئے نہایت مفید اور ضروری خیال کررہی تھی۔ لیکن بے زبان وبیکس فاقہ کش مزدوروں کی مالی خستہ حالی ان کی روحانی و اخلاقی طاقتوں کا روزافزوں زوال اور اپنی موجود قومی ومجلسی گراوٹ سے ان کی بے حسی بلکہ عملی موت کا یہ خوفناک منظر میرے بیقرار ومضطرب دل کو خوف زدہ کرنے اور ہلادینے کے لئے بہت کافی تھا۔ کیونکہ جب غیروں کی جھوٹی ہڈیوں پر بھوکے کتوں کی طرح لڑتے اور جھگڑنے والے یہ بے غیرت انسان اپنے آپ کو "جرمن" ظاہر کرتے ہوئے بھی خوف زدہ ہوکر تھرتھر کانپنے لگتے تھے۔ تو میرے دل کو ناقابلِ بیان صدمہ پہنچتا تھا۔ اور میں یہ سوچا کرتا تھا۔ کہ خدا جانے! ان کی قومی غیرت کا احساس کہاں غائب ہوگیا ہے؟ کیا ان پیٹ کے کتوں کی غلامی سے بھی ہم کچھ سبق نہیں سیکھ سکتے! کیا ان کی یہ مُردوں سے بدتر حالت بھی ہماری قومی زندگی کے حساس کو بیدار کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکے گی +
میرا خیال ہی نہیں۔ بلکہ گہرا اور پختہ یقین تھا۔ کہ ایک نہ ایک دن مستقبل

خدمت کو صرف شاباش و آفرین اور مرحبا و زندہ باد کے نعرے سننے یا کسی اور ذاتی فائدے کی خواہش سے کبھی سرانجام نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ محض اپنا انسانی اور قومی فرض خیال کرکے خالص بے غرضانہ طور پر پورا کرنا مناسب ہے۔ تاکہ بقول شخصے۔

ہارے جیتے آے نہ لاج۔ بگڑے بھی سدھریں سب کاج

ہمیں یہ کبھی بھی نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ مجلسی و ملکی مطالبات کے لئے اپنی آواز بلند سے بلند درجے تک اٹھانا ہمارا پیدائشی حق ہے۔ اور اس کے لئے ہمیں بھی کسی سے عنایت و نوازش کی کوئی بھیک نہیں مانگنی چاہیئے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر ذلیل گراوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

ویانا میں آکر میں نے یہ محسوس کیا۔ کہ حالات موجودہ میں عوام کو کسی ایسے موزوں و مناسب طریق عمل کی پیروی کرنی چاہیئے۔ جو ہر پہلو اور ہر منطقی دلیل سے مکمل و بے عیب ثابت ہو سکے۔ اور یہ طریق عمل یہی ہو سکتا ہے۔ کہ ہر شخص اپنی ذاتی و مجلسی ترقی کے لئے اپنے آپ کو تمام جماعتی و مجلسی رسوم و رواج میں مناسب تبدیلی و اصلاح کے لئے ذاتی طور پر ذمہ دار و جوابدہ خیال کرے اور ان تمام موجودہ مجلسی و جماعتی بیماریوں کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا ہی اپنا فرض اولین سمجھے جو قوم کو طرح طرح سے کمزور کر رہی ہیں۔ کیونکہ جس طرح مادر قدرت ہمیشہ نئی دنیا پیدا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھتی ہے۔ کہ پہلی تمام خلقت کو تباہ و برباد کرکے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے۔ اسی طرح ہمیں بھی حیات انسانی کے ان ۹۹ فیصدی عیوب اور کمزوریوں کا بالکل ہی خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ جن کا علاج بادی النظر میں محال ہی نہیں۔ بلکہ ناممکن سا دکھائی دیتا ہے۔ تبھی ہماری آئندہ ترقی اور نئی زندگی کے لئے نئے حیات افروز

میں سینہ سپر اور سر بکف ہو کر جنگ و جدل کر سکتا ہوں۔ جس سے کہ مجھے سچی محبت و الفت ہے۔ اور جس پہ کہ میری سچی عقیدت اور شردھا ہے۔ مگر مجھے شردھا اور پختگی عقیدت و اعتماد بھی اسی پر ہوتا ہے۔ جسکا مجھے حقیقی علم اور سوچا گیان ہو بغیر اسکے میری سب عقیدت۔ شردھا۔ وشواس۔ محبت۔ الفت جو کچھ بھی ہے اندھی جہالت و حماقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اس لئے اس میں کبھی پائیداری پختگی اور مضبوطی پیدا نہیں ہو سکتی +

اس لئے مجلسی معاملات کے متعلق میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا۔ اور اب انہیں خوب سمجھ بوجھ کر ہی میں ان کے بارے میں کوئی آواز بلند کیا کرتا تھا۔ کیونکہ میں یہ اچھی طرح جاننے لگا تھا۔ کہ پبلک امور میں جلد بازی اور نادانی سے کام لیکر سوائے بدنامی اور شرمندگی کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا +

سنہ ۱۹۰۱ء میں اپنی مالی حالت کو میں نے اتنا سدھار لیا۔ کہ مجھے اپنے کام میں کسی سے بھی کسی طرح کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ اور میں کامل آزادی کیساتھ مصوری کرنے لگا۔ رعایا کا ایک بہت بڑا اور زبردست حصہ اس زمانہ کی حکومتی خرابیوں کی سخت مخالفت کر رہا تھا۔ وُہ اس کمزور اور بے اثر حکومت کے طریق کار سے غیر مطمئن تھے۔ جس طرح کوئی نوجوان عورت ایک مضبوط و تندرست اور خوش مزاج نوجوان کے مقابلے میں کسی کمزور دبلے پتلے اور چڑچڑے مزاج والے شخص کو کبھی پسند نہیں کر سکتی۔ ویسے ہی رعایا بھی کسی نکمے۔ کمزور اور بے رعب حکمران کو مخصوص اور اس لئے پسند نہیں کر سکتی تھی۔ کہ قسمت نے اسے تاج و تخت کا مالک بنا دیا ہے۔ یا کسی ذمہ دار عہدے پر متمکن کر دیا ہے۔ کیونکہ عوام کی دلی خواہش یہ تھی۔ کہ ملک میں ایسی جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ جو اندرونی رقابت اور خانہ جنگیوں سے

تورپ میں ہی سب مذکورہ بالا قابل افسوس اور موجب شرم حالات ہمارے جذباتِ قوم پرستی اور حب الوطنی کو ایک نئی زندگی اور تازہ قوت حیات بخشنے والے ثابت ہونگے - اور روز بروز اسے تیز سے تیز تر کرتے جائینگے ۔

ہم میں سے بہت سے اصحاب اور پڑھے لکھے خیالات کی برائی بھلائی کی جانچ پڑتال کے چکر میں ہی اکثر پھنسے رہتے تھے۔ تو وہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ کہ ہماری مادر وطن کی اہمیت و عظمت ہمیشہ برحق و قابلِ فخر ہے۔ اور اپنی زندہ جاوید کی تہذیب و قدیم روایات پر ناز کرتے رہنے سے ہی ہمارا سر دنیا بھر میں اونچا رہ سکتا ہے - اور یہی ہماری سچی عزت و عظمت کا واحد نشان ہے - لیکن کیا ہم اسے سمجھنے اور محسوس کرنے کے لئے بھی کبھی کوشش کرتے ہیں؟ - میرا یہ تو ہمیشہ عقیدہ رہا ہے - کہ جس دن بھی ہمیں اپنی اس قدیم عظمت و اہمیت کو یاد کرنے کا کچھ موقع ملے گا - اسی دن ہمارا دل قومی فخر و ناز سے بھر کر پھول اُٹھے گا - اور اس کا صریح نتیجہ یہ ہوگا - کہ ہمارے خوابیدہ جذبات اور خفتہ خیالات ایک مرتبہ پھر بیدار ہو جائیں گے - اور ہمیں اپنا میدان عمل صاف طور پر سامنے پھیلا ہوا دکھائی دینے لگے گا -

ایسے موقعوں پر ہمیشہ مجھے ایک نیا احساس ہوا کرتا تھا - وہ یہ کہ عوام کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کی خواہش پھونکنا ہی ان کی حقیقی تعلیم اور اس کی سچی ترقی ہے - اور اس کی افزائش و ایندی ہی آزادی کی حفاظت اور برقراری کا ایک واحد ذریعہ ہے - کیونکہ تعلیم و ترتیب سے ہی ہر شخص اپنی سیاسی اہمیت تمدنی عظمت اور اپنی قدیم تہذیب اور تمدن کی شان و بہ گی کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے - اور یہ علم ہی اس کے دل کو قومی غیرت و خودداری کے فخر و احساس سے بھرپور کر سکتا ہے - اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے - کہ میں اسی کی جماعت

کمزوریوں اور غلط کاریوں کے باعث ان کے خلاف ہوتے جاتے تھے۔ اور ان کی خوشامد پسندی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس طریق عمل سے ان کی ہر ایک تحریک کے علاوہ ان کی اپنی ہستی بھی ہمیشہ خطرہ میں رہتی تھی۔ اور ان کے مخالف احکام ہمیشہ ان کے مقابلے کے لئے چوکنے اور کمربستہ پائے جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ بظاہر ان کا یہ طریق کار پُرامن اور عوام کی حفاظت کے لئے مفید معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی بدولت آہستہ آہستہ حکومت کی طاقت بڑھتی جاتی تھی۔ اور اس کے ہاتھ مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔ کیونکہ ہر طرح کے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو کھلم کھلا من مانا۔ ننگ دھڑنگ۔ بے پردہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے دوسرا بظاہر نرمی۔ ہمدردی۔ مہربانی اور مروّت کے نمائشی پردے میں پوشیدہ جس کے پس پردہ ہمیشہ چھری۔ کٹار۔ تیغ۔ تبر۔ پستول اور بندوق خفیہ طور پر استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ ضرب المثل مشہور ہے۔ کہ

مُنہ میں رام رام بغل میں چھُری

چنانچہ اس زمانہ میں بھی جب کا میں حال قلمبند کر رہا ہوں۔ اس آخری طریقہ کار پر ہی عمل ہو رہا تھا۔ درحقیقت ایسا ہونا بھی اس وقت ہے۔ جب کہ عوام کی توجہ حصول آزادی کی جدوجہد کے علاوہ دوسری باتوں کی طرف ہوتی ہے۔ اور انہیں اپنی عزت و بے عزتی کا کچھ بھی خیال نہیں ہوتا۔ اس وقت حکام کی یہ سب چالیں عوام کی اپنی کمزوری کے باعث اُن کی نظروں سے چھپی رہتی ہیں۔ ورنہ ان سے بھی وُہ بہت کچھ سبق حاصل کر کے اپنے مخالفوں کو تُرکی بترکی بلکہ اینٹ کا جواب پتھر دینے کی طاقت بآسانی حاصل

بالکل پاک و صاف رہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ ابھی تک لوگوں کو اپنی آزادی اور حریت کے پاکیزہ جذبات کی توہین کا پورا پورا احساس بھی نہ تھا اور بالکل یہی حالت ان کے اخلاقی اور رُوحانی احساس کی تھی یعنی نہ تو ابھی اُنہیں اپنی عزت یا بے عزتی کا ہی کچھ خاص خیال تھا۔ اور نہ وُہ اس زمانے کی غلط اور پُرفریب تعلیم کے نقصانات سے ہی آگاہ تھی اس لئے ایسے حالات میں بیداری اور احساس کا پیدا ہونا ہی انقلاب کا پیش خیمہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے وہ بزدل اور بے رحم طاقتیں بھی جو عوام کے اس احساس کو کچل کر ان کی بیداری کو پھر خواب غفلت میں تبدیل نہیں کر سکتی تھیں۔ خوف زدہ نگاہوں اور گھبرائے ہوئے دل سے ان سب تبدیلیوں کو چپ چاپ دیکھا کرتی تھیں۔ انہیں چوں تک کرنے کی بھی جرأت نہ ہو سکتی تھی آخرش عوام کی خواہش کے سامنے سر جھکائے بغیر ان کے لئے اور کوئی چارہ بھی نہیں رہ جاتا تھا۔ اور اس طرح ان کی تمام بے جا و نازیبا مخالفتوں کے باوجود بھی قوم پرستی اور حب الوطنی کے سچے اصول آہستہ آہستہ فتحیاب ہوتے جا رہے تھے۔

جمہوری حکومت کے ان اصولوں کی اس صداقت اور خفیہ طاقت کا راز مجھے پہلے ہی سے اچھی طرح معلوم تھا اور اسی لئے میں کامل بے خوفی اور سچی لگن کے ساتھ ان کا پرچار کیا کرتا تھا۔ اگرچہ اس تحریکِ آزادی کے دوسرے رہنما بھی ان مذکورہ بالا باتوں سے کافی طور پر واقف تھے مگر پھر بھی انہیں حد درجہ محتاط رہنا پڑتا تھا۔ اور اس زمانے کے طریق حکومت کی خرابیوں نے ملک میں کچھ ایسی فضا پیدا کر رہی تھی۔ کہ ان کی تمام کوششوں کا انجام بالآخر نقصان دہ اور مضرت بخش ہی ہوتا تھا اور کم فہم نادان عوام پر اس کا یہ اثر پڑتا تھا۔ کہ وُہ بھی اپنے ان رہنماؤں کی دلی

ان کی من مانی حکومت کے لئے بربادی بخش تھی۔ لیکن وُہ خوشامد پسند "جی حضوری" حکومت کے پھٹو اس کی اہمیت و طاقت کو نہیں پہچان سکے۔ اور اسی لئے وُہ اپنی تمام سیاسی طاقت و عزت کو ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے۔ کیونکہ حقیقتاً انہیں اپنی پیشن کی صداقت و طاقت میں کبھی بھی اعتماد نہ تھا۔ نہ وُہ اسے عوام کے لئے فائدہ بخش ہی سمجھتے تھے۔ اور سمجھتے بھی کیسے؟ وُہ تو نردل سے سرمایہ پرستی کے معتقد اور اسی کی پوجا کرنے والے تھے۔ مگر ان کا یہ خیال سراسر غلط تھا۔ اور دور اندیشی و معاملہ فہمی کبھی ان کے پاس تک نہ پھٹکنے پائی تھی۔ اور ان کا یہ عقیدہ بھی بالکل باطل و بے بنیاد تھا۔ کہ "ٹریڈ یونین کانگرس کے ذریعہ جو سوشلزم کا پرچار ہو رہا ہے۔ وُہ مادر وطن جرمنی کے لئے نقصان دہ اور تباہی خیز ہو گا"۔

کیونکہ جب ٹریڈ یونین خود ملک و قوم کی پشت و پناہ۔ جفاکش مزدوری پیشہ جماعت کے مطالبات کی تکمیل کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ تو اس سے ملک یا قوم کو کسی طرح کا بھی کوئی نقصان پہنچنے کا کیا اندیشہ ہو سکتا تھا؟ میری یہ سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ کہ ہماری یہ کوششیں حب الوطنی اور قوم پرستی کے خلاف کس طرح کہی جا سکتی تھیں؟ میری رائے میں تو عام قومی بیداری کا یہی ایک واحد ذریعہ تھا۔ کیونکہ اس کی ماں بھی کبھی کسی بچے کو بغیر روئے یا مانگے دودھ نہیں پلاتی۔ پھر یہ تو جھگڑا ہی لوٹ کھسوٹ کرنیوالے ظالموں جفاکاروں اور بے زبان لٹے گھسوٹے جانے والے مظلوموں نیز کمال بے رحمی و بے دردی سے دوسروں کا خون چوسنے والوں اور حد درجہ بے کسی و بے بسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر غیروں سے اپنا خون چوسانیوالوں کے درمیان تھا۔ ویسی حالت میں اگر کوئی کمزور شخص کسی طاقت ور اور

کر سکتے ہیں +

غرضیکہ حکومت کی طرف سے دوکانوں - کارخانوں - سبھاؤں - جلسوں اور عام جلوسوں میں "امن عامہ کی حفاظت" کے نام پر اپنی فوجی اور حیوانی طاقت کا برابر اظہار کیا جا رہا تھا - اور اسکی حقیقی وجہ یہ تھی - کہ وُہ عوام کی اس روز افزوں طاقت اور مخالفانہ تحریک سے خوف زدہ ہوتے جا رہے تھے - گو اس میں بھی شک نہیں - کہ اپنے روحانی افلاس و کمزوری کے باعث بہت سے قومی کارکن بھی نام نہاد نمایشی جمہوری طریق حکومت کے جال میں پھنس کر اس کی حکمران ملک کی مدد کے لئے نام نہاد ہو جاتے تھے - کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے - کہ ایسے حضرات صرف حکمرانوں کی زبان سے شاباش - آفرین وغیرہ چند حوصلہ افزا الفاظ سن کر بغیر کسی خاص فائدے یا امید کے عوام کے مبنی بر انصاف مطالبات کی تکمیل کی راہ میں طرح طرح سے روکاوٹیں پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں - جس کا انجام یہ ہوتا ہے - کہ وُہ بے وقوف اپنی حماقت اور کمزوری کی بدولت عوام کی نظروں سے گر جاتے رہیں - اور ان کا اعتبار و اعتماد ہمیشہ کے لئے خاک میں مل جاتا ہے - بالکل ایسی حالت ہمارے بھی چند کارکنوں کی کی ہوئی - جنہیں کہ آخر کار ہم نے اپنی ٹریڈ یونین کانگرس سے نکال دیا +

میں بیس سال کی عمر میں ٹریڈ یونین کا ایک سرگرم کارکن مانا جانے لگا - اور یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں - کہ اس زمانے میں ٹریڈ یونین ہی ایک سیاسی سنستھا تھی - جس کا مقصد یہ تھا - کہ عوام کے قومی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے ملک بھر میں اس کے سنگٹھن اور تنظیم کا بیج بو دیا جائے چنانچہ حکام بھی بہت ہی جلد اس سنستھا کی عظمت و اہمیت کو پہچان کر اس سے خوف کھانے لگے تھے - کیونکہ ہماری یہ مزدور تحریک اگرچہ بلاشک وشبہ

اضطراب کی کچھ پرواہ نہ کرکے ہمیشہ اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں ہمیشہ ہی زبردست و غالب فریق کی فتح ہوا کرتی ہے۔ اور کمزور ہی پیپا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی صریح و صاف ہے۔ کہ اگر ایسے موقعہ پر جو کوئی بھی محض اپنے پیسوں کے گھمنڈ میں محنت کش مزدوروں اور ان کی زبردست مجموعی طاقت کو نظر انداز کرتا ہے۔ یا حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ وُہ ہمیشہ منہ کی کھاتا ہے۔ اور آخرش اُسے اپنے مغرور سر کو جھکائے بغیر اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اتفاق و اتحاد میں ایک زبردست اور ناقابل مغلوب طاقت پوشیدہ ہے۔ جس کے سامنے کبھی بھی سرکش و جفا کار کی نہ کبھی کچھ چلی ہے۔ اور نہ زمانہ مستقبل میں ہی کبھی کچھ چل سکے گی ✦

اس لئے چند سالوں میں ہی اس نمائشی اور نام نہاد جمہوری حکومت کی غلط کاریوں اور خود پرستیوں کی بدولت ہماری ٹریڈ یونین تحریک آہستہ آہستہ چمک اُٹھی۔ کیونکہ ملک کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اور حکمرانوں کی لاکھ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی کسی طرح سدھارے نہ سدھرتی تھی۔ ایسے حالات میں اکثر حکمران جماعت کی اقتصادی حالت بھی نازک ہو جایا کرتی ہے۔ اور وُہ گھبرا کر اپنا سیدھا اور سچا راستہ بھول جایا کرتی ہے۔ جس کا انجام یہ ہوتا ہے۔ کہ امیری اور غریبی کے درمیان رشوت ستانی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اور اپنے چند اعلٰے لیڈروں اور رہنماؤں کی خود غرضیوں اور خود پرستیوں کا شکار ہو کر اچھی سے اچھی اور زبردست تحریک کمزور ہو جایا کرتی ہے۔ چنانچہ اس زمانہ میں ہماری ٹریڈ یونین کانگرس بھی اس خرابی سے محفوظ نہ رہ سکی اور اس کے چند لیڈر اپنی تحریک کے تمام پاکیزہ و اعلٰی اغراض و مقاصد کو بھول کر

زبردست شخص کے جور و ظلم سے تنگ آکر اس کے مقابلے میں سر اٹھاتا ہے۔ یا اس کے خلاف کچھ نالہ و فریاد کرتا ہے۔ تو اسمیں بے جا نا روا ہی کیا ہے؟ کیونکہ اب وہ وقت آگیا ہے۔ جبکہ ہر شخص کیا امیر کیا غریب۔ کیا راجہ کیا پرجا۔ ہر ایک ہی اپنے حق کی حفاظت کے لئے لڑنے مرنے کو سربکف ہے۔ اسی لئے ہماری یہ تحریک بھی اس زمانے میں اہم و عظیم تحریک عوام بن گئی تھی۔ اور تمام قومی و ملکی مجلسی و جماعتی خرابیوں کی حقیقی اور اصلی صورت عوام کے سامنے ننگی دھڑنگی پیش کر کے اور انہیں بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کے حق میں اپنی پرزور آواز بلند کر کے اس نے بلا شک و شبہ جرمن قوم کو بے حد و بے اندازہ فائدہ پہنچایا تھا۔

جہاں تک مالک و ملازم کے حقوق و فرائض کا تعلق ہے۔ اسے پیش نظر رکھ کر ہر ایک سرکاری افسر و ملازم کا یہ فرض منصبی ہی نہیں۔ بلکہ پرماتما کی طرف سے قائم کردہ حق و ایمان ہے۔ کہ وہ ہر ایک خدمت میں محض اپنے ذاتی مفاد و بہتری کو ہی مدنظر نہ رکھے۔ بلکہ صرف قومی و ملکی بہتری و بہبودی کے خیال سے ہی اسے سرانجام دے۔ اور کسی خاص ہستی کے خواہ وہ کتنی ہی سربلند و زبردست کیوں نہ ہو۔ فائدہ و خوشنودی مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف عامہ باشندگان ملک کے مفاد کو ہی اپنے دھیان میں رکھے۔ اور یہ خیال کبھی اپنے دل سے دور نہ ہونے دے۔ کہ یہ خود غرض و مطلب پرست سرمایہ دار نہ کبھی کسی کے ہوئے ہیں۔ اور نہ کبھی ہونگے +

اور عوام کی بہتری و بہبودی کے خلاف نقصان دہ اور قابل مذمت خیالات کا پرچار کبھی رعایا کے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز کر کے اسکے جذبات میں ایک طوفان پیدا کر دیتا ہے۔ اور افسران و کارکنان حکومت اس سے پیدا

اس صورت حال کو دیکھ کر میں پھولا نہ سماتا تھا۔ میرا حوصلہ ان اچانک تبدیلیوں سے کچھ پست ہونے کی بجائے اور بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اور مجھے اپنے طریق کار میں کسی بھی تبدیلی کی کوئی گنجائش یا ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ میں حکومت وقت کی نمایاں پالیسی کا جتنا بھی بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ اتنی ہی میری خواہش اپنی سرگرمیوں کو بالکل اسی طرح جاری رکھنے اور بالآخر آہستہ آہستہ حکومتی پالیسی کے گہرے اندرونی رازوں کا پتہ لگانے کے لئے نہایت تیز ہوتی جاتی اور مجھے حکومت کی تمام دلائل و اعلانات بالکل لغو و فضول معلوم دیتے تھے۔ ان کی کسی بات سے بھی میری آتما کو کوئی حقیقی تسکین نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ میں اس راز کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ کہ یہ سب لغو تھی اور بے سروپا باتیں کیوں بنائی جاتی ہیں ؟ +

اب میں نے کمال غور و خوض سے باشندگان جرمنی کی قومی عادات و خصلات کا مطالعہ شروع کیا۔ اور اس تباہ کن پالیسی کی جڑ بنیاد کی تلاش کی جس کی پیروی میں ان کی عادات و خصلات کو کمزور و برباد کیا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہودی اور ان کی طاقت سرمایہ داری ہی ان تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ تمام ٹریڈ یونینوں عام سنستھاؤں اور سرکاری ملازمتوں وغیرہ میں یہودیوں کا ہی بول بالا ہے۔ اور ان ہی کا زبردست ہاتھ سب جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان ہی کی وجہ سے ہر جگہ پُر فریب و نمائشی جمہوری طریق حکومت کا زور بڑھتا رہا ہے۔ اسی لئے آج میں پورے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ "یہودی" لفظ کے حقیقی مطلب و مدعا کو سمجھتے ہی میرے خیالات میں ایک حیرت انگیز انقلاب شروع ہو گیا +

مجھے یاد نہیں آتا۔ کہ اس سے پہلے بھی میں نے کبھی اپنے والد بزرگوار کی

"پیسہ! پیسہ! پیسے کی واہ واہ!"

کے گیت گانے لگے۔ آہستہ آہستہ پوری طرح سرمایہ پرستوں کے جال میں پھنس کر ان کی انگلیوں پر ناچنے والی بے جان کٹ پتلیاں بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ عوام کے دلوں پر تمام اثر ورسوخ کھو بیٹھے +

دوسری طرف ان کے اس غلط طریق عمل کی مخالفت کرنے کی بجائے درمیانہ وادنیٰ درجہ کے کارکنوں اور مزدوروں نے اپنے ڈھیلے پن اور ناتجربہ کاری کے باعث تحریک کو ہی ایک غلط راستے پر ڈال دیا۔ اس سے کچھ عرصہ تک کیلئے اس کی ترقی رُک گئی۔ اور وہ بظاہر ناکامیاب سی رہ گئی۔ جس سے صورت حال اور بھی بد سے بدتر ہوگئی۔ اور میدان سیاسیات میں ٹریڈیونین تحریک عوام کی نظروں سے گر کر لوگوں کی عقیدت اس پر سے اٹھ گئی +

حکمرانوں کی یہ چالبازی اور اس کی کامیابی ملکی قومی آزادی کے راستے میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہوئی۔ اور کئی خود غرض و مطلب پرست لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کی امید میں دل پسند خواب دیکھنے لگے۔ لیکن خوش قسمتی سے عین موقعہ پر عوام ہوشیار ہو گئے۔ ان کے دلوں میں جلد ہی قوم پرستی کے ہنگامہ خیز جذبات پھر ابھر آئے۔ اور انقلاب زندہ باد۔ غلامی برباد۔ سرمایہ پرست حکومت کا خاتمہ کردو۔ وغیرہ وغیرہ محشر انگیز نعروں سے زمین و آسمان گونج اٹھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا عوام کی تعداد کثیر ابھی تک حصول آزادی کے متعلق اپنے پہلے اور پرانے خیالات کو بھولی نہ تھی۔ بلکہ صرف اپنے چند سربرآوردہ رہنماؤں کی ذاتی کمزوریوں اور خود غرضیوں کو دیکھ کر حیران اور ششدر رہ گئی۔ ورنہ سب کے سب تہ دل سے آزادی واخوت کے پوجاری اور پرستار تھے +

کے باعث وُہ بھی اور لوگوں کی مانند یورپین ہی سمجھے جاتے تھے۔ میں خود بھی انہیں جرمن ہی خیال کرتا تھا۔ لیکن اپنی اس غلط فہمی کے متعلق اس وقت تک کچھ بھی خیال پیدا نہ ہُوا تھا۔ جب تک کہ ان کے مذہبی اختلافات کی طرف میری توجہ نہیں گئی۔ جب میں یہ سوچتا تھا۔ کہ لوگ ان کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں۔ تو مذہبی معاملات و توہمات کی طرف میری نفرت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک یہودیوں کی اس پوشیدہ وطن دشمنی کا مجھے کچھ بھی خیال نہ تھا۔

اس کے بعد میں ویانا چلا آیا۔ صنعتی و کاروباری خیالات کی پریشانی اور اپنی تازہ بدقسمتی و تنگ حالی کے باعث کچھ مدت تک میں اس عظیم الشان شہر میں مختلف جماعتوں کے لوگوں سے ناواقف و الگ تھلگ رہا۔ اگرچہ ویانا کی بیس لاکھ کے قریب آبادی میں سے یہودیوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی۔ مگر پھر بھی ان کے اندرونی حالات سے کچھ زیادہ واقفیت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اوّل تو میری آنکھیں اور میرا دماغ دونوں ہی کسی چیز کو اس کے اصلی رنگ و روپ میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مگر آہستہ آہستہ یہ حالت بدلتی گئی۔ کچھ دنوں میں میرے خیالات زیادہ سنجیدہ اور گہرے ہوتے گئے۔ اور میں یہودیوں کے سوال پر مناسب غور و خوض کرنے کے قابل ہو گیا۔ لیکن میں نے اس سوال کے مذہبی پہلو پر غور کرتے ہوئے بھی اس کے قومی و وطنی پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور صرف ان کی مذہبی باتوں کو پیش نظر رکھ کر ان پر کبھی حملہ نہیں کیا۔ حالانکہ مخالف یہودی پریس نے اس وقت بھی اہل جرمن کی قدیم تہذیب اور ان کی قومی روایات پر حملے شروع کر دیئے تھے +

ایک روز اچانک ہی زمانہ وسطیٰ کے چند واقعات کا خیال کر کے میرا دل

زبان مبارک سے "یہودی" کا لفظ سنا تھا۔ اگرچہ میرا یہ خیال ضرور ہے۔ کہ وُہ شاید انہیں تہذیب و ترقی کا علمبردار سمجھا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیالات ایک وسیع الخیال آزادی پسند بین الاقوامی شخص کے سے تھے۔ آزادی و حریت پسندی کا جذبہ قدرت کی طرف سے ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا تھا۔ اور وہی آج مجھے بھی ان سے ورثے میں حاصل ہُوا ہے +

اس جماعت کے تعلق میں آکر میری آنکھوں کے سامنے سے تمام فریب آمود جھوٹے خیالات کا ایک پردہ سا اٹھ گیا۔ ان کی پارٹی کے تمام اغراض و مقاصد مجھے ان کی ننگی صورت میں صاف نظر آنے لگے۔ اور میں یہ اچھی طرح سمجھ گیا۔ کہ یہودی مارکس کے اصولوں کو محض اپنی خود غرضی سے کس طرح غلط و مناسب طور پر استعمال کر رہے ہیں +

تب مجھے یاد آیا۔ کہ سکول میں بھی میرے ساتھ ایک یہودی لڑکا پڑھا کرتا تھا۔ ہم سب سے پہلے اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن بعد میں جب اس کی پُرمتانت سنجیدگی اور خاموشی کا بھید ہم پر ظاہر ہُوا۔ تو ہم نے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا۔ شاید وہی زمانہ تھا۔ جبکہ تقریباً ۱۴-۱۵ سال کی عمر میں سب سے پہلے میں نے "یہودی" لفظ سنا تھا۔ لیکن اس لفظ کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔ اس کے چند روز بعد سے ہی میرے دل میں اُن کی مخالفت کا خیال روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اور جب سے میں نے ان کے مذہب کے متعلق بحث و تکرار سنی۔ تب سے تو نہ معلوم کیوں؟ میرا دل ان کی طرف سے بہت ہی کھٹا ہو گیا۔ کیونکہ اس زمانے میں بھی مذہبی بحث و تمحیص کو کسی دل پسند رنگ میں دیکھنے کو تیار نہ تھا +

لینز میں بہت ہی کم یہودی رہتے تھے۔ اور صدیوں سے وہاں رہنے

کالموں میں ان کارروائیوں کا ذکر ہوتا تھا۔ اس سے بلا مبالغہ یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ ان کی ہستی کسی خاص شخص کی مطلب براری کے لئے ہے۔ اس لئے میں اُن کی سرگرمیوں کو ملک و قوم کے لئے نہایت خطرناک اور نقصان دہ سمجھنے لگا۔

اس طرح مجھے کچھ عرصے تک ویانا میں گمنامی اور خاموشی کی حالت میں رہنا پڑا۔ مگر میں اس اثنا میں برابر مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے سیاسی و مجلسی سوالات کا پورے پورے غور و خوض کے ساتھ نہایت گہرا مطالعہ کرتا رہا۔ اور اکثر کمال و تعجب کے ساتھ اصلی جمہوری حکومت کے عروج و نشو و نما اور سلطنت پرست آسٹرین حکومت کے زوال و تباہی کا نقشہ عالم خیال میں اپنی نگاہوں کے سامنے کھینچتا رہا۔ اگرچہ کبھی کبھی پردیسی حکومت کی ٹیڑھی ترچھی پُر فریب سیاسی چالوں کا خیال کرکے میرا دل بےچین ہو جاتا تھا۔ مگر پھر بھی اپنے پیارے وطن کی ناقابل برداشت غلامی و فرمانبرداری کی بےشمار و بےحساب تکلیفوں۔ مجبوریوں اور معذوریوں سے پُر زندگی کو محسوس کرکے میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اور میری حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی تھی۔

اس وقت جرمنی میں قیصر ولیم ثانی کے خلاف جو تحریک جاری تھی۔ اس سے مجھے ذرہ بھر ہمدردی نہیں تھی۔ کیونکہ میں اُسے شہنشاہ جرمنی ہی نہیں بلکہ جرمنی کی نئی فوجی طاقت کا اصلی علمبردار سمجھتا تھا۔ جرمن پارلیمنٹ (ریشتاغ) نے جب شاہی تقریروں پر کچھ پابندیاں عائد کر دیں۔ تو اُن سے بہت پریشان ہو اٹھا۔ کیونکہ میری رائے میں یہ حرکت ایسی خاص جماعت کی تھی۔ جسے تمام رعایا کی طرف سے ایسا کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ ان نام نہاد پارلیمنٹری اختیارات حکومت رکھنے والے حکمرانوں نے اس کے بعد خود اتنی بک بک کی تھی۔ کہ شاہی خاندان کے کسی کمزور

کانپ اُٹھا۔ حالانکہ ان ہیبت ناک مناظر کو پھر ایک مرتبہ دیکھنے کے خیال سے مجھے کچھ زیادہ خوف معلوم نہ ہوتا تھا۔ ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اخبارات جو رنگ آمیزیاں کیا کرتے تھے۔ وُہ بھی عوام کی نظروں میں کچھ پسندیدہ نہ تھیں لیکن اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔ مگر پھر بھی یہ ضرور کہونگا۔ کہ ان اخبارات کا مقصد قوم و ملک میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی بجائے مغائرت اور دشمنی کی آگ کو تیز سے تیز تر کر کے فتنۂ و فساد کے شعلے بھڑکانے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اور یہ شرارت کی ابتدا ہمیشہ اُن بگڑے دماغ اخبار نویسوں کی طرف سے ہُوا کرتی تھی۔ جو اپنی خودغرضی اور سنہری روپہری مصلحتوں کے زیر اثر اناپ شناپ جو بھی چاہتے تھے۔ لکھ مارتے تھے +

جب میں نے ان اخبارات کی یہ مذموم روش دیکھی۔ کہ اکثر قابل اعتراض باتوں کی سخت مخالفت کرنے کی بجائے یا تو وُہ ان کے متعلق بالکل ہی خاموشی اختیار کر بیٹھتے ہیں۔ یا محض چکنی چپڑی باتیں بنا کر انہیں ٹال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ان کے متعلق میرے خیالات اور بھی پختہ اور مضبوط ہو گئے۔ اور میں یہ سوچنے لگا۔ کہ

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ایک تو چوری دوسرے سینہ زوری ایسے ہی نام نہاد "جرنلز" ایں مختلف خبریں پڑھ کر اور نامناسب خوشامد اور حکومت پرستی سے پُر۔ اس کی حاشیہ آرائیوں پر غور کر کے میرا دل غم و غصہ اور نفرت و حقارت سے تڑپ اُٹھتا تھا۔ اور ہوف برگ کی جو بھی کاروائی ہوتی تھی۔ اس کا اصلی رنگ و روپ میری نگاہوں سے کبھی نہ چھپ سکتا تھا۔ کیونکہ ان کے پس پردہ حقیقت و اصلیت بہت کم ہُوا کرتی تھی۔ اور جب خوشامد آمیز لب و لہجہ میں اُن اخبارات کے

کا اظہار نہائیت مختصر الفاظ میں کیا کرتا تھا۔ مگر پھر بھی اچھی صاف گوئی سے کام لیتا تھا۔ اور سچی سچی خبریں دیا کرتا تھا۔

جب میں دیانا آیا ہی تھا۔ تو میرے خیالات ان دونوں ہی اخبارات یعنی "ورلڈ جرنلز" اور "ڈوکس بلیٹ" کے خلاف تھے۔ کیونکہ میری رائے میں ڈاکٹر لوگر اور کرسچین سوشلسٹ پارٹی دونوں کی ہی سرگرمیاں فرقہ پرستی اور فریق بندی کو تقویت دینے والی تھیں۔ مگر ایک روز میں شہر کے ایک گنجان آباد حصے میں گھوم رہا تھا۔ وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ جو کہ ایک لمبا سا چوغہ پہنے ہوئے تھا۔ میرے دل میں یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ یہودی ہے"۔ میں اس کی نظر بچا کر ترچھی آنکھوں سے نہایت احتیاط کیساتھ اسکی طرف دیکھتا رہا اور پھر میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا۔ کہ "کیا یہ جرمن ہے"؟

اب میں نے اپنے شکوک دور کرنے کے لئے کتابوں کی شرن لی۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ میرا رویہ رہا ہے۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ جبکہ میں نے اپنی گانٹھ سے چند ہیلر (جرمن سکے) خرچ کرکے اپنے فریق مخالف کے چند پمفلٹ خریدے۔ اور ان کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کے پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا۔ کہ انکے مصنف اور ناظرین بھی "یہودی سوال" سے کم وبیش واقفیت ضرور رکھتے ہیں۔ ان تصنیفات کے خاتمہ پر مصنفین نے جیسا کہ انکا طریقہ ہے۔ بہت پھیرپھار اور داؤ پیچ سے ہر ایک بحث طلب نکتے کو گول مول باتیں بنا کر جوں کا توں غیر فیصلہ شدہ چھوڑ دیا تھا۔ جس سے میرے دل میں اور بھی طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔ اور انکی لچر دبیہودہ دلیلوں نے قدم قدم پر میری الجھنیں بڑھا کر مجھے کسی خاص نتیجے پر پہنچنے میں ذرہ بھر بھی مدد نہیں دی +

اس طرح یہ سوال میرے لئے اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو گیا۔ اور میں ڈرنے لگا

سے کمزور حکمران نے بھی شاید کبھی ایسی بے سروپا باتیں نہ کہی ہوں۔
غرضیکہ ان خیالات و جذبات نے مجھے ازخود رفتہ اور دیوانہ سا بنا ڈالنے میں کچھ بھی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کہ ملک میں ہر ایک بیوقوف شخص کو الٹی سیدھی من مانی دیل بازی کرنے کا حق حاصل ہو رہا ہے۔ اور وہ ریشتاغ کی طرف سے عوام پر حکومت کرنے کے لئے قانوناً مقرر کیا جا سکتا ہے۔ یا ایک تاج و تخت کے مالک کو بھی ایسے بے جا و بیہودہ طریق پر کسی خاص جماعت کی طرف سے یوں ڈانٹا اور پھٹکارا جا سکتا ہے +

یہ دیکھ کر میرے دل میں اور بھی آگ لگ گئی۔ کہ ویانا کے اخبارات جو اپنی حکومت کے ادنٰے سے ادنٰے افسروں کے آگے سر تسلیم خم کئے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ جرمن شہنشاہ کے خلاف زہر اگلنے میں سب سے پہلے قدم مار رہے ہیں۔ اور بہانے کے طور جھوٹے ٹسوے بہا بہا کر یہ خیال ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ رائے عامہ کی حمایت و تائید ہی اخبارات کا سب سے افضل و برتر مقصد ہے۔ حالانکہ ان کی تحریر کا پوشیدہ منشا و مقصد سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں۔ کہ شہنشاہ جرمنی کی توہین و بدگوئی کی جائے +

ساتھ ہی اس کے میں ایک دوسرے اخبار کے طریق عمل سے کسی قدر مطمئن بھی ہوا۔ کیونکہ قیصر جرمنی کی طرف اس کا رویہ پُر از احترام تھا۔ اگرچہ فرانس کی قابل نفرت رویہ پر اس نے بھی ایسے خوشامدانہ انداز سے حاشیہ آرائی کی تھی۔ کہ اس کی اس چاپلوسی آمیز روش پر ہر شخص کو ندامت سے سر جھکا لینا پڑتا تھا۔ میں تو اس طرح بار بار فرانس کی فضول خوشامد کرنے والے اخبارات سے سخت متنفر ہو گیا تھا۔ اس بارے میں "ڈوئس بلیٹ" اخبار کی پالیسی مجھے بہت کچھ پسند تھی۔ اگرچہ وُہ بھی اس پہلو میں اپنے خیالات

کے لئے بالآخر نقصان دہ ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اسے بہرحال "ایک یہودی خیال" ہی سمجھتے رہے۔ اسلئے ان دونوں جماعتوں کے اندرونی مقاصد ظاہری رسم ورواج اور باہمی تعلقات میں مجھے کچھ بھی فرق نظر نہیں آتا۔ اور میں ان میں کوئی بھی تمیز قائم نہ کرسکتا تھا۔

نازیونسٹوں (جیساکہ یہ نئی جماعت کہلاتی تھی) اور یہودیوں کے اس باہمی اختلاف سے کچھ عرصہ تک تو میں بہت پریشان رہا۔ مگر آخر مجھے ایک نمایشی فریب اور دھوکے کے سوا اس میں اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ اور میں اسے بھی نام نہاد "پاک" لیکن درحقیقت پُرفریب اور مکار یہودی قوم کے اخلاق اور اسکی نشوونما پر ایک مکروہ دھبے کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکا۔

میری رائے میں اس سے یہودیت کو بھی ایک بہت بڑا نقصان یہ پہنچا۔ کہ اسکی نکتہ شناسی۔ علم وادب۔ اداکاری (ڈرامہ) اور تصنیف تالیف میں ایک گراوٹ پیدا ہوگئی۔ جسکا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ان کے طریق تنقید میں ایسی تبدیلی آگئی۔ جسے ان دنوں ہر شخص ان کے سینماؤں کے پوسٹر دیکھ دیکھ کر محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ ان کے ذریعہ وُہ اپنے قابل نفرت مقاصد کی تکمیل میں نمایاں طور پر مصروف نظر آتے تھے۔ غرضیکہ یہ ایک چھوا چھات کی بیماری تھی۔ جو ان میں آہستہ آہستہ پیدا ہونے لگی۔ میری رائے میں موت اس سے ہزار درجہ اچھی تھی۔ لیکن شاید اس جماعت کے ماتھے پر قدرت کی طرف سے کلنگ کا یہ ٹیکا لگنا ہی تھا۔ اسلئے کون روک سکتا تھا۔

اب میں نہایت غور و توجہ سے ان ڈراموں اور فلموں کے مصنفوں اور تیار کرنے والوں (پروڈیوسروں) کے طریق عمل کا مطالعہ کرنے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہودیوں کے متعلق میری واقفیت نیز انکی عادات خصلات

کہ کہیں میں کسی غلطی میں پھنسکر کسی کے ساتھ کچھ بے انصافی نہ کر بیٹھوں۔ کیونکہ میں اس وقت یہ سوچ سکتا تھا۔ کہ یہ سوال کسی غیر مذہب کی پیرو جرمن جماعت کا نہیں۔ بلکہ ایک بالکل علیحدہ قوم کا ہے جو جرمنوں سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ یا رکھنا نہیں چاہتی۔ جب سے میری توجہ یہودیوں کی طرف مبذول ہوئی تھی۔ تبھی سے ویانا بھی مجھے کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ کا معلوم ہونے لگا تھا۔ میں جہاں کہیں بھی جاتا تھا۔ مجھے یہودی ہی یہودی نظر آتے تھے۔ اور ان کے تمام طریق و اطوار نمایاں طور پر جرمنوں سے مختلف دکھائی دیتے تھے۔ شہر کا اندرونی حصہ اور خصوصاً شہر ڈینیوب کا شمالی علاقہ سب کا سب ایسے لوگوں سے آباد تھا۔ جو کسی بات میں جرمنوں سے کچھ مشابہت نہ رکھتے تھے۔ اس لئے یہ شک و شبہ میرے دل سے دور نہ ہوسکا۔ اور میری توجہ ان کی فرقہ وارانہ کارگذاریوں کی طرف برابر لگی رہی +

اسی اثنا میں یہودیوں میں ایک زبردست تحریک چھڑ گئی۔ ویانا ہی اس کا مرکز تھا۔ اور اس تحریک کا مقصد یہ تھا۔ کہ بطور ایک مذہب یا ایک مشترکہ و متحدہ قومیت کے یہودیت یا جوڈازم کا پرچار کیا جائے۔ یقیناً میرا یہ خیال تھا۔ کہ ان یہودیوں کی ایک بہت بڑی بلکہ کثیر تعداد جماعت اس خیال کی کبھی حمایت اور تائید نہیں کرے گی۔ لیکن پھر بھی میں اس تحریک کا بڑے غور و خوض سے مطالعہ کرتا رہا۔ مگر طرح طرح کے مقولوں اور بھانت بھانت کی بولیوں کے پردے میں چھپی ہوئی ہونے کے باعث مجھے اس کی اصلی صورت صاف صاف دکھائی نہ دی +

اکثر لبرل یہودیوں نے اس تحریک کے حامیوں کے خیال کی اسلئے مخالفت نہیں کی۔ کہ وہ غیر یہودی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ یہ خیالات یہودیت

آہستہ آہستہ یہ راز بھی مجھ پر کھل گیا۔ کہ تمام نام نہاد جمہور نواز اخبارات اور چھاپے خانوں کے مالک اور کرتا دھرتا یہودی ہی ہیں۔ مگر میں نے اُسے کوئی خاص اہمیت دینا ضروری نہ سمجھا۔ کیونکہ اس وقت کوئی ایک اخبار بھی ایسا نہیں تھا جسے صحیح معنوں میں قومی یا ملکی کہا جا سکتا ہو۔ یا جس کا یہودیوں سے کچھ نہ کچھ تعلق نہ ہو۔ سوشلزم کے متعلق ان میں جو مضامین بھی شایع ہوتے تھے۔ ان میں بھی اکثر ضروری نکتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی تھی اور گول مول پُر راز باتوں کی ان کے کالموں میں بھرمار رہا کرتی تھی۔ اس لئے میں انہیں بھی سخت نفرت سے دیکھنے لگا۔ اور انہیں پڑھنے کی مجھے مطلق خواہش نہ رہی۔

لیکن پھر بھی میں نے اپنی طبیعت پر بے حد جبر کر کے مارکس کے نام پر قائم کئے ہوئے ان اصولوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ مگر جب بھی میں انہیں پڑھنے لگتا۔ میری دلی نفرت مجھے آ دباتی۔ آخر میں نے یہ معلوم کرنے کی طرف توجہ دی۔ کہ یہ پُر فریب فضا پیدا کرنے میں کن لوگوں کے ہاتھوں نے کام کیا ہے۔ اور مجھے اس میں ذمہ دار ایڈیٹروں سے لیکر بہت بڑے چھوٹے یہودی لیپٹے دکھائی دیئے۔ جو جرمن تہذیب کو بیخ و بُن سے تباہ کرنے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ میں نے ان سبھی یہودی لیڈروں کے نام نوٹ کر لئے۔ اور مجھے بہت سے مشہور عالم اشخاص بھی ان کے ہمراہ معلوم ہوئے۔

اس طرح میں نے تقریباً سبھی ایسے پمفلٹوں کو اپنے قابو میں کر لیا۔ جنمیں جمہور نوازی کے نام سے یہ نئی قسم کی سوشلسٹ تعلیم دی گئی تھی۔ ان سب کے مصنف تقریباً وہی مذکورہ بالا مشہور لیڈر تھے۔ جن میں ریشتاغ کے ممبر ٹریڈ یونینوں کے سیکرٹری اور مختلف منظم انجمنوں کے صدر اور مبلغ وغیرہ مشہور مشہور یہودی

اور مذموم طریق عمل سے میری نفرت و حقارت میں بھی روز بروز اضافہ ہونے لگا۔
اگرچہ ان کی یہ سب کرتوت دیکھ دیکھ کر میرے جذبات اکثر بھڑک اٹھتے تھے
مگر پھر بھی میں جوں توں انہیں دبا کر ہر ایک واقعہ کی اصلی حقیقت جاننے اور
ٹھیک ٹھیک صورت دیکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے میں
نے ایک مرتبہ پھر اپنے سابق منظورِ نظر اخبار "ورلڈ پریس" کا مطالعہ شروع کیا۔
لیکن دیکھا یہ کہ۔

وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے

مخالفین کے حملوں اور اعتراضات کا جواب دینے کا وہی خوشامد پسندانہ
چکنا چپڑا رنگ ڈھنگ وہی بعض اہم اور نہایت ضروری سوالات پر شرمناک
بلکہ مجرمانہ خاموشی۔ نمایاں طور پر اس کی کمینہ خصلت کا ماتم کرتی ہوئی نظر آتی۔
تنقیدات اس میں شائع ہوتی تھیں۔ ان میں اکثر یہودیوں کی لیاقت و قابلیت
کی مداح سرائی تھی۔ یا جرمنوں کی نکتہ چینی نیز ان کے اوصاف اور خوبیوں پر
کیچڑ اور غلاظت کی بکھیر۔ قیصر جرمنی ولیم ثانی کی مخالفت میں تو کالم کے کالم
اور صفحے کے صفحے رنگے رہتے تھے۔ اب میں اس ہرزہ سرا اخبار کی حقیقی قدر و
قیمت خوب اچھی طرح سمجھ گیا۔ اگرچہ میں یہ بھی کبھی نہ بھولا تھا۔ کہ یہ اخبار
فرانسیسی تہذیب کی جھوٹی تعریفوں کے پل باندھتا رہتا ہے۔ اور کس طرح ہمیشہ
ہی اس کی یہ پالیسی رہی ہے۔ کہ ہر ممکن طریق پر جرمن جاتی کی مذمت کرتا ہے
اور جیسے بھی ہو سکے۔ اسے ہیچ و ناکارہ ثابت کیا کرے۔ غرضیکہ اسطرح جمہوریت
اور آزاد خیالی کی ڈینگیں مارنے والے یہودی لیڈر میری نگاہوں میں بالکل ہی گر
گئے۔ اور اس طرح ان کے متعلق میری تمام دماغی کاوش و کشمکش کا ہمیشہ کے
لئے خاتمہ ہو گیا۔

نہ ہوتی تھی۔ میں اکثر ان کی ایسی کمینہ حرکتوں پر حیران رہ جایا کرتا تھا۔ اور یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ ان کی اس پُر فریب داکاری کی تعریف کی جائے۔ یا ان کے ڈھیٹھ پن یا بے عزتی کی۔ اس طرح ان کے خلاف میرے دل میں روز بروز نفرت اور حقارت زیادہ سے زیادہ تر ہوتی گئی +

مگر اس کا بھی نتیجہ میرے لئے نہایت مفید ثابت ہُوا۔ کیونکہ جس روپ میں یہ بناوٹی سوشلزم اور نقلی جمہوریت کے پرچارک میرے سامنے آئے تھے۔ وُہ درحقیقت ایک شرمناک دھوکے اور فریب کے سوا کچھ بھی ثابت نہ ہُوا۔ اور اس سے میری حب الوطنی کی لگن اور بھی زیادہ تیز ہوگئی۔ اِن روز افزوں تجربات نے ہی ایک دن مارکس آزم کی حقیقت مجھ پر ظاہر کر دی۔ اور اس کی حقیقی تعلیم میری شخصیت کے لئے نہایت مددگار ثابت ہوئی کیونکہ میں اس ناکامیابی سے لطف اندوز ہونے کے لئے بہت بیقرار تھا۔ اور اپنے ناچیز تخیل کی مدد سے میں اس کے انجام پر غور و خوض کیا کرتا تھا۔ حتےٰ کہ ایک دن از خود میرے دل میں یہ سوال اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہ مارکس آزم کے یہ نام نہاد پرچارک اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے جتنا ان اصولوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اتنا وہ دوسروں کی بہتری و بہبودی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ یا نہیں؟ اور میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں مصروف ہوگیا۔ ایک عرصہ دراز تک میں اِس سوال پر غور و خوض کرتا رہا۔ پھر میں نے مارکس کے اصولوں اور ان کے اغراض و مقاصد کو بغور پڑھا۔ اور آخر میرے دل اور میری آتما کے گیان نے مجھے یہ بتلا دیا۔ کہ یہ اصول اور یہ تعلیم بنی نوع انسان کیلئے مفید و منفعت بخش تو ہے۔ مگر اس سے صرف اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل میں مدد لینا حقیقتاً ان کے پرچار میں رکاوٹ ڈالنا اور رخنہ اندازی کرنا ہے۔ اب تو میرے دل میں مارکس ازم کے متعلق پوری پوری

شامل تھے۔ یہ سب ان ہی حضرات کے ہتھکنڈے تھے۔ ان میں سے آسٹرلٹنر۔ ڈیوڈ۔ ایڈلر۔ ایلن بوگین وغیرہ حضرات کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس وقت ایک بات مجھے صریح طور پر نظر آئی۔ وہ یہ کہ ٹریڈ یونینوں کی لیڈری جن کے ساتھ میں کئی مہینوں سے جدوجہد میں مصروف تھا۔ پردیسیوں کے قابو میں تھی۔ اپنے اطمینان کے لئے تو میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ کوئی بھی یہودی درحقیقت جرمن نہیں۔ اور نہ کسی یہودی کو جرمن قوم کے حقوق کی کچھ پرواہ ہی ہے۔ اور اس طرح مجھے اپنی جرمن قوم کی اس بہت بڑی غلطی کا احساس ہو گیا۔ کہ وہ یہودیوں کو جرمن سمجھتی تھی +

جوں جوں میں یہودیوں سے ملتا جلتا تھا۔ میں ان کے اداکارانہ انداز اور نمائشی طور و طریق سے واقف ہوتا جاتا تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کی لاعلمی سے فائدہ اٹھانا خوب جانتے۔ اگر کبھی انکی کوئی چال کامیاب نہ بھی ہو سکتی تھی۔ تو وہ اپنے بیوقوف بے عقل ہونے کے ڈھونگ بھی خوب صفائی سے رچ بیٹھتے تھے۔ جب ان کی مخالفت کر کے ان کے کسی غلط خیال کی تردید کی جاتی تھی۔ تو وہ اپنے مخالف کے ہر خیال کو ماننے کے لئے بظاہر تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن کرتے وہی تھے۔ جو ان کے دل میں ہوتا تھا۔ یعنی کہ

پنچوں کا کہنا سر ماتھے پر لیکن پرنالہ یہیں رہے گا

غرضیکہ وہ ہر طرح اپنے مقصد و منشا کی حفاظت کرتے ہوئے صداقت کی دہائی دیتے رہتے تھے۔ اور جب ان کی وعدہ خلافی پر اعتراض کیا جاتا تو اپنا بھولاپن ظاہر کر کے اپنی غلطی مان لیتے تھے۔ کیونکہ اس وقت ان کیلئے پُر از صداقت دلائل کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہ جاتا۔ اور جھوٹی سچی باتیں بنانے میں انہیں ذرہ بھی شرم محسوس

ذاتی شخصیت کے خلاف تھا۔ اس لئے اگر بے شمار قدرتی اصولوں کے بھی خلاف کہا جائے۔ تو شاید کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ یہودی "مارکس ازم" عوام کی نظروں میں ہر ایک خاص خاص ہستی کی عظمت و اہمیت کو مٹا کر قومیت اور وطنیت کی خصوصیت کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ اور اس طرح من مانے اصولوں سے انقلاب اور عالمگیر امن" کے اغاز کو ایک سخت خطرے میں ڈال دینے والی حالت پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ اس لئے جہاں کہیں بھی یہ یہودی "مارکس ازم" پھیلتا ہے۔ وہاں کے ہی عوام کی ہستی خود بخود بیخ و بنیاد سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے +

اس لئے اگر یہودی اپنے اس نام نہاد "مارکس ازم" سے دنیا کی تمام قوموں پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائینگے۔ تو لازمی طور پر ان کی حکومت نوع انسان کے زوال اور تباہی کا باعث ثابت ہوگی۔ جیسا کہ آج سے ہزاروں سال پہلے بھی ہو چکا ہے۔ لیکن مادرِ قدرت کی لامحدود طاقتیں اپنے خلاف کئے گئے اعمال و افعال کا انتقام لینے اور انکا بدلا دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ اس لئے اور اس طرح میں اپنے آپ کو قادر مطلق اور سرب شکتی مان پرماتما کا ایک انش (جزوی ظہور) مان کر میدان عمل میں آنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور یہودیوں کے خلاف اپنی تحریک کو میں نے ایک پرماتما کی طرف سے قائم شدہ فرض سمجھ لیا +



واقفیت حاصل کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی۔ اور میں نے اُن اصولوں کے بڑے بڑے عالموں اور پرچارکوں کے حالات زندگی کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ اس سے میرا واحد مقصد تھا۔ کہ میں ان اصولوں کے اندرونی رازوں اور رموز کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم حاصل کر دوں +

اس طرح سوشلزم کی تحریک سے مجھے بیحد ہمدردی و عقیدت پیدا ہو گئی۔ اور میں جلد ہی اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گیا۔ جس کیلئے میں نیز یادہ تر "مسئلہ یہود" کا ممنون احسان ہوں۔ جس نے میری توجہ کو مارکس ازم کے اصلی اصولوں کی واقفیت حاصل کرنے کی طرف مائل کر دیا۔ اور جس کے نتیجے کے طور میں یہ اچھی طرح سمجھ گیا۔ کہ یہودی اپنے حقیقی اور دلی منشا کو اتنا کیوں چھپاتے ہیں؟ اس سے ان کا اصلی مطلب کیا ہے؟ اور ان کے علم و ادب کی دورنگی پالیسی کی تہ میں کیا راز کام کرتا ہے +

مجھے اس بات کا پورا پورا فخر ہے۔ کہ مجھے اس پہلو میں کافی واقفیت حاصل کرنے میں ہر طرح کامیابی حاصل ہوئی۔ اس لئے یہ زمانہ میرے خیالات میں ایک گہرا اور عظیم انقلاب پیدا کرنے والا کہا جا سکتا ہے۔ جسے میں اپنی زندگی میں ایک خاص اہمیت دیتا ہوں۔ کیونکہ اسی کی بدولت میں ایک کمزور دنیا دار انسان کے درجے سے اٹھ کر ایک زبردست خیالی دنیا میں زندگی بسر کرنے والا تخیل پرست شخص بن گیا +

اس طرح دنیا کی تاریخ میں یہودی قوم کے تاثرات کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے سامنے ایک عجیب سوال آ کھڑا ہوا۔ وہ یہ کہ "کیا یہودی قوم کا ہمارے اوپر مکمل اقتدار جم گیا ہے"؟ لیکن یہودیت کے اصولوں کے گہرے مطالعہ سے خود بخود اس سوال کا جو جواب مجھے دیا "وہ نہیں" تھا۔ کیونکہ یہودیوں کا مارکس ازم

اور ہر طرح سلطنت کی خدمت گذاری اپنا فرض سمجھتا تھا۔ مگر جب اس کی توجہ اس سلطنت کے سرحدی علاقے کی طرف جاتی تھی۔ تو وُہ اس کی طرف ایسے ہی دیکھتا تھا۔ جیسے کہ ایک سلطنت کا باشندہ دیکھ سکتا ہے جس کی قسمت میں اپنے حقیقی وطن سے دور رہتے ہوئے بھی اپنے بزرگوں کی ماننداں کے وطن کی سچی محبت موجود ہو۔ اور جو اس کی حفاظت میں اپنی جان بھی قربان کر دینے کو آمادہ و کمربستہ رہتا ہو۔ اس طرح ان کے دلوں میں اپنی مادر وطن کے لئے کبھی کوئی غیر ہمدردانہ خیالات جگہ نہ پاتے تھے۔ اور آسٹریا میں رہتے ہُوئے بھی ان کے تمام جذبات و احساسات قدیم جرمنوں کی مانند ہی قائم و برقرار تھے۔

غرضیکہ جرمن آسٹرینوں کا نقطہ خیال سلطنت آسٹریا کے دوسرے باشندوں سے بہت زیادہ وسیع و فیاضانہ تھا۔ مگر پھر بھی آسٹرین حکومت ان ہی کے ہاتھوں میں تھی۔ اور وُہ ہی اس حکومت کے کرتا دھرتا سمجھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سلطنت آسٹریا کی تجارتی و صنعتی کاروبار کو بھی دنیا بھر میں اتنی وسعت دے رکھی تھی۔ جو یہودیوں کی بدولت اسے کبھی بھی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی طرح ایک جرمن آسٹرین کی افواج شاہی میں بھی بھرتی ہو سکتا تھا۔ لیکن وُہ فوج "ہرزی گودینیا" میں رکھی جاتی تھی۔ اور وہیں اس کی چھاؤنی تھی۔ اس کے ادنےٰ و اعلےٰ ترین افسر بھی سب جرمن ہی تھے۔

اسی طرح ہر قسم کی صنعتی و دستکاری اور علمی تحقیقات و مصنوعات کی تعلیم کا کام بھی جرمنوں کے ہی ہاتھوں میں تھا۔ موسیقی۔ مصوری۔ انجینئری اور دیگر علوم و فنون کا مرکز ویانا تھا۔ جو سلطنت بھر میں عروج و ترقی کے آسمان پر ایک روشن ترین ستارے کی مانند چمک و دمک رہا تھا۔ صرف یہ ہی نہیں۔ بلکہ تمام غیر ممالک کے متعلق آسٹریا کی سرکاری پالیسی اور حکمت عملی

ویانا میں سیاسی سرگرمیاں

(۳)

قدیم ڈینیوب کے شاہی خاندان کے دورِ حکومت میں جرمنی کی نسبت آسٹریا میں عام سیاسی معاملات پر خوب سرگرمی کے ساتھ بحث و تمحیص کا بازار گرم رہا کرتا تھا۔ پرشیا۔ ہیپسبرگ نیز جانب شمال کے ساحلی شہروں اور قصبوں میں یہ چرچا اور بھی زیادہ تھا۔ چونکہ آسٹریا کی ہیپسبرگ سلطنت میں جرمن نسل کے باشندوں کی آبادی بہت زیادہ تھی۔ اسلئے وہ اپنی تاریخی نوعیت و آبادی کے خیال سے ہی نہیں بلکہ اپنی سیاسی سرگرمیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے لحاظ سے بھی سب کا رہنما و پیشرو سمجھا جاتا تھا۔ وہاں کی تمدنی زندگی اپنے ڈھنگ کی نرالی ہی تھی۔ اور اس طرح زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ اس پہلو میں بھی سلطنت آسٹریا کا پایہ تخت برابر ترقی کرتا جارہا تھا +

اس زمانے کے آسٹریا میں کئی قوموں اور نسلوں کے باشندے آباد تھے۔ اس کی سیاسی حالت بھی بہت کچھ قابلِ اطمینان اور خاصی اچھی تھی۔ ملکی نظام میں زیادہ تر جرمن عمل و دخل تھا۔ لیکن ایک ایسی وسیع سلطنت جو پانچ کروڑ باشندوں پر مشتمل ہو۔ اور جن میں سے تقریباً ایک کروڑ باشندے مختلف النسل ہوں۔ اسکا نظم و نسق بغیر مفید و منفعت بخش مضبوط اصولوں کی صحیح صحیح پیروی کئے ٹھیک ٹھیک طور پر چلتے رہنا نہایت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی ہر ایک جرمن آسٹرین اس وسیع سلطنت کے سایہ عاطفت میں پُرامن طریق پر اپنی زندگی کے دن بسر کررہا تھا۔

لئے تو اس میں ایک خاص کشش تھی ۔

اب تک ویانا کو اس سلسلہ میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اس وقت بوڈاپسٹ اس کا مدمقابل سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ بوڈاپسٹ بھی ایک اچھا بارونق شہر تھا۔ مگر پھر بھی کئی خاص پُراسرار وجوہات کی بنا پر اس کی عظمت و اہمیت کے بارے میں ایک کشمکش پیدا ہوگئی تھی۔ جس کی مثال سے متاثر ہو کر بہت ہی جلد پراگ۔ لیمبرگ، لے بلیچ شہر بھی اس میدان رقابت میں بوڈاپسٹ کی پیروی کرنے لگے۔ شہنشاہ جوزف ثانی کے زمانہ وفات سے اس پُراسرار کشاکش کی بنیاد پڑی تھی۔ اور اس کا باعث چند ایسے واقعات تھے۔ جن کا تعلق آسٹریا کی نسبت غیر ممالک کے ساتھ بہت زیادہ تھا۔ لیکن اگرچہ یہاں ان کا ذکر سراسر فضول ہوگا۔ مگر پھر بھی یہ کہنا ہی پڑتا ہے۔ کہ اگر اس وقت سلطنت آسٹریا کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی دانشمندانہ و دلیرانہ کوشش کی جاتی۔ تو عین ممکن تھا۔ کہ مستقل اور پائیدار اصولوں کی بنیاد پر یہاں بھی ایک ہر دلعزیز مرکزی حکومت قائم ہو جاتی۔ اس لئے اس سے یہ نتیجہ خیز سیاسی سبق حاصل ہوتا ہے۔ کہ ایک ٹھوس قومیت کی ابتدائی بنیاد قومی اور ملکی زبان کے اصول پر ہی پڑنی چاہیئے۔ اور ہر حکومتی نظام میں اس اصول پر نمایاں طور سے بطور ایک قومی علامت کے عمل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اسکے بغیر کوئی بھی منظم قومیت کبھی خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتی ۔

ماسوا اس کے قومی اتحاد و اتفاق کی ترقی و نشوونما نیز پختگی و مقبولی کا علم اگر کسی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ تو وہ سکولوں اور کالجوں کا ہی ذریعہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے دس بیس سال کی تو کون کہے۔ صدیوں کی مدت درکار ہے۔ یہاں مشکل یہ تھی۔ کہ آسٹرین سلطنت کی تنظیم کسی ایک قوم سے

کی باگ دوڑ بھی زیادہ تر جرمنوں نے ہی سنبھال رکھی تھی۔ اور دفتر خارجہ میں کہیں کہیں کوئی ہنگری کا باشندہ نظر آتا تھا۔ اس لئے ایسی حالت میں اس زمانے کی وسیع آسٹرین سلطنت کا کاروبار حکومت جرمن آسٹرینوں کے تعاون کے بغیر چلنا ایک طرح سے ناممکن ہی تھا +

مختلف النسل اقوام پر مشتمل ہونے کے باعث یہ نہایت ضروری تھا۔ کہ خاص شخصیتوں اور جماعتوں یا قوموں کے ذاتی یا جماعتی اغراض و مقاصد کی طرف کبھی کچھ خاص توجہ نہ دے کر ایک ایسی مرکزی حکومت قائم کی جاتی جس کا مقصد عام رعایا کے مفاد اور حقوق کی حفاظت ہوتا۔ بارہا شہنشاہ آسٹریا کی اس طرف توجہ بھی دلائی گئی لیکن یا تو انہوں نے اس کی طرف کچھ دھیان ہی نہ دیا۔ یا اپنی دوسری گوناگوں مصروفیتوں میں اسے بھول جاتے رہے۔ یا اس مقصد کی تکمیل میں انہیں ایسی رکاوٹیں محسوس ہوتی رہیں۔ جن پر عبور پانا وہ اپنی طاقت سے باہر خیال کرتے تھے +

اس زمانہ میں جرمنی اگرچہ ایک چھوٹا سا ملک تھا۔ لیکن پھر بھی اسکے تمام باشندے ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر آسٹریا کی یہ حالت نہ تھی۔ اگرچہ یہاں بھی ہنگری کے سوا بہت سے علاقوں میں زمانہ قدیم کی تمام تواریخی روایات فراموش ہو چکی تھیں۔ لیکن جمہوری آزادی کی لہر کا دور دورہ تمام یورپی ممالک میں شروع ہو گیا تھا۔ یعنی یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ قصر حکومت کی بنی بنائی بنیادوں پر شخصی خود مختار اور مطلق العنان حکومتوں کی بجائے جمہور نواز آئینی حکومتوں کی بنیاد پڑنی شروع ہو چکی تھی۔ اور مختلف ممالک میں آزاد قومیں یکے بعد دیگرے جنم لینی جا رہی تھیں۔ اس لئے اس صورت حال کا اثر آسٹریا پر پڑنا بھی لازمی اور لابدی تھا۔ اور جرمن آسٹرینوں کے

۱۸۴۸ء کا انقلاب بھی دنیا بھر کی مختلف قوموں کے لیے ترقی و عروج کی جدوجہد کا ایک رہنما تھا۔ اسلئے جمہوری آزادی و حریت کی غرض سے باشندگان آسٹریا کی کشمکش کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ باشندگان جبنی بھی اپنے مستقبل کی کچھ پرواہ نہ کرکے اور اس انقلاب کی بنیادی وجوہات کو اچھی طرح سوچے سمجھے بغیر ہی اس انقلابی تحریک کے طوفانِ عظیم میں کود پڑے۔ اور اپنی طرف سے عالمگیر جمہوریت کے جذبات کو پیدا کرنے میں بھی انہوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن بدقسمتی سے مجبور ہوکر وہ اپنی اس حالت اور ان اصولوں پر قائم نہ رہ سکے۔ اور آخر انہیں ان سے روگرداں ہونا پڑا +

یعنی ایک ہر دلعزیز قومی زبان پیدا کرنے کے بنیادی اصول کی کچھ پرواہ نہ کرکے انہوں نے اپنی نمائندہ حکومت کی جو بنیاد ڈالی وہی جرمن جاتی کے اثر و اقتدار کے لئے تباہ کن ثابت ہوگئی - اور اسی کی وجہ سے ان کی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ لیکن پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا - وہ بھی بذات خود ایک نئی اور شان دار سلطنت کی تدریج نشو و نما کی تاریخ ہے - جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مگر فی الحال میرا یہ ارادہ نہیں کہ میں اس تاریخ کو بہ تفصیل بیان کرنے کی زحمت میں گرفتار ہوں - کیونکہ اس کتاب کی تحریر سے میرا مقصد و مدعا کچھ اور ہی ہے - یہاں ان واقعات کا جو مختصر سا ذکر میں نے کیا ہے۔ اس سے صرف یہی مطلوب ہے۔ کہ ناظرین کو اقوام عالم کے تنزل کی وجوہات اور زمانہ قدیم کے چند ضروری واقعات کا کچھ سرسری سا علم ہو جائے۔ اور وہ سیاسی نقطہ خیال سے مختلف امور پر کچھ غور و خوض کرنا سیکھ جائیں - اگرچہ اپنے متعلق ابھی ابھی ظاہر نہیں کرسکتا۔ کہ ان مذکورہ بالا واقعات کا میری زندگی پہ کیا اثر پڑا ہے۔ اور میں ان سیاسی اصولوں پر کہاں تک عمل کرنے میں کامیاب رہا ہوں +

نہیں ہو تی تھی۔ کیونکہ جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ یہاں مختلف النسل قومیں آباد تھیں۔ ان کی مطلب پرستیوں کا انجام یہ تھا۔ کہ نہ صرف ملکی و قومی رہنمائی اور رہبری میں ہی آپس کی جماعتی کشاکش سے کمزوری اور نکماپن پیدا ہو گیا تھا بلکہ ذاتی اور جماعتی بنا پر نفس پرستی اور حیوانیت کا بھی غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر ہماری خوش قسمتی سے جلد ہی ایک ایسی صورت پیدا ہو گئی۔ جس سے کہ اس نفس پرستی و حیوانیت کی ترقی خود بخود ہی رک گئی۔ اور اس سے وہ تباہ کاری پیدا نہ ہو سکی جو کہ بصورت دیگر پیدا ہونی عین ممکن تھی۔

اس صورت حال کو سمجھنے میں ہیپسبرگ کے شاہی خاندان نے جس کاہلی اور کوڑھ مغزی کا اظہار کیا۔ وہ اس کا سب سے زیادہ قابل مذمت اور لائق نفرت فعل کہلا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ اس خاندان کا طوطی ملک میں بول رہا تھا۔ اسی وقت سے اس کا زوال شروع ہوا۔ جس کا انجام یہ ہوا۔ کہ دنیا سے اس کا نام و نشان ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

جرمنی کے رومن شہنشاہ جوزف دوئم نے اس راز کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ کہ کس طرح اس کے بزرگوں نے اپنی ٹیڑھی ترچھی اور الٹی سیدھی حکمت عملیوں کو عملی صورت دینے سے پہلے ہی اہل بابل کے سے انقلابی بگولے میں پھنس کر اپنی ہستی کو تباہی کے بھنور میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اس دانشمند دوراندیش اور رعایا پرور بادشاہ نے اپنی غیر معمولی محنت و جفاکشی سے اپنے بزرگوں کی غلط کاریوں کی تلافی شروع کر دی۔ اور صدیوں سے تساہل و غفلت میں پڑے ہوئے کام کو اس نے دس سال میں ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا دکھایا لیکن افسوس کہ اسکے جانشین اور وارث نالائق و نااہل ثابت ہوئے۔ اور وہ اس نیک کام کو ویسی ہی خوبی و خوش اسلوبی سے جاری نہ رکھ سکے۔

کے شاہی جھنڈوں کو لہرا کر اپنی جماعتی اختلافات و تعصبات پسند خصلت کا پورا پورا اظہار کرنے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کہ محب وطن جمہور کے لئے یہ ایک ایسا طعن تھا جس میں اپنی دلی تنگ خیالی اور کمینہ پن کو اس کی آخری حد تک ظاہر کر دیا گیا تھا۔ اسلئے اسے اگر اصلاح پسند۔ فدایان آزادی اور شیدایانِ حریت عام باشندگانِ ملک کی صریح اور حد درجہ کی توہین بھی کہا جائے۔ تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا +

اگر ان کے اس غیر ضروری بلکہ بیہودہ و لغو فعل عمل سے آسٹریا کی شاہی تاریخ کی شان و شوکت میں ہی کچھ اضافہ ہوتا۔ تو شاید جمہوریت پرست محبانِ وطن اسے اپنی تحقیر سمجھ کر اور اس کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کر کے ہی اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے۔ مگر ایسا بھی تو نہیں ہوا۔ اور اس طرح انکا سب غم و غصہ ان کے دل ہی دل میں جوش کھاتا رہا +

آسٹرین حکومت کے جرمن عنصر کے نوشتہ تقدیر کا انحصار اس قوت و طاقت پر تھا۔ جو "ریش ریٹ" میں جرمن آسٹرینوں کو حاصل تھی۔ جب تک عام رعایا کو خفیہ بیلٹ کے ذریعہ رائے دینے کا حق حاصل نہیں ہوا تھا۔ تب تک تو "ریش ریٹ" میں جرمنوں نے اپنی اچھی خاصی کثرت و طاقت بنائے رکھی۔ مگر اب حکومت کو یہ پسند نہ تھا۔ پھر اسوقت کی غیر ذمہ دار اور نام نہاد جمہوریت نواز حکومت اپنی جمہور نوازی کے پردے میں جو بھی کرتی۔ تھوڑا تھا۔ چنانچہ اسی لئے یعنی "ریش ریٹ" سے جرمنوں کی ٹھوس اور متحد طاقت کو ہمیشہ کے لئے مٹا دینے کی غرض سے ہی اس نے یہ نئے قواعد اور انوکھے اصول بنائے جانے کا ڈھونگ رچ ڈالا تھا۔ اس عالمگیر حق رائے دہی کے طریق کا انجام یہ ہوا۔ کہ اس کے جاری ہونے کے بعد جرمن پارٹی بیحد کمزور ہو گئی۔ اور "ریشٹ ریٹ" میں اسکے ممبر فال ہی

آسٹریا کی سیاسی سنستھاؤں میں "ریش ریٹ" کا درجہ سب سے افضل و برتر تھا اور وہ آسٹریا کی پارلیمنٹ مانی جاتی تھی۔ اس میں عام رعایا کی سبھی جماعتوں کے نمائندے شامل تھے۔ اور اس زمانے میں اسی کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ بات بھی صاف ہی ظاہر ہے۔ کہ اس کی بنیاد بھی انگلستان کی پارلیمنٹ کے نمونے پر ہی ڈھالی گئی تھی۔ اور اس کا صدر مقام دیانا ہی تھا۔ انگریزی پارلیمنٹ کی طرح اس کے بھی دو ایوان حکومت تھے۔ ایک ایب جی یورڈ بین سیسن، اور دوسرا "ہیرے نس"۔ لیکن ان میں ہاؤس آف لارڈز اور ہاؤس آف کامنس سے کچھ فرق بھی تھا۔ اور یہ بالکل ہی ان کی نقل نہ تھے۔ یعنی جس وقت لارڈ بیری نے پارلیمنٹ کے ان دونوں ایوانات کا خاکہ تیار کیا۔ تو اس نے ان میں طاقچوں ستونوں اور مربع مستطیل گوشوں کی شان و شوکت کا کچھ بھی خیال نہ کرکے ان کی عمارات کو کچھ ایسے طریق پر آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔ کہ وہ تاریخ برطانیہ میں بذات خود ایک عجیب چیز بن گئے۔ اور تخیل و تصور کی جدت طرازی کے لحاظ سے ملک و قوم کے لئے باعث فخر مانے جانے لگے۔

لیکن آسٹریا میں سب سے پہلے اور سب سے بڑی مشکل یہ درپیش آئی۔ کہ جب عوام کے نمائندوں کے اجلاسوں کے لئے "ڈین نیس نین" کی سر بفلک اور خوبصورت عمارت سنگ مرمر سے بنکر تیار ہوئی۔ اور اس کی چوٹی پر کلش چڑھایا گیا۔ تو ارباب حکومت کی یہی خواہش تھی۔ کہ اسے زمانہ قدیم کی نمائشی علامات سے آراستہ کیا جائے۔ قدامت پرست یونانی اور عہدیداروں اور منطقی عالموں نے بھی اس خیال کی تائید کی۔ اور اس طرح اسے قدیم تھیسٹروں یا اوپیرا ہاؤسوں کی مانند سجا کر مغربی جمہوریت کی جدت پسندی کا من مانا مذاق اڑایا گیا۔ صرف یہ ہی نہیں۔ بلکہ ان حضرات نے اسکی فلک بوس چوٹی پر قدیم عالمگیر حکومتوں

لگا۔ کیونکہ میں یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ کہ جرمنی میں رہ کر کسی حالت میں بھی مجھے اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ اگر سب سے پہلے میں جرمن پارلیمنٹ کی ہی لغویت سمجھ لیتا تو ممکن تھا کہ میرے خیالات اب کی نسبت کچھ مختلف ہوتے۔ اور میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ جو اپنے منہ پر آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے بنے رہتے ہیں۔ اور قوم یا حکومت کی بہتری کے خیال سے استحکام سلطنت کے خواب دیکھتے ہوئے انسانیت کی ترقی اور رفتار زمانہ کی مخالفت کرتے رہتے ہیں +

لیکن آسٹریا میں یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہاں ایسی سہولیت کے ساتھ غلطی پر غلطی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اگر آسٹریا کی پارلیمنٹ نااہل و ناقابل تھی تو وہاں کے حکمران شاہی خاندان ہیپسبرگ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر نالایق و نامعقول تھا۔ لیکن جب پارلیمنٹ کوئی ایسا ہی خلاف انصاف کام کر بیٹھتی ہے تو اس کی ذمہ داری کسی بھی خاص شخصیت پر عائد نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے کوئی بھی جوابدہ نہیں ہوتا +

اب یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کہ کیا اس گورنمنٹ کو جو نظام حکومت کو کسی طرح کچھ نقصان پہنچا کر صرف استعفےٰ داخل کر کے ہی اپنی غلط کاریوں کے نتائج سے بچ جاتی ہے۔ اس نقصان کے لئے جوابدہ نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ جو اس کی غلطیوں سے ملک و قوم کو پہنچا ہے۔ کیا پارلیمنٹ کی شکست اور تنظیم کی تبدیلی کی تمام ذمہ داری بھی اسی کے سر پر نہیں لادی جاسکتی؟ اگر نہیں تو کیا اس سے اختلاف رائے رکھنے والے مخالف بھی گورنمنٹ کی غلط کاریوں کے لئے جوابدہ قرار دیئے جاسکتے ہیں؟ کیا کوئی شخص بھی کسی خاص ہستی کو کسی ایسی گورنمنٹ کے کسی کام کے لئے ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے جسکی مشینری پر

رہ گئے۔ ساتھ ہی اس کے حکومت آسٹریا میں پھر جرمن آسٹرینوں کی جتھہ بندی اور تنظیم کا کوئی راستہ کھلا نہیں رہا۔

عوام کی نمائندگی کے ذریعہ قوم پرستی کے خیالات کی حفاظت وپرچار کا جو ڈھونگ اس طرح رچا گیا تھا۔ اس پر میرے دل میں کبھی بھی کوئی عقیدت یا اعتماد پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ اس طرح جرمنوں کو ان کے جائز حق نمائندگی سے ہمیشہ محروم رکھنے کی ایک صریح کوشش کی گئی ہے اور دیگر نقائص کی مانند یہ نقص بھی صرف اپنے فوری منشا و مدعا کی حد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس کا تعلق ایک نہایت وسیع پیمانے پر تمام آسٹرین حکومت کے ساتھ تھا۔

شروع شروع میں تو اس مسئلہ کے متعلق میں یہی سوچا کرتا تھا۔ اگرچہ پہلے کی مانند جرمنوں کی کثرت رائے کو اب بھی قائم رکھا جاتا تھا۔ تب بھی ان اصولوں میں کسی طرح سے کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہ پڑتی لیکن سوشلزم کے پردے میں حکومت پرستی کی ہوس کو پورا کرنے کی اس نفرت آمیز کاروائی کو دیکھ کر میں مضطرب ہو گیا۔ کیونکہ اس نا تے کے مغربی جمہوریت کے اصول "مارکس" کی حقیقی تعلیم کے آئندہ حشر کی علامات کو ظاہر کر رہے تھے۔ اور یہ تعلیم ہی اس عالمگیر وبائی مرض کا خاتمہ کرنے والی تھی۔ جو کہ اس وقت چاروں طرف پھیل رہی تھی پارلیمنٹری طریق حکومت تو صرف اس کا ایک بیرونی اور نمائشی غلاف تھا جس سے کہ اس ڈھونگ کی حقیقت کو چھپا کر اس کی اچھی طرح نمائش ہو سکتی تھی۔ گویا بمصداق ایک مشہور جرمن ضرب المثل کے "یہ آگ اور کوڑے کا" ایک ایسا میل تھا۔ جس میں آگ کا خاتمہ بھی خاک یعنی کوڑے کی صورت میں ہی ہو جاتا ہے۔

آخر ویانا میں رہتے ہوئے ہی میں اپنے سلسلہ تحقیقات کے اس امتحان میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اور اپنے دل ہی دل میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونے

قانون یا اصول کی مخالفت ہمیشہ ہی ایک گناہ کبیرہ خیال کی جانی چاہیئے +
کم از کم یہودی اخبارات کا باقاعدہ سرسری مطالعہ کرتے رہنے والے کسی شخص کے لئے بھی یہ تسلیم کرنا بہت ہی مشکل ہوگا کہ وہ جمہور نوازی کے اس سوانگ کا جھوٹا ڈھنڈورہ پیٹنے والی نام نہاد پارلیمنٹ کے عیب و ہنر کے متعلق کچھ بھی واقفیت حاصل کرسکا ہے۔" لیکن اگر وہ ساتھ ہی اس کے خود بھی مختلف واقعات اور صورت حالات پر کچھ غور و خوض کرکے ان سے اپنے لئے آپ مناسب نتائج اخذ کرنے کی عادات و قابلیت رکھتا ہو۔ تو عین ممکن ہے۔ کہ وہ حقیقت حال سے کچھ واقف ہو جائے۔ اور کبھی اصلی معاملات کی تہ تک پہنچ سکے۔ لیکن عوام میں کتنے آدمی ایسے نکلیں گے جن میں متذکرہ بالا اوصاف موجود ہوں۔ درحقیقت اسی لئے ہماری سیاسی زندگی زیادہ تر فضول بک بک جھک جھک میں ہی گذر جاتی ہے۔ اور ہم اندھ وشواس کی لہر میں بہ جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ معاملہ فہم و دانش مند ہوتے ہیں۔ وہ خود سرگرم سیاسیات کے میدان سے ہمیشہ دور بھاگتے ہیں۔ لیکن اس میدان میں داخل ہونے والوں کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کہ حقیقی طور پر کوئی ٹھوس اور مفید کام کرنے کی بجائے صرف اپنی زمانہ شناسی کی بدولت ہوا کا رخ اور لوگوں کی طبیعت کو پہچانتے ہوئے مول تول کرکے اور سودا بھاؤ جانچ کر۔ جیسے بھی ممکن ہو اپنا الو سیدھا کر لیا جائے۔ اور عوام میں سستی ہر دلعزیزی بھی حاصل ہو جائے۔ ایسی حالت میں اگر ملکی سیاسیات کے میدان میں تنگ خیالی۔ تنگ دلی۔ مطلب پرستی خود غرضی۔ چالاکی اور چالبازی کا بول بالا رہتا ہے۔ تو تعجب ہی کیا ہے؟
اس لئے ہمیں یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ ایک قابل بے لوث اور بے غرض شخص کی جو عزت و عظمت ہو سکتی ہے۔ وہ کثیر التعداد اشخاص کے حصے میں کبھی

ان لوگوں کا قبضہ ہو جو اس کے ہرا نہیں نہیں؟ یا کیا کسی بھی سربرآوردہ مدبر
کا یہ فرض نہیں۔ کہ وہ ایسے موقع پر خوب سوچ سمجھ کر کوئی معقول و مدلل
روش اختیار کرے۔ اور اس خرابی کو روکنے کے لئے موزوں و مناسب ذرائع کا
سہارا لے؟ کیا عوام کو اپنی تجاویز کا حامی بنانے کی غرض سے طرح طرح کی الٹی
سیدھی دلیلیں دے دے کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والے چالاک
چالبازوں سے اس کے سوا کچھ اور بھی امید کی جاسکتی ہے؟ بلاشبہ ایک ہوشیار
اور معاملہ فہم مدبر کی پہچان صرف یہ ہے۔ کہ وہ کسی مسئلہ کو کس طرح پیش یا حل
کرتا ہے۔ اور پھر اسے کس طریق سے عملی جامہ پہنا کر پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے! میری
رائے میں تو صرف وہی لوگ مدبر کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ جو عوام کے دلی
خیالات کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوئے انہیں کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر سیدھے
اور پسندیدہ راستے پر لانے کی طاقت رکھتے ہوں +

کیا ہم یہ یقین کر سکتے ہیں۔ کہ کثیر التعداد عام لوگوں کی مشترکہ عقل سے ہی
ترقی ہو سکتی ہے۔ کسی خاص طور پر قابل و لائق شخص کے علم و عقل سے نہیں؟ یا ہم
اس بات کا کبھی خیال تک بھی اپنے دل میں لا سکتے ہیں۔ کہ زمانہ مستقبل میں
بھی نوع انسان کی عقل سلیم ہمیشہ اسی نقصان اور تباہ کن طریق عمل کی پیروی کرتی
رہے گی؟ اسکے علاوہ کیا یہ مسئلہ پہلے کی نسبت آج بدرجہا زیادہ ضروری اور پیچیدہ
نہیں ہو گیا؟ اس سے میری رائے میں تو آجکل کے انقلاب انگیز زمانے میں ایسے
دقیانوسی خیالات ہمارے لئے ضروری نہیں، کہ کسی خاص ہستی کی عظمت و اہمیت
کو نامنظور کر کے اس کی بجائے کثیر التعداد جماعت کے فیصلوں کے سامنے ہی سر
جھکایا جائے۔ اور پارلیمنٹری طریقے کے مطابق کثرت رائے سے ہی منتخب شدہ قابل
اشخاص کی معرفت جو نظام حکومت قائم ہو۔ اس کے مقرر کردہ کسی قاعدے اور

حکمرانوں کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ اُن سے کم طاقت و جرأت نیز جد و جہد اور کشمکش کی ہمت رکھنے والی جماعتوں کے لئے بھی یکساں طور پر کھلے ہیں۔ اور ویسے ہی ضروری ہیں +

ویانا میں رہنے والے ایک پُرجوش نوجوان کی حیثیت سے میں بھی تعلیم و تبلیغ کے ان ذرائع کی اہمیت و عظمت سے پوری طرح واقف تھا۔ شروع میں تو مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہُوا۔ کہ سلطنت اور شاہی حکومت کے پٹھو عام لوگوں کو اپنے من مانے سانچے میں ڈھال کر اسکی طاقت کو نہایت ہی نامناسب طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اور ان ہی کی رائے عوام کی آواز مانی جاتی ہے لیکن درحقیقت جو کچھ بھی لکھا یا کہا جاتا ہے۔ وُہ عوام کی دلی خواہشات یا ان کے حقیقی نقطہ خیال کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔ اور اسے مکاری، جعلسازی یا شیطانی شرارت کے سوا کچھ بھی نام نہیں دیا جا سکتا۔ چند روز میں ہی مجھے یہ خلاف انصاف طریق عمل اربابِ حکومت کے خود غرضانہ اغراض و مقاصد کی تعمیل و تکمیل کا ایک صریحی ذریعہ محسوس ہونے لگا۔ اور علاوہ اسی وقت عوام کی توجہ چند ضروری مسائل کی طرف سے اس طرح ہٹتی ہوئی معلوم دینے لگی۔ گویا کہ انہیں بھلا کر اُن کا دھیان اور طرف لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور چند ہفتوں کے اندر ہی اندر عوام میں ان خوشامدیوں اور چاپلوسیوں کی تعریف شروع ہو گئی۔ جنہیں پہلے گالیاں دی جایا کرتی تھیں۔ اب ان کی جھوٹی اور فرضی خدمتوں کی ہر طرف واہ واہ ہونے لگی۔ اور ڈھنڈورہ پیٹا جانے لگا۔ نیز ان کی ہر دلعزیزی کو بڑھا کر ان کی ذات سے ایسی ایسی امیدیں ظاہر کی گئیں۔ جو کسی طرح بھی پوری نہ ہو سکتی تھیں۔ اور جنہیں کوئی بھی ضمیر پرست محب وطن اپنے ساتھ ایک منٹ کے لئے بھی وابستہ نہیں کر سکتا تھا۔

نہیں ہو سکتی خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ جس طرح ایک سو کیا۔ بلکہ ایک ہزار بے وقوف بھی مل کر کبھی ایک عقلمند شخص کی مانند کسی سوال کو حل نہیں کر سکتے۔ ویسے ہی سو بزدل اور ہزار ڈرپوک اشخاص کی بھیڑ بھاڑ سے بھی کبھی ویسے بہادری ہمت! اور جرأت بھرے کام سرانجام پانے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ جو صرف ایک بہادر اور سورما جرنیل ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔

صرف اسی طرح قوموں اور ملکوں میں انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ اور انکی قسمتوں کا پاسہ ہمیشہ کے لئے پلٹ جاتا ہے۔ کوئی بھی ایسا کام جو لظاہر ہر بنی نوع انسان کے لئے نقصان دہ معلوم ہوتا ہے۔ جب سخت مشکلات و صعوبات کا مردانہ مقابلہ کرتے ہوئے درجہ کامیابی تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ تو وہ عوام کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی تکمیل سے ہی میدان عمل میں ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے اور کسی کو بھی کم ازکم اس وقت اس کے خلاف کچھ چون و چرا کرنے کی جرات نہیں ہوتی ٭

عامہ رائے کے متعلق میرا یہ خیال ہے۔ کہ ہم نہایت ہی معمولی سی کوشش اور سمجھ بوجھ سے یہ معلوم کر سکتے ہیں۔ کہ اس کا رجحان اور رُخ کس طرف ہے۔ یہ ہی نہیں۔ بلکہ اسے جدھر چاہیں۔ بدل بھی سکتے ہیں۔ اسی علم کو روحانی طاقت کا اظہار کہتے ہیں۔ سیاسی نقطۂ خیال سے تو رائے عامہ کا معلوم کرنا اپنی عقل اور روحانی طاقت کے آخری فیصلے پر بہت ہی زیادہ انحصار رکھتا ہے۔ کیونکہ سیاسیات کے مختلف صیغوں میں "صیغۂ تعلیم" کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی دوسری صورت "پرچار" ہے۔ جو اخبار۔ اشتہار۔ ہینڈبل تقریروں اور مباحثوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ یہ سبھی ذرائع عوام کے لئے سکولوں اور کالجوں کا کام دیتے ہیں۔ حقیقتاً ہی کا نام اپنی روحانی طاقت و قوت کا اظہار ہے۔ یہ ذرائع کسی قوم و ملک کے سرکاری

کیا جاسکتا ہے۔ کہ اگر یہ محض ایک بہانہ ہی نہیں تو اور کیا تھا؟ اس قسم کی گورنمنٹ اس انجمن کی منظوری کے بغیر کوئی بھی کام نہ کر سکتی تھی۔ جس نے کہ اسے منتخب کیا تھا۔ اس لیئے کسی کام کے متعلق گورنمنٹ پر بھی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ کسی سوال کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنے کی اسے مجال ہی نہ تھی۔ اور وُہ ہر طرح پارلیمنٹ کی کثرت رائے والی پارٹی کے فیصلے کی پابند تھی۔ یعنی اس کا یہ بھی فرض تھا کہ وُہ بہر صورت کثرت رائے کے حکم کی تعمیل کرتی رہے +

اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ہماری موجودہ جمہور نوازی کا مقصد یہ نہیں کہ انسانی جماعتوں کی تنظیم کر کے انکی مدد سے حکومت کا نظام ٹھیک کیا جائے۔ کیونکہ کوئی خاص اہمیت۔ عظمت اور قابلیت نہ رکھنے والے بزدل مزاج۔ خوشامد پسند لوگوں کے دباؤ سے جن کی عقل ہمیشہ دبی رہتی ہے۔ اور جو غیروں کے اشاروں پر ہی ہمیشہ ناچتے رہتے ہیں۔ وُہ کبھی بھی کسی ذمہ دارانہ حکومتی کام کو مناسب طریق پر سرانجام نہیں دے سکتے۔ ہاں جھوٹی جتھے بندی اور پارٹی بازی کا سوانگ ضرور رچ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی اس کھوکھلی قلعہ بندی سے اصلی کام کرنے والوں پر کسی طرح سے بھی کوئی اثر نہیں پڑسکتا۔ اور نہ ان کی بدنامی ہی ہوسکتی ہے۔ برخلاف اس کے وُہ اصلی کرتا دھرتا ہر طرح من مانی کر کے بھی بھلے کے بھلے ہی بنے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ایسا قانون نافذ ہو جاتا ہے۔ جو عوام کے لیئے نقصان دہ ہے۔ تو ٹٹی کی اوٹ میں شکار کھیلنے والے ان بدمعاشوں کو اس کے لیئے کسی صورت میں بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ حالانکہ جو کچھ ہوتا ہے۔ ان ہی کی کرنی کرتوت سے اور ان کے ہی اشاروں سے ہوتا ہے مگر اس کے لیئے بدنام ہو جاتے ہیں۔ عوام کے کمزور دل نااہل اور فرض ناشناس نمائیندے جو ان چالوں کو اچھی طرح نہ سمجھتے ہوئے۔ یا سمجھتے ہوئے بھی ان کی پورے زور سے مخالفت کرنے کی ہمت و جرات کو ظاہر نہیں کرسکتے۔ اس لیئے حالات موجودہ

اس کے مقابلہ میں عوام کے قابلِ احترام اور واجب التعظیم رہنماؤں پر وہ وہ کلنک لگائے گئے۔ اور ان کے نام نامی ایسے قابلِ نفرت طریق پر تحریر کئے جانے لگے جنکا ٹھنڈے دل سے برداشت کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ گویا کہ حکومت پرستوں کی نظروں میں ان کی گراں بہا اور قابلِ قدر خدمات کا صلہ ان دشنام طرازیوں کے سوا اور کچھ ہو ہی نہ سکتا تھا +

ان محترم ہستیوں کے ساتھ یہ شرمناک سلوک دیکھ کر مجھے جو صدمہ پہنچا۔ وُہ ناقابل بیاں ہے۔ اور مجھے اس زمانے کے اس بڑے شرمناک بیہودہ اخلاق کا اسی طریق پر ترکی بہ ترکی جواب دینا نہایت ضروری محسوس ہونے لگا۔ کیونکہ آزادی مطابع کا اس سے بڑھ کر قابلِ مذمت اور افسوسناک مظاہرہ اور کوئی سمجھ میں ہی نہ آسکتا تھا۔ اور اس طرح دوسرے الفاظ میں اخباری آزادی کے اس مجنونانہ استعمال سے عوام کو بھی اپنے ہر دلعزیز لیڈروں کی حمایت اور ان کی عزت کی حفاظت کے لئے وہی طرزِ تحریر اختیار کے لئے مجبور کیا جارہا تھا۔ اور انہیں ہر طرح کی کھلی دھمکیاں دی جارہی تھیں۔ نیز ان واقعات سے یہ خوب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ کہ جاہل عوام کو کس طرح غلط سلط اور بے بنیاد باتوں کے سبز باغ دکھا کر گمراہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اس نام نہاد جمہور نواز پارلیمنیٹری طریق حکومت کے مقابلے میں جرمن آسٹرینوں کی جمہوریت پرستی کے اصول کتنے اعلےٰ اور بے غرضانہ تھے +

سب سے زیادہ قابلِ غور بات تو یہ تھی کہ دو یا چار سو اشخاص کی ایک ہی جماعت ہر ایک مضمون پر بحث وتمحیص کرکے اس کے متعلق عملی طریق کار تجویز کیا کرتی تھی اور اسی کو گورنمنٹ یا حکومت ماننا پڑتا تھا۔ کیونکہ جو وزارت بنائی جاتی تھی۔ وُہ بھی ان ہی محدود تعداد والے ممبروں میں سے منتخب کی جاتی تھی۔ اور اس متذکرہ بالا ایوانِ وزارت پر ہی ملک کی حکومت کا تمام دارومدار ہوتا تھا۔ اس لئے یہ بآسانی خیال

کے مناپشی ڈھونگ کی کچھ بھی پرواہ نہ کرکے اس قابل ترین ہستی کے حسب ایماء
پر ہی سب کام کرتے ہیں۔ جو اپنی زندگی اس مقصد کے لئے قربان کر بیٹھا ہے۔
اگر کوئی اس پر حملہ کرتا ہے۔ اور اس حملے کا جواب دینے کی کچھ ضرورت محسوس کی
جاتی ہے۔ تو اسے یہی ایک جواب ملتا ہے۔ کہ جرمن جمہوریت ان رجعت پسند
اشخاص کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں کرتی۔ جو ناقابل اور سیاسی نقطۂ خیال سے گرے
ہوئے ہیں۔ اور نہ یہ ان کے بل بوتے پر ہی چل سکتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی نا اہل
بزدل اور کم ہمت شخص کبھی کسی عظیم الشان کام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینے
میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور اپنی نا قابلیت و کمزوری کے باعث حکومت
کا بار گراں سنبھالنا بھی اس کے لئے محال ہو جاتا ہے *

گذشتہ دور کے پارلیمنٹری طریق حکومت نے ہیپسبرگ کی شاہی حکومت
کی بدعنوانیوں اور غلط کاریوں کی رفتہ رفتہ اور بھی حوصلہ افزائی کی۔ اور اسکے ساتھ
ہی ساتھ آسٹریا سے جرمن آسٹرینوں کی طاقت و عظمت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جس کا
انجام یہ ہوا۔ کہ حکومت میں اندرونی اختلافات روز بروز بڑھتے چلے گئے لیکن
بایں ہمہ تمام ارباب حکومت کی واحد کوشش یہی رہی۔ کہ جرمن اقتدار کسی طرح
مضبوط نہ ہو بلکہ رہا سہا بھی ملیا میٹ ہو تا جائے۔ خصوصاً جب سے آرچ ڈیوک
فرانسس فرڈیننڈ نے آسٹریا کی عنان حکومت سنبھالی۔ تب سے تو آسٹریا میں
ڈیک لوگوں کا اثر و عروج آہستہ آہستہ بڑھائے جانے کی سرگرم کوششیں شروع
ہو گئیں۔ کیونکہ اس حکمران نے اپنے دور حکومت کے آغاز سے پہلے ہی جرمن
آسٹرینوں کی طاقت کو منتشر اور کمزور کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اور
اختیارات ملنے پر تو اس کی کوششوں کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔ اسکی ریشہ دوانیوں
سے خالص جرمن دیہات میں بھی آہستہ آہستہ دوسری قوموں کی آبادی اور

میں حکومت کی ہر ایک مناسب و نامناسب کاروائی کی ذمہ داری اور جواب دہی اسی شخص پر عائد ہوتی ہے۔ جو بظاہر عوام کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اور برائے نام انکی رائے کے مطابق کام بھی کرتا ہے۔ خواہ درحقیقت اس کٹھ پتلی کو نچانے والا پس پردہ کوئی اور ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے موجودہ پارلیمنٹ طرزِ حکومت جھوٹوں مکاروں بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے اور ہر کام میں قدم مارنے والوں کے لئے ہی مفید اور مسرت بخش ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس دور اندیش، دانش مند، معاملہ فہم اور اپنی ذمہ داریوں نیز جواب دہیوں کو اچھی طرح سمجھنے بوجھنے والا حقیقی مدبر اور کارکن تو ہمیشہ ایسی صورتِ حال کو نفرت و حقارت کی نگاہوں سے ہی دیکھتا ہے۔

اسلئے یہ ماننا پڑے گا۔ کہ موجودہ نام نہاد جمہور نواز طرزِ حکومت موروثی حق حکومت کے مکار اور خود غرض حمائتوں کی پردہ پوشی کا ایک بہت اچھا ذریعہ بنا ہُوا ہے۔ اور اس کا واحد منشا و مدعا سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں۔ کہ عوام کے مستقبل کو کبھی روشن اور شاندار نہ ہونے دیا جائے۔ اور جب بھی ممکن ہو۔ اسے تاریک و مایوسی بخش ہی بنائے رکھے۔ اسی لئے صرف ایک یہودی ہی اس نمائشی ڈھونگ کی عظمت و اہمیت کا قائل ہو کر اس کی حمایت کر سکتا ہے۔ کیونکہ وُہ خود بھی ویسا ہی مکار، مطلب پرست۔ خود غرض اور چالباز ہے۔ جیسے کہ وُہ لوگ جن کا آلۂ کار وُہ بنا ہوا ہے +

برخلاف اس کے جرمن جمہوریت پسندوں کا مقصد یہ ہے کہ زمانہ ماضی کی ان تمام جماعتوں سے قطع تعلق اختیار کیا جائے۔ جو متضاد صفات و اوصاف کی ہیں۔ اور اپنی حکمتِ عملی کو مدِ نظر رکھ کر بیک وقت انہیں برداشت کر سکتی ہیں۔ مگر یہ روایات یا اوصاف کیا ہیں؟ ان کا فیصلہ بھی ان کا لیڈر خود ہی کرتا ہے۔ اس لئے اس کی تمام ذمہ داری بھی اس کے سر پر رہتی ہے۔ یہ لوگ کثرت رائے

آسٹرینوں کی طاقت کا خاتمہ کرنے کے لئے جو کوشش کی۔ اس کا جواب پین جرمن یعنی تمام جرمن النسل اقوام کے عالمگیر اتحاد کی تحریک سے دیا گیا۔ جو روز بروز مضبوط تر ہوتی گئی +

۱۸۶۶ء کے جنگ کے بعد جبکہ ہیپسبرگ خاندان آسٹریا میں جرمنوں کی تباہی پر آمادہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس نے جس غلام قوم کی پیدائش کا بیج بویا تھا۔ اس کے پھولنے پھلنے میں جرمن جمہور سخت رکاوٹ ثابت ہو رہے تھے۔ ادھر حکومت کی غلط کاریوں کی بدولت جرمنوں میں بھی انقلاب کی آگ روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ اور وہ اس غیر انصافی وستم رانی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کمر بستہ ہوگئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جو ارادہ کیا تھا۔ آخر اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر ایک دنیا کو دکھلا دیا۔ اور قومی آزادی کی روشن شمع کے پروانوں نے حکومت آسٹریا کے خلاف کھلم کھلا علم بغاوت بلند کر دیا۔ مگر ان کی یہ بغاوت آسٹرین قوم کے خلاف نہیں۔ بلکہ ظالم وجفاکار حکومت وقت کے خلاف تھی۔ جو ملک میں مذہبی اختلافات کی آگ کے شعلے بھڑکا کر آزاد قومیت اور اس کی عظمت کے پاک خیال کو ہمیشہ کے لئے کچلنا چاہتی تھی +

کچھ عرصہ سے قدیم جرمن تواریخ کی کتب میں معمولی حکومت پرستی اور اپنی مادر وطن کے لئے خالص و پاکیزہ جذبۂ الفت کے اختلافات پر بحث جاری تھی۔ کیونکہ ہمیں یہ ہرگز نہ بھول جانا چاہیئے۔ کہ انسانی زندگی کا مقدس ترین مقصد کسی حکومت یا قوم کی حمایت یا استحکام نہیں۔ بلکہ اس کے قومی خیالات میں حریت و آزادی پسندی کے پاک اصولوں کے مطابق مناسب و ضروری تبدیلیاں پیدا کرنا ہے۔ تاکہ وہ رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جائے۔ کیونکہ عام انسانی حقوق ہر طرح کے قومی و ملکی حقوق پر کئی گنا زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔ اس لئے

ان کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ اور ان لوگوں کے دلوں میں جرمنوں کے خلاف نفرت و عداوت کے پرچار کو روز بروز ترقی ہونے لگی۔ جنوبی آسٹریا میں تو یہ تحریک اتنی بڑھی۔ کہ زیک لوگ دیا نا کو اپنا سب سے بڑا شہر ماننے لگے ۔

اب ہیپسبرگ خاندان کے با اختیار نمائندے یعنی آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ کے سر پر یہ دھن سوار ہوئی کہ وسط یورپ میں کیتھولک عیسائیوں کی ناخرید غلام اقوام کو ایک مرکزی طاقت بنا دیا جائے۔ تاکہ بولشویک روس کی دست درازیوں سے آسٹریا کی کچھ حفاظت ہو سکے۔ اس لئے اس کے خاندان اور منتظران کار میں آہستہ آہستہ زیک لوگوں کا اثر بڑھنے لگا۔ کیونکہ آرچ ڈیوک کی اپنی رفیقہ حیات بھی ایک زیک خاتون ہی تھی۔ اور اس نے محض اس ایک مقصد کو پیش نظر رکھ کر آرچ ڈیوک سے شادی کی تھی اس کا جنم جرمنوں کے مخالف خاندان میں ہوا تھا۔ اور اسی فضا میں اس نے پرورش پائی تھی۔ غرضیکہ اسطرح ہیپسبرگ خاندان کے طرق حکومت میں سیاسیات کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی عنصر بھی آہستہ آہستہ داخل ہوتا گیا۔ جو جمہوریت پسندوں کے نقطہ خیال سے اور بھی زیادہ ناپسندیدہ و ناقابل برداشت تھا۔ اور اس کا انجام کسی طرح بھی تسلی بخش نہیں ہو سکتا تھا:

مگر جلد ہی ان کی تمام امیدوں نے ناامیدی کی صورت اختیار کر لی۔ رعایا بے قرار و مضطرب ہو اٹھی۔ ظالم حکومت کو بھی اپنا خاتمہ دکھائی دینے لگا ہیپسبرگ خاندان کا تخت و تاج چھن گیا۔ اور یورپ روم کے جال سے ایک اور سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئی۔ کیونکہ سیاسیات میں مذہب کو زبردستی گھسیڑ کر ارباب حکومت نے رعایا کے خوابیدہ جذبہ آزادی کو ایک مرتبہ پھر بیدار کر دیا تھا۔ چنانچہ آسٹریا کے قدیم حکمرانوں نے جرمن

کارل لوزر کرشچین سوشلسٹ کے رہنما کو۔

انسانیت اور پارلیمنٹری نقطہ خیال سے ان دونوں کی ہی ہستی یکساں اہمیت رکھتی تھی۔ دنیاوی سیاسیات کی ناپاک دلدل سے دونوں ہی کوسوں دور تھے۔ میری عقیدت وہمدردی قدرتاً سب سے پہلے سکونرر کی طرف مائل ہوئی۔ لیکن کرسچین سوشلسٹ رہنما کے اوصاف کی عزت کئے بغیر بھی میں نہیں رہ سکا جب میں نے ان دونوں کا مقابلہ کیا۔ تو سکونرر مجھے زمانہ حال کے اہم دنیاوی سوالات پر کسی قدر زیادہ سنجیدگی اور دور اندیشی سے بحث کرنے والا معلوم ہوا۔ اس نے ہی دوسروں کی نسبت سلطنت آسٹریا کی آنے والی تباہی وبربادی کی وجوہات کو زیادہ صاف صریح صورت میں دیکھا تھا۔ اور مجھے یقین کامل ہے۔ کہ اس نے ہیپسبرگ حکومت کو اس کی غلط کاریوں کے متعلق جو بروقت فہمائشیں کی تھیں۔ اگر انہیں حقارت کے ساتھ نظرانداز کردیا جاتا۔ تو شاید تمام یورپ کے خلاف جرمنی کو جنگ آزما ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اور آج کل جرمنی کی حالت کچھ اور ہی ہوتی لیکن میری رائے میں اگرچہ سکونرر آسٹریا کے ان لاحل مسائل کی تہ تک تو پہنچ گیا تھا۔ لیکن انسانی طبائع وخصائل کے پہچاننے اور سمجھنے میں اس نے بھی سخت غلطی کھائی ✦

برخلاف اس کے ڈاکٹر لوزر میں یہی ایک بڑی خصوصیت اور صفت تھی۔ کہ اسے انسانی طبیعت کے اتار چڑھاؤ کا غیرمعمولی علم حاصل تھا۔ اور عام انسانوں کو ان کی حقیقی ہستی وحیثیت برتر دبالاتر نگاہ سے دیکھنے کی کمزوری اس میں نہ تھی۔ ہر ایک چیز کو اس کے رنگ وروپ میں دیکھ لینا ہی اس کا سب سے بڑا اور قابل تقلید وصف تھا۔ اور اس طرح وہ لوگوں کی طاقتوں کا صحیح صحیح اندازہ لگا کر ان کی کامیابی وناکامیابی کے امکان کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتا ہے ✦

اگر نوع انسان کے پیدائشی حقوق کی حفاظت کے لئے مناسب جدوجہد کرنے میں کوئی بدقسمت قوم کسی طرح سے بھی پس و پیش کرتی ہے۔ تو یہ اس کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ کیونکہ دنیا بذات خود ایک میدان جنگ ہے۔ اور یہاں ہر انسان کی زندگی کا یہ مقصد ہونا چاہیئے۔ کہ وہ ایک عام جدوجہد میں مصروف ہو کر اس میں کامیابی حاصل کرے۔ ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اپنے انسانی حقوق کی حفاظت کے لئے جنگ و جدل ہی ہمارا سب سے پہلا فرض ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے اس جائز انسانی حق کی خاطر لڑنے اور کشمکش کرنے سے خوف کھاتی ہے۔ تو وہ اس عالمگیر طوفان جنگ میں اپنی ہستی کو کس طرح برقرار رکھ سکتی ہے ہمیں یہ کبھی بھی نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ دنیا ڈرپوک اور بزدل قوموں کے لئے نہیں ہے۔ صرف بہادروں اور دلیروں کے لئے ہے۔ بمصداق ع مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے"

یا بقول شاعر ؎

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و حق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

اس طرح ایک طرف تو "پین جرمن تحریک" سے تعلق رکھنے والا ہر ایک مسئلہ تھا۔ اور دوسری طرف کرشچین سوشلسٹ پارٹی کی خوفناک ترقی۔ یہ دونوں ہی تحریکیں بطور ایک فرض کے میرے لئے قابلِ مطالعہ اور لائق غور و خوض تھیں کیونکہ ان میں سے پہلی تحریک سے مجھے سچی حب الوطنی کا سبق ملتا تھا۔ اور دوسری سے ٹیڑھی ترچھی سیاسی چالوں کا اس لئے میں نے اپنی سیاسی تعلیم کا مرکز ان ہی دو مختلف ہستیوں کو بنایا۔ جو ان تحریکوں کی روح رواں تھے یعنی ایک تو جارج وان سکونرر پین جرمن تحریک کے لیڈر کو اور دوسرے

انجمنوں اور سنستھاؤں کو اپنے اصولوں کی طرف کشش کر سکے جو کہ اس وقت ملک
میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس طرح وُہ تمام قدیم اور موجودہ ذرائع کی مدد سے ہی
اپنے نئے خیالات کے پرچار میں ہر طرح کامیاب ہو گیا۔ حالانکہ اس نے بھی
اپنے پیروؤں کی اس نئی جماعت کی بنیاد اسی درمیانی طبقے کے لوگوں میں رکھی
تھی۔ جو مالی نقصانات کے خیال سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ مگر اس نے آہستہ
آہستہ اپنے لئے ایسے پیرو پیدا کر لئے جو کمال بے خوفی و ایثار نفسی کے ساتھ
اس کے اصولوں کی حمایت میں ہمیشہ سر بکف رہتے تھے۔ اور اس نے اپنی
غیر معمولی دور اندیشی و معاملہ فہمی سے رومن کیتھولک چرچ سے بھی اپنے تعلقات
قائم کر کے اس کے سب نوجوان پادریوں کو اپنی مٹھی میں کر لیا۔ اور کیتھولک مشن
کے افسروں نے انہیں اس تحریک سے الگ ہونے کے لئے مجبور کیا۔ تو وُہ
اپنی غلامی کی تمام زنجیریں توڑ کر کھلم کھلا اس نئی تحریک کے پرچارکوں میں
آشامل ہوئے +

ڈاکٹر لوزر کے کام کی صرف اسی خصوصیت کا ذکر کرنا میرے لئے ایک سخت
بے انصافی ہو گا۔ کیونکہ وہ صرف ایک ماہر ہوشیار اور چالاک شخص ہی نہیں
تھا۔ بلکہ ایک بلند پایہ ریفارمر اور سدھارک بھی تھا۔ اور اپنی قابلیت نیز زمانے
کے مطابق حاصل [illegible] سہولتوں سے پورا فائدہ اُٹھانے کی طاقت کے علاوہ
وہ اپنی خواہشات پر بھی پورا پورا قابو رکھتا تھا +

اس مشہور راستی پسند شخص نے جو مقاصد اپنے سامنے رکھے تھے۔ وُہ کسی
بھی حالت میں کچھ کم پُرشوکت و دور از حقیقت نہ تھے۔ اس کی [illegible] اگرچہ
ویانا پر اقتدار حاصل کر چکی تھی۔ کیونکہ وہ اس شہر کو ایک ایسی حکومت کا گہوارہ
سمجھ[illegible]تھا۔ جو نہایت ہی کمزور ہو کر گوناگوں امراض کا شکار ہو چکی تھی۔ اور یہ

لیکن سکونزر اس علم کا اتنا ماہر نہ تھا۔ اس لئے پین جرمن تحریک کے سب اصول اصولی طور پر تو بے عیب تھے۔ لیکن اپنی ولی و دماغی طاقت و قوت کو عام لوگوں کے دلوں میں پھونکنے اور پیدا کرنے کی طاقت ان میں نہیں تھی۔ کیونکہ کسی کے دل و دماغ پر اپنی باتوں کا سکہ جما دینا بھی کوئی آسان کام نہیں خصوصاً سکونزر کے لئے تو یہ ناممکن سا تھا۔ کیونکہ اس کے خیالات نہایت محدود تھے۔ گو اس کی عقل ایک روشن اور دور اندیش انسان کی مانند آنے والے واقعات کو نہایت صفائی کے ساتھ دیکھ سکتی تھی۔ لیکن وُہ اپنے دعووں کی صداقت کسی کے دل و دماغ پر نقش نہیں کر سکتی تھی۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی۔ کہ آسٹرین جرمن جماعت متوسط طبقہ کے لوگوں میں جدوجہد اور کشمکش کی طرف جو رغبت تھی۔ اس کے متعلق ان کی محدود سی طاقت کے بارے میں سکونزر کو جو علم تھا وہ بھی بالکل نامکمل بلکہ ادھورا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ سکونزر کی مالی حالت کچھ بہت مضبوط نہ تھی۔ اور یہی کمزوری متوسط طبقے کے لوگوں کو کبھی کوئی اہم کام نہیں کرنے دیتی۔ چنانچہ وُہ بھی اس کو اپنے میدان عمل میں آگے بڑھنے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ اگرچہ میری رائے میں اس کا یہ خیال ٹھیک نہ تھا کیونکہ درمیانی طبقے کی عظمت کی تہ تک نہ پہنچنا ہی مجلسی مسائل کے متعلق اس کے خیالات کی بے اثری کا ایک واحد باعث تھا +

ان سب امور میں ڈاکٹر لوزر کی رائے سکونزر سے بالکل متضاد تھی۔ اس نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ کہ رعایا کے اعلےٰ و اوسط طبقات کی موجودہ طاقت نہایت کمزور رہے ہے۔ اس لئے ان میں کسی نئی تحریک کا کامیابی حاصل کرنا بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ وُہ اپنی تمام حاصل شدہ طاقتوں کے خفیف الوسع استعمال کے لئے ہمیشہ آمادہ رہا۔ اور اس میں یہ طاقت بھی نہ تھی۔ کہ وُہ ان

کو کامیاب نہیں ہونے دیا +

ان میں سے پین جرمن تحریک تو شروع سے ہی عوام کو اپنے معراج خیال کی طرف کشش نہیں کر سکی۔ اس لئے اس کے پیروؤں اور حمائیتیوں کی تعداد بہت ہی کم رہی اور یہی اسکی بے وقت موت کا باعث تھا۔ گو اس میں شک نہیں۔ کہ یہ تحریک ہر طرح قابلِ عزت تھی۔ اور درمیانے طبقے کے ساتھ اس کا نہایت گہرا تعلق تھا۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ اندرونی طور پر نہایت پُرشکوہ و پُر جلال بھی تھی۔ لیکن اس تحریک کے آغاز سے پہلے ہی جرمن آسٹرینوں کی حالت بہت خطرناک ہو چکی تھی۔ اور ان کی مزید تباہی و بربادی کے لئے ہر سال پارلیمنٹ کی پالیسی سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے جرمن قوم کے بچاؤ کا آخری ذریعہ اگر کوئی تھا۔ تو صرف یہ کہ کسی نہ کسی طرح آسٹرین پارلیمنٹ کا جلد سے جلد خاتمہ کیا جائے۔ مگر اس کی بھی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ پھر بھی پین جرمن تحریک کے چند ایک حامی پارلیمنٹ میں گھس گئے۔ لیکن ان کے کرتے دھرتے سے کچھ نہ بنا۔ اور آخر انہیں اپنا سا منہ لے کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ بلکہ جس طرح انہوں نے اپنے مطالبات کو وہاں پیش کیا۔ اُس سے اُن کی عظمت و عزت کچھ بڑھنے کی بجائے اور بھی کم ہو گئی۔ کیونکہ نقار خانے میں طوطی کی آواز کیا اثر کر سکتی ہے؟ اور نہ اُن کے پاس کوئی کثیر الاشاعت اخبارات ہی تھے۔ جن کی مدد سے وہ اپنی آواز کو پارلیمنٹ سے باہر اور اس کے ارد گرد رہنے والی اخبار بین پبلک تک پہنچا سکتے تھے +

میری رائے میں ان کے لئے اپنے مطالبات پیش کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کچھ موزوں مقام بھی نہ تھا۔ بلکہ اس کا سیدھا اور آسان طریقہ یہ تھا۔ کہ وُہ سب سے پہلے عام رائے کو اپنے حق میں کرنے کے لئے پبلک جلسوں میں

اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ جب تک دل کسی قدر تندرست و مضبوط رہتا ہے۔ تب تک دوسرے اعضا کے بھی پھر طاقت حاصل کر کے نئی زندگی پا لینے کی امید کی جاسکتی ہے۔" لیکن اب اس اصول پر عملی طور سے عمل کرنے کے لئے بہت ہی محدود سی مہلت باقی رہ گئی تھی۔ مگر پھر بھی شہر کے ایک اعلےٰ ترین افسر کے طور پر اس نے اپنے عہد حکومت میں جو شاندار کارنامے سر انجام دیئے۔ ایک عرصہ دراز تک ان کی یاد باقی رہ جائے گی۔ مگر پھر بھی وُہ اس رو بزوال سلطنت کو اسکی یقینی موت سے کسی طرح نہیں بچا سکا۔ کیونکہ اب اس کا موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ڈاکٹر لوزر کے رقیب اور ہمعصر سکونرر نے اس صورت حال کو صاف اور غیر مبہم طریق پر دیکھا۔ کہ ڈاکٹر مذکور نے جس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس میں اگرچہ اسے خلاف توقع کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا وُہ انجام کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ جو ڈاکٹر لوزر کو مدنظر ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے سکونرر بھی اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو پورا نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کی کمزور و پُر خوف طبیعت نے اُسے بر موقع آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ اور اس طرح یہ دونوں ہی اپنے اپنے ارادوں میں ناکامیاب رہے۔ یعنی نہ تو ڈاکٹر لوزر ہی آسٹریا کو بچا سکا۔ اور نہ سکونرر ہی رو بزوال جرمن قوم کی مناسب طور حفاظت کر کے اسے عروج و عظمت کے راستے پر ڈال سکا۔

ان دونوں کی ناکامیابی کا مطالعہ ہمارے لئے بہت کچھ سبق آموز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آجکل بھی اکثر حالات بالکل ویسے ہی ہیں۔ اور ان پر غور کرنے پر وہ غلطیاں صاف طور پر ہماری نظروں کے سامنے برہنہ ہو کر آسکتی ہیں جنہوں نے سکونرر کی پین جرمن تحریک کو اور لوزر کی آسٹریا کو بچانے کے متعلق کوششوں

اور عقلمند رہنما اپنی تھوڑی سی ناسمجھی کے باعث اپنے اس پاک مقصد کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ کیونکہ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر جنگ و جدل کرنے والا ایک سورما بھی اگر کسی خاص اصول کی خاطر جنگ نہ کرے۔ تو اس کے لئے بھی کچھ عرصہ بعد اپنے مقصد کی خاطر اپنی جان بخوشی قربان کر دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ تو وہ عوام کی پوری پوری ہمدردی بھی کبھی حاصل نہیں کر سکتا۔

بالمقابل اس کے گرجا گھروں میں زیک پادریوں کے عمل دخل کو ترقی دیکر حکومت نے آسٹرین رعایا کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں اور بھی اچھی طرح جکڑ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے جرمن گرجا گھروں میں ہی انہیں داخل کیا گیا۔ اور وہاں گھستے ہی انہوں نے آہستہ آہستہ زیک قوم کا اثر عوام پر بڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح حکومت نے زیک مقاصد کی تکمیل اور جرمن قوم کے انتشار و کمزوری کی یہ ایک دوسری صورت پیدا کر دی۔ جس سے بیچارے جرمن پادری حکومت کی اس قابل مذمت کینہ پالیسی کی بدولت بھی بے دست و پا ہو گئے۔ اب ان کے لئے اوروں کے خلاف جنگ کرنا تو درکنار۔ اپنی حفاظت بھی مشکل ہو گئی۔ اور ان پر بھی طرح طرح کے مظالم ہونے لگے۔ اس طرح جرمن قوم آئے دن کی ان چھوٹی چھوٹی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی جھنجٹوں میں پھنس کر ایک طرف تو مذہبی میدان میں اور دوسری طرف سیاسی اکھاڑے میں اپنے سب داؤ پیچ بھول گئی۔ اور ترقی و عروج کا راستہ چھوڑ کر تنزل کی تاریک غار کی طرف آہستہ آہستہ دھکیلی جانے لگی۔

مگر جارج سکونرر بھی ان لوگوں میں نہ تھا۔ جو مشکلات سے گھبرا جاتے ہیں یا کسی کام کو نامکمل طور پر شروع کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے مذہبی میدان میں بھی مخالفوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اسے یہ پورا یقین

اپنی آواز بلند کرتے جاتے - جہانکہ ہزاروں آزاد خیال اور معقول پسند عوام مقررین کی تقریریں سننے اور ان کے خیالات پر غور و خوض کرنے کے لئے ہی جمع ہوتے ہیں لیکن پارلیمنٹ میں ایسا نہیں ہوتا - کیونکہ وہاں کی حاضری صرف چند سو تک ہی محدود رہتی ہے - اور ان میں بھی زیادہ تر مطلب پرست اور خود پرست ہوتے ہیں - اور جدھر اپنا فائدہ دیکھتے ہیں - بغیر سوچے سمجھے ادھر ہی لڑھک جاتے ہیں - یہی وجہ ہے - کہ اکثر اصول پرست لوگوں کو پارلیمنٹ میں شکست ہی کھانی پڑتی ہے - اسلئے ایسے لوگوں کے سامنے کچھ کہنا سننا بھینس کے سامنے بین بجانے کی نسبت کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتا -

اسی لئے پین جرمن تحریک کے نمائندے بھی آخر پارلیمنٹ میں بولتے بولتے تھک گئے - لیکن ان کے ہاتھ پلے کچھ نہ پڑا - اخبارات کا سلوک ان بیچاروں کے ساتھ اس سے بڑھ کر شرمناک تھا - اوّل تو وُہ ان کی تقریروں کی رپورٹ چھاپتے ہی نہ تھے - اگر شایع بھی کرتے تھے - تو بہت توڑ مروڑ کر بے ربط اور بے جوڑ فقروں کی شکل میں جنکا مطلب مُدعا سبھی مارا جاتا تھا - اور سر پیر کچھ بھی نہ بنتا تھا نتیجہ یہ ہُوا - کہ اس تحریک کے مقاصد کی طرف سے عوام کی رغبت پھر گئی اور اس طرح یہ اپنی موت آپ ہی مر گئی -

مگر پھر بھی میرا خیال ہے - کہ پین جرمن تحریک کامیاب ہو سکتی تھی - بشرطیکہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آجاتی - کہ یہ تحریک کوئی نئی پارٹی قائم کرنے کے لئے نہیں بلکہ ملک میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے جاری کی گئی ہے - اس کے آخر تک اپنا جنگ جاری رکھنے کے لئے صرف یہی ایک واحد طریقہ ہو سکتا تھا اور اس زبردست کشمکش میں ہی تمام اندرونی طاقتوں کو اسی طرح مصروف رکھا جا سکتا تھا - کہ وہ روز بروز طاقتور ہوتی جاتی - لیکن افسوس کہ اس کا بہادر

مذہب سے ہی کچھ تعلق تھا۔ اور نہ قومی یا سیاسی مفادات سے ہی۔ اگر آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ تو اس سے یہ اندازہ بھی بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ابھی تک آپ کو یہودی ربی یہودی گرجا کے متعلق کوئی خاص علم نہیں۔ اور آپ یہ جانتے ہیں کہ یہودی گرجا کے خیالات کسی قوم کے قومی مفادات کے متعلق کیسے ہیچ اور لوچ ہیں؟ اور نہ آپ اُن کا مقابلہ اس سلوک کے ساتھ ہی کر سکتے ہیں۔ جو متذکرہ بالا دونوں عیسائی جماعتوں کی طرف سے جرمن پادریوں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا؟ +

لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ تو ہمیشہ سے ہی ایسا سلوک ہوتا آیا ہے۔ اسی لئے ہمارے خیالات آہستہ آہستہ پختہ اور یقینی ہو گئے ہیں "شاہی اختیارات" "جمہوریت" "مسئلہ بین الاقوامیت" "مسئلہ سوشلسٹ مساوات وغیرہ وغیرہ سبھی مسائل آہستہ آہستہ اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آتے رہے ہیں۔ اور ان سب کے متعلق ہم نے اپنی رائے نہایت مکمل یقینی — بے لوث اور پختہ طور پر قائم کر لی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہر سوال پر اسی نقطہ خیال سے اپنی فیصلہ کن رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔ "ہمارا اصلاحی پروگرام" جہاں تک جرمن مفادات سے اس کا تعلق ہے۔ ہمیشہ یہ رہا ہے۔ کہ جرمنوں میں ان کی ذاتی پاکیزگی اور قوم پرستی کو ترقی دی جائے۔ ان کی قومی زبان اور قومی طریق زندگی کی حفاظت کی جائے۔ جرمن آزادی کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسائل کی طاقت و اہمیت میں اضافہ کرنے کے لئے ہمیشہ ان کی حفاظت کی جائے۔ اور جرمن قوم کی ملکی آزادی کے ساتھ تعلق رکھنے والے مسائل کی طاقت و اہمیت میں اضافہ کرنے کے لئے ہمیشہ کوشش جاری رکھی جائے۔ اس لئے ہم نے اس کے راستے میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کی کبھی بھی کچھ پرواہ نہ کر کے اپنے اس

تھا۔ کہ وُہ تنہا ہی جرمن قوم کی ہر پہلو سے حفاظت کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔
لیکن اگرچہ شروع شروع میں تو اُسے اپنی یہ مذہبی تحریک بڑی مضبوط اور زبردست معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس کے حملے کا طریقہ نہایت پُر زور اور سخت تھا۔ مگر بعد میں یہ بھی جلدی ٹھنڈی پڑ گئی۔ اور میرے خیال میں یہ بھی اچھا ہی ہُوا۔ کیونکہ اگر کہیں یہ تحریک کامیاب ہو جاتی۔ تو اس کا نتیجہ اور بھی زیادہ خراب بلکہ بے حد افسوس ناک ہوتا۔ یعنی جرمنی ہمیشہ کے لئے تباہ کن مذہبی اختلافات میں پھنس جاتا۔

اس میں شک نہیں۔ کہ جرمن پادریوں کے اختیارات زیک پادریوں کی نسبت بہت محدود تھے۔ ماسوا اس کے زیک پادریوں کا برتاؤ اپنے عوام کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اس لئے چرچ کے افسر بھی ان کی کارگزاری سے خوش تھے برعکس اس کے جرمن پادری صرف چرچ کی ہی خدمت جی جان سے کیا کرتے تھے۔ اور عوام کے ساتھ ان کا سلوک روکھا پھیکا تھا۔ اس لئے چرچ کے افسر بھی ان سے مطمئن نہ رہتے تھے۔

اس سلسلہ میں شاید۔ اس طریق عمل پر بھی کچھ غور کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ جو عوام کے قومی جذبات کو بیدار کرنیوالی کسی تحریک کے خلاف اختیار کئے جاتے ہیں۔ یہ سلوک آسٹرین حکومت کی طرف سے ہی کچھ مخصوص نہ تھا۔ ورنہ اس پر کچھ تعجب ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ تقریباً ہر جگہ کم وبیش ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور پانچ سال پہلے بھی ایسا ہی ہُوا تھا۔ اگرچہ یہ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ کہ ایسا کیوں کر ہُوا۔ یعنی یہ کوئی قدرتی عمل تھا۔ یا کسی خاص معرکہ خیز دماغ کی کوئی جدت!
اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا موجودہ زمانے میں جرمن اور آسٹرین دونوں قوموں کا رُخ یہودی کی طرف یکساں تھا؟ جس کا نہ

بطور انعام حاصل ہوئی۔ اسی کی بدولت اس نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ اور مذہبی فرقوں (چرچوں) کے خلاف اس کی کوششوں نے اس رہی سہی ہمدردی کو بھی اڑا دیا۔ جو عوام کو اس تحریک سے کچھ تھوڑی بہت باقی رہ گئی تھی۔ اس طرح وہ اپنے ان مددگاروں کی امداد سے بالکل ہی محروم ہو گئی۔ جن کے خیالات خالص طور پر سیاسی تھے۔ اور جو سیاسیات کو مذہب سے قطعاً بے تعلق دیکھنا پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ پین جرمن تحریک آسٹریا میں حقیقی طور پر بالکل کامیاب نہیں ہوئی۔ اور جن وجوہات کی بنا پر اس کا کرسچین سوشلسٹ تحریک سے اختلاف رہتا تھا۔ وہ بالکل صحیح اور دانش مندانہ طور پر حق بجانب تھیں +

کرسچین سوشلسٹ پارٹی کی جدوجہد کچھ کامیاب ضرور تھی لیکن اپنے نتیجے کے لحاظ سے وہ بھی فضول ہی ثابت ہوئی۔ اس میں عوام کی عظمت کا خیال ضرور تھا۔ اس نے اپنے آغاز سے ہی اغراض و مقاصد کو بھی نہایت اعلےٰ ثابت کر دکھایا تھا۔ اور اسی لئے عوام کو اپنی طرف کھینچ بھی لیا تھا۔ کیونکہ اس کی بنیاد بھی درمیانہ طبقہ پر ہی تھی۔ اس لئے اسے مزدوروں اور درمیانہ طبقہ کے ادنےٰ درجے سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ایثار نفسی کا مادہ پیدا کرنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔ نہ اس نے کسی مذہبی فرقے سے فضول کے لڑائی جھگڑے ہی کھڑے کئے۔ بلکہ اس پالیسی کو اپنے پاس تک بھی نہ پھٹکنے دیا۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ اسے ایک ایسے نظام کا سہارا مل گیا۔ جو چرچ کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ جس سے اس میں اپنے پیروؤں نیز عوام پر قدرتاً ایک روحانی اثر ڈالنے کی خصوصیت پیدا ہو گئی۔ لیکن آخر یہ پارٹی بھی اپنی کوششوں سے آسٹریا کو نہ بچا سکی +

پروگرام کو ملک و قوم کے لیئے مفید و منفعت بخش ثابت کیا ہے +

ہمارا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے۔ کہ سیاسی جماعتوں کا مقصد کسی صورت میں بھی مذہبی مسائل کے اندر دست اندازی نہ ہونا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا کرتی ہیں۔ تو اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ان کے قومی اور سیاسی اخلاق میں ایک گراوٹ پیدا ہو چکی ہے۔ اسی طرح مذہب کو بھی سیاسی رقابتوں اور ہار ئی بازیوں سے ہمیشہ بالاتر رہنا چاہیئے اور اپنے آپ کو خود غرضیوں اور مطلب پرستیوں سے پاک رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر مذہب (چرچ) کے ذمہ دار افسر و حکام اپنی مذہبی جماعتوں اور مذہبی اصولوں کو سیاسیات میں دخل دینے کی اجازت دیتے ہیں۔ تو وہ اپنے پیرؤں کی قوم پرستی و حب الوطنی کے ساتھ ایک ہلاکت آفریں سلوک روا رکھتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں ان کا گلا گھوٹنے کے جرم کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں جس سے انہیں ہر ایک فائدہ کی بجائے اُلٹا نقصان ہی پہنچتا ہے۔ کیونکہ مستقبل قریب میں ہی یہ عمل انکی تمام طاقت و رسوخ کے لیئے سخت تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہی سیاسی لیڈر کو بھی کسی حالت میں کسی مذہبی مسئلہ یا جماعت کے کاموں میں کوئی دست اندازی نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ وہ صحیح معنوں میں "سیاسی مدبر" نہ کہلا سکیگا۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ ایک "مذہبی ریفارمر" کا درجہ پائے گا"

اس کے خلاف کوئی بھی طریق عمل جرمنی میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور قومی اور ملکی مصائب کے وقت اس کی صحیح طور پر رہنمائی نہیں کر سکتا۔ پین جرمن تحریک کی ہود سکے ساتھ جو کشمکش رہی ہے۔ اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قومی و سیاسی معاملات میں اپنی محدود سی معلومات کے باعث اس نے عوام کی طاقت جنگ و جدل کا کبھی ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگایا۔ اور پارلیمنٹ میں داخل ہو کر اس نے اپنی تمام طاقت برباد کر دی۔ نیز وہاں سے جو کمزوری اُسے

سرب۔ کریٹ اور سب سے بڑھ کر موجودہ تہذیب کے جانی دشمن یہودی۔ ان سب کا یہ بڑھتا ہوا جمگھٹ دیکھ دیکھ کر میرا دم گھٹتا تھا۔ اور میرا دل ان سب کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات سے ابل ابل کر منہ کو آتا تھا +

ان سب باتوں کو دیکھ دیکھ کر آسٹرین حکومت کے لئے میرے دل میں کوئی محبت باقی رہنا قطعی ناممکن تھا۔ میرا دل ایک ایسی جمہوریت کا خیر مقدم کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ جو آسٹریا کی جرمن آسٹرین قوم کے پرمحبت اتحاد واتفاق کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو۔ اور میں جرمن قوم کی آزادی کے لئے تہ دل سے دعائیں مانگتا ہوا آسٹرین حکومت کی تباہی و بربادی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ اس لئے اس وقت میرا دل وہاں جانے کے لئے بے قرار ہو اٹھا۔ جہاں کی الفت ابتدائے شباب سے ہی میرے گوشۂ دل میں ایک لطیف خواہش کے طور پر پوشیدہ تھی۔

میں کبھی نہ کبھی دن ایک سربرآوردہ صناع ہونے کے خواب اکثر دیکھا کرتا تھا۔ لیکن آج میں اپنی زندگی قوم و ملک کی بہتری و بہبودی کے لئے قربان کرنے کو اپنی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھنے لگا۔ اور جس دن میری جنم بھومی کا تعلق میرے وطن سے ہو گا۔ اس دن کو اپنی زندگی کا سب سے زیادہ مبارک دن خیال کرنے لگا۔ کیونکہ یہی میرے دل کی ایک سب سے اہم اور شاندار آرزو تھی۔ جو ایک عرصہ دراز سے مجھے بے قرار رکھ رہی تھی +

اپنی محدود سی زندگی میں ویانا کے سیاسی حالات سے میں نے بہت سے اہم و مفید سبق حاصل کئے۔ اور اب تو میں زمانہ موجودہ کی سیاسی تعلیم کی سب قدر و قیمت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ اسی لئے اس زمانے کے حالات کو انہی تفصیل کے ساتھ یہاں قلمبند کرنے کی ضرورت مجھے محسوس ہوتی ہے +

چونکہ ان ایام کی پارٹی بازی اور جتھے بندی کے اصولوں کا میں نے نہایت

لیکن اس کے کام کرنے کے طریقے وقت کے لحاظ سے موزوں نہ تھے۔ اگرچہ وُہ ایک قومی تحریک تھی۔ لیکن افسوس یہی ہے۔ کہ عوام نے اسے مکمل طور پر ایک ملکی و قومی تحریک نہیں سمجھا۔ دوسری اقوام اور جماعتوں سے رقابت و مخالفت کا خیال جو وُہ تمام جرمن النسل لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتی تھی۔ وُہ اگرچہ مذہبی بنیادوں پر نہیں۔ بلکہ قومی اور ملکی پر ہی قائم کیا گیا تھا لیکن صرف ایک ہی فریق یا قوم کی بہتری کے لئے کھلم کھلا جنگ و جدل کرنا درحقیقت سیاسی نقطہ خیال سے ایک بہت بڑی بھول تھی +

اگرچہ جرمن قوم کے نئی زندگی حاصل کرنے کے متعلق کرسچین سوشلسٹ تحریک کے بانی مبانیوں کے خیالات بھی کچھ غیر مشتبہ نہ تھے۔ بلکہ بہت مشکوک تھے۔ مگر ایک پارٹی کی حیثیت سے ان کا رہنمائی کا طریقہ بہت اچھا تھا۔ اور انہوں نے ملکی و مجلسی سوالات کی اہمیت کو خوب سمجھا تھا۔ لیکن یہودیوں کے خلاف لڑائی نہ چھیڑنے میں انہوں نے بھی سخت غلطی کی۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ وُہ قوم پرستی کے تخیل کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے +

میں بذاتِ خود اس وقت سخت بے اطمینانی کے بحرِ ناپیدا کنار میں پھنسا ہوا غوطے کھا رہا تھا۔ جیسے جیسے میں سلطنت کے کھوکھلے پن کو دیکھتا اور سمجھتا گیا۔ ویسے ہی مجھے اس کی حفاظت ناممکن معلوم دینے لگی۔ اور آخرش مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اب تو اس کی ہستی صرف جرمنوں کی زندگی دبال جان بنانے کے لئے ہی باقی ہے۔ میرا یہ پختہ عقیدہ تھا۔ جو شخص بھی جرمنی کے اندر عروج اور نشو و نما میں رکاوٹ ڈالنا چاہے گا۔ اُسے ہی آسٹریا کے ظل عاطفت میں سہولیت سے جگہ مل سکے گی۔ اس لئے پایہ تخت آسٹریا کی مختلف اقوام اور مختلف نسلوں کے اس ان مل میل سے مجھے دلی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ زیک۔ پول۔ ہنگیرین۔ رتھینین۔

میونخ میں

(۴)

میں ۱۹۱۲ء کے موسم بہار میں میونخ پہنچا - جو ایک جرمن شہر ہے۔ مگر دیاتا سے بالکل مختلف بابل کی مانند یہاں کی مختلف قوموں کا خیال کر کے شروع شروع میں تو مجھے اپنا یہاں آنا بہت بُرا معلوم ہؤا - کیونکہ یہی حال یہاں کی زبانوں کا تھا۔ جو قریباً سب کی سب آپس میں بہت کچھ ملتی جلتی تھیں۔ لیکن میرے اس سفر نے ابتدائے جوانی کے اس سفر کی یاد کو ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا۔ جو مجھے یوپیا (دیاتا) کے لئے کرنا پڑا تھا۔ رفتہ رفتہ جلد ہی یہ شہر مجھے ہر طرح بہت پیارا معلوم دینے لگا۔ اتنا پیارا جتنا کہ شدید و نیا کا اور کوئی شہر معلوم نہ ہو۔ جسے کہ میں پردیس کا نام دے سکوں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میری آئندہ ترقی اور عروج کے ساتھ اس شہر کا خاص تعلق رہا ہے۔ بلکہ میری اور اس شہر کی ترقی کو شاید مادرِ قدرت نے ایک ہی رشتہ یگانگت سے وابستہ کر دیا ہے +

جرمنی اور آسٹریا کے بین الاقوامی اتحاد و اتفاق کے خواہش مندوں کے اس وقت دو فریق تھے۔ ایک تو آسٹریا کی ہیپسبرگ حکومت کا اور دوسرا جرمن حکومت کا۔ آسٹریا کی طرف تو اس کی حکومتی ضروریات کا دباؤ اور تعداد کی کثرت تھی۔ اور جرمنی کی طرف تھا بھولاپن اور سادگی۔ نیز سیاسی چالبازوں سے لاعلمی جو اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے اُسے قدم قدم پر باہمی اتحاد و اتفاق کی ضرورت

غور و خوض سے مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے میرے قیام ویانا کے یہ پانچ سال میری کشمکش میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اگر میں نے ان دنوں تقدیر کی رہنمائی سے ذاتی طور پر یہ تجربہ حاصل نہ کیا ہوتا۔ تو اس زمانے کی یہودیت مجلسی جمہوریت اور مارکس ازم وغیرہ مسائل کے متعلق آج میرے کیا خیالات ہوتے؟



تو عین ممکن تھا۔ کہ کوئی ایک جرمن بھی اس اتحاد میں شریک ہو کر رد ماکے پوپ اور ہیپسبرگ حکومت کی آسٹرین رعایا کے خلاف برسر جنگ ہونے کی ہرگز حمایت نہ کرتا۔ اور اگر کوئی اطالوی سپاہی آسٹریا میں بھیجتا۔ تو تمام اطالوی رعایا آگ ببولا ہو اٹھتی لیکن جب کوئی غیر طاقت دشمنی سے حکومت آسٹریا پر حملہ کرتی۔ تو اٹلی دل وجان سے آسٹریا کی مدد کو تیار رہتا۔ چنانچہ ویانا میں آسٹرین حکومت کے تاباں و درخشاں جاہ وجلال کے خلاف اطالوی حکومت کی حاسدانہ نفرت کو خود میں بھی کئی مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ کیونکہ اس اتحاد سے پہلے ہیپسبرگ حکومت نے اطالوی آزادی کے خلاف جو کھد باپ کئے تھے۔ انہیں اٹلی کبھی تا قیامت نہ بھول سکتا تھا۔ اور نہ امید ہے کہ آئندہ وہ کبھی بھلا سکے گا۔ اسی لئے اطالوی رعایا یا اطالوی حکومت دونوں میں سے کسی کے دل میں بھی آسٹریا کی شاہی حکومت کے لئے خاص محبت نہیں پائی جاتی تھی +

اس وقت تو اٹلی کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے۔ یا عزت صلح یا اعلان جنگ یا ان میں سے وہ بطور پالیسی کے پہلے راستے کو اختیار کر کے دوسرے کے لئے پوشیدہ طور پر اپنی رعایا کو تیار کر رہا تھا۔ برخلاف اس کے یہ جرمن اتحاد کی پالیسی نہایت فضول اور خطرناک تھی۔ کیونکہ روس سے آسٹریا کی دشمنی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ان دونوں کے درمیان جنگ اٹل معلوم ہوتی تھی جس میں پھنسنے کی جرمنی کو اس وقت کچھ بھی ضرورت نہ تھی +

پھر اچانک ہی یہ اتحاد کیسے ہو گیا؟ کیا صرف اس لئے کہ ملک کا مستقبل روشن رکھا جائے؟ مگر یہ تو اپنی ذاتی طاقت سے بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جرمنی کی آبادی ہر سال نو لاکھ کی تیز رفتار سے بڑھ رہی تھی۔ تو پھر کیا نو آبادیوں اور ترقی تجارت کے نقطہ خیال سے یہ اتحاد ہوا؟ ان دو نو مسائل کے ہر پہلو بھی پوری پوری بحث کی

محسوس کرا رہا تھا۔ یہ بھولا پن اور سادگی اس لئے کہ کسی نہ کسی طرح یہ خیال جرمن حکومت کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ کہ بس اتحاد ثلاثہ یعنی آسٹریا۔ جرمنی۔ اٹلی کے اتحاد و اتفاق کی بدولت ہی وہ جرمنی کی حفاظت کر کے اور اسے دنیا میں مضبوط و طاقتور بنا کر اس کی کچھ خدمت کر سکے گی اور سیاسی چالبازوں سے لاعلمی" اس لئے کہ وُہ محض خیالی اصولوں کی فضا میں اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ اور یہ تک بھی نہ جانتی تھی۔ کہ اس اتحاد ثلثہ کے جال میں پھنسا کر وُہ جرمنی کو آسٹرین حکومت کی مردہ اور بے جان لاش کے ساتھ جکڑ رہی ہے۔ جس سے اس کا بھی تنزل لازمی ہے۔

بہرحال ان دونو حکومتوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کا یہ خیال" پین جرمن" تحریک کو بیجان اور کمزور کرنے میں بہت بڑا مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ ادھر تو ہیپسبرگ حکومت کے نام لیواؤں کا یہ خیال تھا۔ کہ اگر حکومت جرمنی سے کوئی برائے نام نمائیشی اتحاد بھی ہو جائے گا۔ تو جرمن آسٹرینوں کو تباہی کے متعلق ہمارے کام میں کوئی رخنہ اندازی نہ ہو سکے گی۔ اور ان کا یہ خیال تھا بھی صحیح۔ کیونکہ اس پالیسی سے وُہ نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی خوف و خطر کے اپنی تمام سلطنت میں جرمنوں کو مرعوب کر کے اپنے قابو میں رکھ سکتے تھے۔ اور اس پہلو میں انہیں اپنی کسی بھی دست درازی یا سخت گیری کے خلاف جرمن حکومت سے کسی مخالفانہ کاروائی کا کوئی اندیشہ نہ رہ سکتا تھا۔ اس لئے آسٹرین جرمنوں کے خلاف وُہ روز بروز بد سے بدتر سلوک روا رکھ سکتے تھے۔ دوسری طرف پہلے جب کبھی بھی حکومت جرمنی کے خوشامدیوں کو حکومت کی طرف سے کوئی خاص سہولت عطا کی جاتی تھی۔ تبھی جرمن عوام بگڑ اٹھتے تھے۔ مگر اب اس اتحاد کی دہائی مچا کر انہیں بھی خاموش کر دیا جا سکتا تھا۔

لیکن اگر جرمنی میں تاریخی واقفیت اور سیاسی اصولوں کا کچھ بھی چرچا ہوتا

اور برطانیہ کے حقیقی تعلقات کا رجحان اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر انگلستان اپنی زبان اور تہذیب کے خیال سے امریکہ کا دوست بنا ہوا ہے تو اس کی مثال کسی بھی دوسرے یوروپین ملک میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے جرمنی کی حصول علاقہ اور نوآبادیوں کے متعلق پالیسی یورپ میں ہی دوسرے علاقوں کو اپنے قابو میں لانے سے بہت مضبوط اور کامیاب ہوسکتی تھی۔ بمقابلہ ایسی نوآبادیوں کے جہاں یوروپین لوگوں کو رہنے میں مشکلات کا سامنا ہو۔ اور اس لئے جو فضول تکلیف دہ ہی ثابت ہو رہی ہیں +

ماسوا اس کے " انیسویں صدی میں ایسے مقامات پر پُرامن طریقوں سے قبضہ حاصل کرنا بھی ناممکن تھا۔ لہٰذا نوآبادیوں کے متعلق کسی ایسی پالیسی کا بغیر جنگ وجدل کامیاب ہونا بھی قطعی ناممکن تھا۔ اسی لئے یہاں اس پالیسی کا اگر کوئی حمایتی تھا۔ تو صرف برطانیہ وہی جرمنی کی حدود کو وسعت دینے کے متعلق ہمارے سب خوف خطر کو دور کرسکتا تھا۔ اور اس پالیسی پر عمل کرنے کا ہمیں بھی اتنا ہی اختیار تھا۔ جتنا کہ ہمارے بزرگوں کو۔ پھر انگلستان سے دوستی قائم کرنے کے لئے کسی بڑی قربانی کی ضرورت بھی تو نہ تھی۔ صرف اپنی نوآبادیوں اور بحری عظمت نیز برطانوی مصنوعات کے مقابلے و رقابت کا خیال ترک کرنے سے ہی یہ مدعا بہ آسانی حاصل ہو سکتا تھا۔ اور اس کے مقابلے و رقابت کا میدان باقی تمام دنیا میں ہمارے لئے بہت کافی وسیع تھا۔

ایک وقت وُہ بھی تھا۔ جب برطانیہ خود ہی اس بارے میں جرمنی کی تمام تجاویز سننے کے لئے بے قرار تھا۔ کیونکہ وُہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کہ اپنی روز افزوں آبادی کے باعث جرمنی کو کسی نہ کسی سہولت کی سخت ضرورت ہے۔ اور یورپین علاقوں پر قبضہ جمانے میں اسکی مدد نہایت آسانی سے کیجا سکتی ہے۔ ورنہ اپنی ضروریات پوری

گئی۔ اور آخر یورپ کی وقتی صورت حال کو پیش نظر رکھکر جنگ کا ہی فیصلہ کیا تھا۔ حالانکہ صلح کا راستہ بھی بہت کچھ کامیاب ثابت ہو سکتا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں۔ کہ جرمنی کی روزافزوں آبادی کے لئے نئے نئے خطۂ ہائے ملک کی ضرورت تھی۔ اور انکا حصول اس کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ یہ تبھی ممکن تھا۔ جب موجودہ صورت حال کو نظر انداز کر کے صرف مستقبل کو ہی پیش نظر رکھا جاتا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے اگر اس پہلو میں اپنی پالیسی کو کیمورن جیسے دور دراز مقامات تک نہ پھیلا کر صرف یورپ میں ہی محدود رکھا جاتا۔ تو کامیابی کی بہت کچھ امید ہو سکتی تھی۔ گو اپنی ہستی کے لئے لڑنے بھڑنے کا خیال بھی محض قدرتی ہے اور اس کے لئے ہم جرمن پارلیمنٹ "رلیش" کے ممنون تھے۔ کہ وہ اب بھی ہمیں اپنی ہستی قائم رکھنے کی تلقین کرتی رہتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ آج ہماری بین الاقوامی حالت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے +

یہ طریقہ کیوں مناسب تھا۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ کئی یورپین ممالک آج بھی پہلے کی مانند اپنی پر امن پالیسی پر قائم ہیں۔ ان کے یوروپین حقوق و اختیارات کا مقابلہ اگر ان کی نو آبادیوں کے بار اور ان کی غیر ملکی تجارت کے ساتھ کیا جائے۔ تو یہ بالکل ایک مذاق سا معلوم ہو گا۔ اس کی حمایت میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ یورپ کا مقصد دنیا بھر پر اپنا قبضہ اقتدار قائم کرنا ہے۔ مگر امریکہ کی پالیسی صریحاً اس کے خلاف ہے۔ اسکا مدعا تو اپنی ہی وسیع حدود کے اندر نئے نئے علاقے آباد کرنا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنی اندرونی طاقت کو مضبوط کرتا جا رہا ہے لیکن اس کے مقابلے میں یوروپین اقوام و ممالک اپنی طاقتوں کو برابر کمزور کرنے میں مصروف ہیں +

انگلستان کا طریق عمل بھی اس کے خلاف نہیں لیکن ہم اینگلو سیکسن ممالک

فیصلہ کرلیا۔ اور حکومت جرمنی کو آسٹریا کے غنچال میں پھنسنے سے نہیں بچایا۔ انہوں نے شاید یہ سوچا۔ کہ اس طرح ہم پُرامن ذرائع سے دنیا پر اقتصادی فتح حاصل کر لیں گے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی طاقت کی پالیسی کو جس پر اسوقت تک عمل ہو رہا تھا۔ صرف بالائے طاق ہی نہیں رکھدیا۔ بلکہ ایک طرح اس کا خاتمہ ہی کر دیا۔

اس سے پہلے کبھی کبھی برطانیہ کی بندر بھبکیاں سن سن کر جرمن مدبروں کو اپنے مقاصد میں رکاوٹ پڑتی ہوئی دکھائی دیا کرتی تھی۔ اور انہیں اپنی کامیابی مشتبہ نظر آنے لگتی تھی۔ اسی لئے انہوں نے اپنا بحری بیڑا تیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مگر اس سے انکا یہ مقصد ہرگز نہ تھا۔ کہ اس کے رعب و داب سے دنیا پر امن اقتصادی فتح حاصل کرنے اور عالمگیر امن وامان کے قیام کے متعلق اپنے دل پسند خواب کو کسی طرح پورا کیا جائے ۔

لیکن پُرامن دنیا پر اقتصادی فتح حاصل کرنے کی ڈینگیں مارنا اور اُسے اپنی ملکی پالیسی ظاہر کرنا۔ پھر ساتھ ہی اس کے یہ کہنے میں بھی کچھ پس وپیش نہ کرنا۔ کہ برطانیہ بھی اپنی پالیسی کو اسی طرح عملی جامہ پہنا رہا ہے" جرمن مدبروں کی ایک بہت حماقت و بیوقوفی تھی۔ جس کی ذمہ داری ہمارے پروفیسر صاحبان کے اس طریق علم پر تھی جس کی پیروی میں انہوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا اور کرایا تھا۔ اس سے یہ ایک عجیب راز معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم میں سے اکثر حضرات تاریخ بغیر اچھی طرح سمجھے بوجھے پڑھا اور پڑھایا کرتے ہیں۔ اس لئے اس طریق تعلیم کی جتنی بھی جلد کایا پلٹ ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے ۔

برطانیہ میں بھی انہیں اس اصول کی تردید صاف طور پر دکھائی دے سکتی ہے۔ کیونکہ یہ کبھی اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ کہ کسی قوم یا ملک نے بغیر تلوار کی طاقت کے دنیا پر اقتصادی فتح حاصل کی ہو۔ یا کبھی دوسری قوم نے اپنا یہ مقصد

کرنے کے لئے دنیا کے دوسرے حصوں پر وُہ بغیر برطانیہ کی مدد کے ہی اپنا قبضہ جمائے گا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر میں جرمنی کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنیکا کچھ چرچا بھی لندن میں چھڑا تھا جس سے اس بارے میں برطانیہ کے خیالات کا بہ آسانی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس وقت یہ خبر ملتے ہی جرمنی میں سخت ہل چل مچ گئی۔ اور جرمن مدبروں کو انگلستان کی دوستی میں کچھ بھی فائدہ نظر نہ آیا بر خلاف اسکے وہ یہ سمجھے۔ کہ شاید فریقین کے حقوق و فرائض کا تصفیہ کئے بغیر ہی یہ اتحاد پکا ہو جائیگا۔ اگر اس وقت یہ غلطی نہ کی جاتی۔ تو برطانیہ کی دوستی اور اتحاد کی بدولت کسی اور طاقت کی کچھ پرواہ کئے بغیر ہی ہم بلا غل وغش اپنا کاروبار بدستور جاری رکھ سکتے تھے۔ کیونکہ برطانوی مدبر یہ اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ بغیر باہمی لین دین کی سپرٹ کے دنیا میں کسی کو بھی کبھی کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا +

لیکن ادھر جرمنی نے اپنی خارجہ پالیسی میں نہایت ہی غیر ضروری شک و شبہ سے کام لیا۔ ویسا ہی جاپان نے بھی ۱۹۰۲ء میں کیا تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا۔ تو اس کا انجام کیا ہو سکتا تھا؟ اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔ کہ شاید گذشتہ عالمگیر جنگ کا قیامت خیز نظارہ دنیا کو ہرگز نظر نہ آتا لیکن افسوس کہ اس وقت وُہ راستہ اختیار نہ کیا گیا۔ اور ہماری ملکی صنعت و حرفت۔ عالمگیر قومی تجارت نیز بحری طاقت اور نو آبادیوں کی تمام ضروریات پہلے کی مانند اب تک بدستور قائم ہیں +

مگر اس وقت جہاں ایک طرف اسکے خلاف برطانیہ کیساتھ اتحاد کرنے سے یورپ میں مقبوضات حاصل کرنیکے متعلق ہماری پالیسی ہر طرح کامیاب ہو سکتی تھی۔ وہاں دوسری طرف روس کے ساتھ برطانیہ کے خلاف اتحاد قائم کر کے بھی ہم اپنی نو آبادیوں اور عالمگیر تجارت کی پالیسی کو بہ آسانی کامیاب ثابت کر سکتے تھے۔ لیکن افسوس کہ اس وقت جرمن مدبروں نے بغیر کسی دانشمندی و دوراندیشی کے ہی اپنے فرض کا

کے لیے نہایت مہلک طور پر نقصان دہ ثابت ہُوا +

کیونکہ اس طرح ہم نے انگریزوں کو پہچاننے میں ایک سخت خوفناک غلطی کھائی جس سے ہر شخص یہی سمجھنے لگا۔ کہ ہر انگریز ایک بدمعاش۔ بزدل اور ناقابل اعتبار سوداگر ہے۔ مگر افسوس کہ ہمیں یہ جھوٹے اور بے بنیاد سبق سکھانے والے استاد یہ نہ سمجھ سکے۔ کہ برطانوی سلطنت کیسے قائم ہوئی ؟ مجھے تو برطانیہ کے سوا کوئی قوم بھی ایسی نظر نہیں آتی۔ جو ضروریات زمانہ کے مطابق طریقوں سے کام لے کر اپنی ایسی وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ثابت ہو سکے۔ مگر جن دور اندیش شخصوں نے جرمنی میں اپنے ہموطنوں کو اس متذکرہ بالا غلطی اور غلط فہمی سے بچانے کی کوشش بھی کی۔ ان کی کسی نے ایک نہ سنی بلکہ اُلٹا انہیں مطعون کرتے رہے +

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ میرے ایک فوجی دوست کو فلینڈر کے میدانِ جنگ میں انگریز سپاہیوں کے ساتھ دست بدست لڑائی کرتے سے کیسی حیرت ہوئی ! اور کس طرح اسے پہلے ہی دن یہ پتہ لگ گیا۔ کہ انگریز سپاہی کتنے بہادر اور جانباز ہوتے ہیں ! اس وقت سے ہی کیا بھی جرمن جنگ آزماؤں پر اپنے اخبارات و مطابع کی عام غلط بیانیوں کی قدر و قیمت اچھی طرح روشن ہو گئی +

یہ سب پوست کندہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد جب میں نے پرچار اور تبلیغ کے عجیب و غریب طریقوں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ تو مجھے معلوم ہوا۔ کہ ان بعید از صداقت باتوں کا پرچار کرنے والوں نے طرح طرح کی نظیروں اور مثالوں سے لوگوں کے یہ ذہن نشین کرا دیا تھا۔ کہ پُرامن طریق سے دنیا پر اقتصادی فتح حاصل کرنے کا خیال سراسر حقیقت پر مبنی ہے۔ مگر ان کا یہ بیان قطعاً غلط و بے معنی تھا۔ اگرچہ اس کے پرچار کا طریقہ ضرور قابلِ تعریف کہا جا سکتا ہے۔ جس سے وہ اپنے ہر ایک جھوٹ کو حرف بہ حرف صحیح ثابت کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ جس میدان میں انگریزوں کو

حاصل کرنے میں برطانیہ سے کم بیرحمی اور بیدردی کا اظہار کیا ہو۔ بظاہر کسی خاص
سیاسی طاقت کے بغیر غیروں سے کوئی اقتصادی فائدہ حاصل کر لینا۔ اور اس طرح
حاصل شدہ فائدہ کو جلد ہی سیاسی طاقت سے بھرپور کر دکھانا بھی کیا برطانوی طریق
حکومت کی دانشمندی کی دلیل نہیں؟ اس لئے یہ مان لینا بھی کہ انگلستان اپنی اقتصادی
پالیسی کی حفاظت میں کبھی کسیطرح بزدل اور ڈرپوک ثابت ہوگا۔ ایک نہایت ہی
خوفناک غلطی ہے۔ علاوہ اسکے اگر یہ کہا جائے۔ کہ برطانیہ کے پاس کوئی قومی فوج نہیں
تو یہ بھی ٹھیک ہوگا۔ کیونکہ اسکی قومی فوج کا رنگ روپ بظاہر جنگی نہیں۔ لیکن
بروقت ضرورت وہ فوراً سے پیشتر جنگی بن سکتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ہر قومی ضرورت
کے لئے ہمیشہ اور ہر طرح گولہ بارود سے لیس رہتا ہے۔ اسے جہاں جیسے ہتھیاروں
سے کامیابی ملنے کی امید ہوتی ہے۔ وہ وہاں ویسے ہی ہتھیار استعمال کرتا ہے۔
مثلاً جہاں لالچ دکھلانے سے فتح ہو سکتی ہے۔ وہاں اسکی چال بھی وہی ہوتی ہے۔
اور جہاں خون بہانے سے فتح کا امکان نظر آتا ہے۔ وہاں تمام قوم کی قوم اپنے
خون کی ندیاں بہا کر بھی اپنی عزت و عظمت کی حفاظت کرنے میں دریغ نہیں کرتی
اسی لئے یہ کہنا ہی پڑتا ہے۔ کہ برطانیہ کی فوجی پالیسی نہایت مکمل۔ بیحد مضبوط۔
اور کامل طور پر بے خوفانہ ہے +

مگر جرمنی میں سکولوں۔ کالجوں۔ اخبارات و مطابع کے ذریعہ برطانوی طریق
زندگی کے متعلق بہت سے غلط و بے بنیاد خیالات پیدا کر دیئے گئے۔ یہ ہماری ایک
ایسی دھوکہ بازی اور حیلسازی تھی۔ جو ہم نے خود اپنے ہی ساتھ روا رکھی۔ لیکن ہماری
یہ تمام کاروائی بالکل غلط اور سراسر ناپاک خیالات سے بھرپور تھی۔ جس سے آہستہ
آہستہ ملک بھر میں ہر طرف غلط اور ناقص فضا پیدا ہو گئی۔ یعنی جرمن انگریزوں
کو بالکل ہی ہیچ اور ناکارہ سمجھنے لگے۔ مگر عملی تجربہ ہونے پر اس خام خیالی کا نتیجہ جرمنی

رُخ بدل کر جرمنی کی طرف ہو گیا +

اس وقت بھی میرا یہ پختہ عقیدہ ہے۔ کہ جرمنی نے روبنعال آسٹرین حکومت کے ساتھ ایک فضول اتحاد کیا ہے۔ اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے سے پہلے ہی جرمنی کو ضرور کسی نہ کسی عجیب جھنجھٹ میں پھنسنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے ان خیالات کو اپنے ساتھیوں سے بھی نہیں چھپایا۔ بلکہ کھلے الفاظ میں یہ پیشگوئی کر دی تھی۔ عالمگیر جنگ کے ایام میں بھی جبکہ حقیقت کا اظہار ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ میرے یہ خیالات چٹان کی طرح مضبوط رہے۔ اور میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی کسی غیر متوقع یا ناممکن واقع کی امید میں پریشان نہیں ہوا۔ میری رائے میں اب وہ وقت آ گیا تھا۔ جبکہ حقیقت کے متلاشی میری باتوں کو معقول اور فائدہ مند ماننے کیلئے تیار تھے۔ چنانچہ جب کبھی اس سوال پر میرے سامنے کوئی بحث چھڑتی تھی۔ تبھی میں یہ کہہ دیا کرتا تھا۔ کہ جتنی بھی جلد اس غلط اتحاد کا خاتمہ ہو جائے۔ اتنا ہی جرمنی کی ترقی و عروج کے لئے اچھا ہے۔ کیونکہ آسٹریا کے لئے کوئی قربانی جرمنی کے لئے مفید نہیں ہو سکتی۔ اس وقت جرمنی کی سب ہوا خواہ جماعتیں صرف جرمنی کے لئے قربانیاں کر رہی تھیں آسٹریا کے لئے نہیں +

جنگ سے پہلے بھی میرے دل میں یہ بات کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ کہ جس اتحاد ناتمام کی پیروی کی جا رہی ہے۔ وہ کسی طرح بھی مناسب و مفید نہیں۔ اکثر اعتدال پسند کمزور دل مدبر اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مگر ہماری سچی۔ پُر زور اور مضبوط بنیادوں پر قائم دلیلوں کے سامنے انکی دال نہ گلتی تھی۔ اور عوام ان کی باتوں پر توجہ نہ دیتے تھے۔ مگر انہیں یہی خیال تھا۔ کہ وہ فتح عالم کے راستے پر بڑی تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں۔ اور بہت جلد انہیں بغیر کسی قربانی و ایثار کے ہی شاندار کامیابی حاصل ہو جائے گی +

کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ وہاں ہم بھی ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ انگریزوں کی مکر و چالبازی اور مکر و فریب کا ذکر کر کے وہ یہ کہا کرتے تھے۔ کہ ہم انکے برعکس چھوٹی چھوٹی قوموں کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو کر آہستہ آہستہ سب کی یکجائی طاقت کو ایک نہایت وسیع اور شاندار صورت دے سکیں گے +

روحانی نقطہ خیال سے بھی اتحاد ثلاثہ کی کچھ عظمت نہیں تھی۔ کیونکہ جیسے جیسے کسی اتحاد کی وسعت محدود رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ویسے ہی اس کی اندرونی طاقت زائل ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر اتحاد کرنے والی طاقتوں کو اس اتحاد سے دنیا کو کوئی حقیقی فائدہ پہنچانے کی امید ہوتی ہے۔ تو وہ اتحاد اور بھی زیادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اسلئے مختلف موقعوں پر اس اتحاد ثلاثہ کو وسعت دینے کی ضرورت محسوس کی گئی لیکن بدقسمتی سے ارباب حکومت نے ادھر کافی توجہ ہی نہ دی۔ ۱۹۱۲ء میں کرنل لینڈڈرف نے ایک بیان شایع کر کے انہیں اس کمزوری کی طرف توجہ بھی دلائی۔ لیکن ذمہ دار افسران حکومت نے اپنی خصلت و عادت کے مطابق اس خیال کی عظمت و اہمیت کو پھر نظرانداز کر دیا۔ اور اس کی طرف پہلے جیسی ہی لاپروائی کا اظہار کرتے رہے +

۱۹۱۴ء میں آسٹریا کی بدولت عالمگیر جنگ کا آغاز بھی قسمت کا ہی ایک کھیل تھا۔ چنانچہ ہیپسبرگ حکومت کو قسمت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس میں پھنسنا پڑا تھا۔ ورنہ اگر کسی اور باعث سے یہ جنگ چھڑا ہوتا۔ تو شاید جرمنی ہرگز اس میں شریک نہ ہوتا۔ اسلئے آسٹریا سے اپنے دوستانہ تعلق نبھانے کی خاطر اس موقع پر جرمنی کو اپنی تمام اعلےٰ خواہشوں اور آرزوؤں کو دبانا پڑا۔ جنہیں کہ اس اتحاد و اتفاق سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عہد کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت اٹلی میں جرمنی کے خلاف خیالات کی لہر زوروں پر تھی۔ اور ہر ایک اطالوی نہ صرف جرمنی کو نیچا دکھلانا چاہتا تھا۔ بلکہ حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ درحقیقت ان کی یہ سب مخالفت ابتداً آسٹرینوں کے خلاف تھی۔ مگر بعد میں اسکا

اگر نگاہِ غور سے دیکھا جائے۔ تو زمانہ قدیم میں وسعت و فراخی کے لحاظ سے یہودی قوم کی کوئی حدبندی نہ تھی۔ اس لئے اسے لامحدود کہا جا سکتا تھا۔ لیکن خاندان اور نسل کے خیال سے وُہ محدود ضرور تھی۔ لہٰذا وُہ اپنی لامحدودیت کے باوجود بھی ایک محدود قوم کی مانند تھی۔ اور اس کی چالبازی کے مختلف طریقوں میں سے یہ بھی ایک طریقہ تھا جس کا انکشاف قوم پر مذہب کی مہر لگا دیئے جانے سے ہوتا تھا برخلاف اس کے آریہ لوگ ایسی قوموں سے ہمیشہ نفرت کرتے تھے جن کی بنیاد محض مذہبی خیالات پر ہو۔ موسٰے کا مذہب یہودی قوم کی حفاظت کے لئے ایک اصول کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے اگرچہ وُہ مجلسی سیاسی و اقتصادی مسائل میں ہر طرح کے علمی اصولوں کا خیر مقدم کیا کرتی تھی۔ مگر پھر بھی اس کی مذہبی تنگ خیالی کے باعث اس کے دعووں کی صداقت پر دنیا میں ہمیشہ ہی شک و شبہ کیا جاتا تھا۔

جس وقت جرمنی میں یہ سیاسی فضا آہستہ آہستہ ترقی و وسعت اختیار کر رہی تھی اس وقت اُسکے تجارتی کاروبار کی شان بھی لاثانی و بےنظیر تھی۔ لیکن جب یہ تجارت و کاروبار ہی اس کی زندگی کا ایک واحد مقصد بن گیا۔ تب سے اس کی سب قومی طاقت منتشر ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تجارت کا بھی زوال شروع ہو گیا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ قومی ترقی ونشوونما بند ہو گئی۔ اور وُہ اپنا ایک سب سے بڑا اور سب سے نرالا وصف زائل کر بیٹھی۔

اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے۔ کہ کسی قوم کو پیدا کرنے والی طاقتیں کیا کیا ہیں؟ تو میں اس کا یہی جواب دونگا۔ کہ اس میں مسلسل قربانی و ایثار نفسی کی لگن اور قابلیت ہونی چاہیئے۔ بس یہی دو اوصاف اسکی پیدائش۔ نشوونما اور آیندہ ترقی و عروج کے لئے بہت کافی ہیں۔ اور یہ صاف ہی ظاہر ہے۔ کہ ان اوصاف کا کسی اقتصادی مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی معمولی سی عقل سے مناسب طور پر کام لے کر ہم یہ بہت اچھی طرح

پھر جس وقت یہ نرم دل مدبر لاعلم و جاہل عوام کو مشہور روایتی ہیملین کی مانند جو چوہے پکڑا کرتا تھا۔ اپنے ساتھ لئے تباہی کے راستے پر چڑھے چلے جا رہے تھے تب بھی عوام کے لیڈروں نے ان کی نہایت زبردست مخالفت کی۔ مگر سائنٹیفک جرمن ایجادات کے گھمنڈ۔ جرمن صنعت و حرفت کی تیز گامی اور جرمن تجارت کی لامحدود ترقی کی دھن نے ان کے دل سے اس حقیقت کو بالکل ہی بھلا دیا۔ کہ ایک طاقت ور قوم کا تخیل ہی سب کچھ کر سکتا ہے۔ اور اس کی بدولت اس میں ایک ایسی ناقابل تسخیر قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کا دنیا میں کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے خلاف ان میں سے اکثر نے ملک میں اس غلط خیال کو پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ کہ جرمن قوم کی ترقی کی وجہ سے ہی زندگی کی یہ سب چہل پہل نظر آ رہی ہے۔ گویا کہ جرمن قوم صرف ایک اقتصادی سنستھا تھی۔ اس سے اُسے محض اقتصادی نقطہ خیال کو اپنے سامنے رکھ کر اقتصادی اصولوں کی پیروی میں چلانا چاہیئے تھا۔ تاکہ اس کا سب انحصار تجارت و کاروبار پر ہی رہے کیونکہ انکی رائے میں یہی ایک طریقہ جرمنی کی قومی خصلت اور زمانے کی موجودہ ضرورت کے عین مطابق تھا +

مگر میرا یہ خیال تھا۔ کہ قوم کو کسی بھی فیصلہ شدہ اقتصادی اصول۔ خیال یا ترقی کا غلام بنانا نہیں۔ کیونکہ کوئی قوم محض کاروبار کرنے والوں کی ہی ایک ٹھوس جماعت نہیں ہوتی۔ اور نہ اپنے اقتصادی مقاصد کے لئے ہی اس کے خیالات اور امیدیں محدود رہ سکتی ہیں۔ بلکہ یہ ایک وسیع نظام ہوتا ہے۔ جسمیں قدرتی عادات و خصائل مشابہت و یک جہتی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اور قدرت خود ہی اُسکی پیدائش۔ نشوونما اور ترقی میں مددگار ہو کر اس کی قسمت اور اس کے مستقبل کا فیصلہ کرتی رہتی ہے۔ کسی قوم کا اس کے سوا اس سے بہتر اور برتر بلکہ اس سے زیادہ عظیم الشان و شاندار اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا +

طور پر تھے۔ جو ایک قوم کی پیدائش اور عروج میں معاون ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس! صد افسوس! اس دور کی چند اندرونی خرابیوں کے باعث کوئی بڑا اور شاندار کام کرنے کے متعلق جرمن قوم کی قوت ارادی اور اس کی پختگی و مضبوطی ماری گئی۔ اس لئے قانونِ قدرت کے مطابق اس کام کا نتیجہ وہ عالمگیر جنگ ہوا۔ جس نے جرمن لوگوں کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے کھول دیں +

میں نے پھر ایک مرتبہ ان سوالات پر پہلے کی مانند غور و خوض کیا۔ اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک کے درمیانی عرصہ میں میں نے جرمنی کے اتحاد و اتفاق تجارتی ترقی اور صنعت و حرفت کی توسیع کے متعلق پالیسی کی خوب جانچ پڑتال کر کے اس پہیلی کو حل کرنے کی از سر نو کوشش کی۔ جو ایک عرصہ دراز سے میرے سامنے آ آ کر مجھے پریشان کر رہی تھی لیکن اس مرتبہ اس کے حل کا طریقہ جو میں نے اختیار کیا۔ وہ ویانا کے اس پرانے طریقے سے بالکل مختلف تھا۔ جس کی ویانا میں پیروی کیا کرتا تھا۔ یعنی اس مرتبہ میں نے مارکس ازم کے اصولوں اور ان کے بین الاقوامی عمل سے انہیں بالکل مدد نہیں لی +

سب سے پہلے میں نے یہ سوچا۔ کہ سوشلزم کے عالمگیر وبائی مرض کو کس طرح قابو میں کیا جائے۔ اس غرض سے میں نے بسمارک کے وضع کردہ خاص قوانین کے مقاصد و مقاصد اور ان کی کامیابی و ناکامی کا گہرا مطالعہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اپنے متذکرہ بالا اصولوں کی صداقت پر میرا اعتقاد ایک چٹان کی طرح مضبوط ہو گیا۔ اسی زمانے سے میں ان کے پرچار میں لگ گیا۔ اور اب تک بھی مجھے ان میں سے کسی میں کسی طرح سے بھی کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

بعد ازاں میں نے یہودیت اور مارکس ازم کے باہمی تعلقات پر نہایت سنجیدگی سے ساتھ غور کر کے یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ جرمن قوم کے مستقبل کا انحصار نام نہاد مارکس ازم کے خاتمے پر ہی ہے اسی وقت سے یعنی ۱۹۱۳ء سے ہی میں نے اپنے ان پختہ عقائد کا ان مختلف

سمجھ سکتے ہیں۔ کہ کوئی بھی انسان محض کاروبار اور تجارت کے لئے کوئی حقیقی قربانی نہیں کر سکتا۔ کوئی شخص صرف بیوپار کے پیچھے اپنی جان نہیں کھوتا۔ لیکن اپنے آدرش کے لئے اپنے معراجِ تخیل کے لئے سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے۔ کہ ایک انگریز جس آدرش کو بھی اپنے سامنے رکھ لیتا ہے۔ اس میں اس کی سلطانی عظمت کو پوری پوری جھلک دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ہم صرف اپنی روٹی کے لئے لڑتے ہیں اور انگلستان آزادی کے لئے صرف اپنی ہی نہیں۔ بلکہ اور بھی چھوٹی چھوٹی قوموں کی آزادی کے لئے اسی لئے جرمنی کے سب اصلاح پسند باشندے جرمن حکومت کے اس شرمناک کمینہ پن سے بے طرح متنفر ہو کر غضبناک ہو گئے۔ اور انہوں نے آخر یہ ثابت کر دکھایا کہ عالمگیر جنگ سے پہلے جرمن حکومت کی عقل کیسی ماری گئی تھی۔ اور وہ اپنی دور اندیشی و دانشمندی کو کس طرح کھو بیٹھی تھی۔ جس سے ان قدرتی طاقتوں کے سمجھنے بوجھنے کی طاقت اس میں ذرہ بھر بھی نہیں رہی تھی۔ جو کسی انسان کو کمال آزادی سے ہمیشہ اس کے راستے کی طرف بڑھے جانے کی ترغیب دیتی رہتی ہیں۔ اور اسی راستے پر ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتی ہیں +

سنہ ۱۹۱۴ء کے گذشتہ عالمگیر جنگ میں جب تک جرمنوں کا یہ خیال رہا۔ کہ ہم اپنے مقصد اور آدرش کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ تب تک وہ غیر مغلوب بنے رہے لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا۔ کہ وہ صرف اپنی روزانہ روٹی کے لئے جنگ آزما ہیں تبھی وہ ان ٹکڑوں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور انکی ذہنیت کے اس انقلاب پر جرمنی کے اربابِ حکومت حیران و ششدر رہ گئے +

غرضیکہ گذشتہ عالمگیر جنگ ہمیں زبانِ حال سے پکار پکار کر یہ سبق دے رہا ہے۔ کہ جرمن قوم کے لئے پُرامن تجارتی پالیسی۔ نیز نوآبادیاں بسا بسا کر دنیا بھر پر اقتصادی فتح حاصل کرنا عین ممکن تھا۔ کیونکہ اس کے یہ اوصاف ان علامات کے

عالمگیر جنگ

(۵)

اپنی زندگی اور جوانی کے جوش سے بھرپور ایام میں مجھے یہ بات بہت کھٹکتی تھی۔ کہ ملک میں جتنی بھی قابل اعزاز یادگاریں قائم کی گئی تھیں۔ وہ تقریباً سب کی سب سربرآوردہ تاجروں یا حکومت کے "جی حضوری" لوگوں کی تھیں۔ برخلاف اس کے کسی محب وطن سیاسی مدبر کی کوئی عزت افزائی یا یادگار کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ نیز سیاسی خیالات کی لہر کچھ ایسی خاموش اور بے جان سی تھی۔ کہ اسکی عدم موجودگی بھی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ جس سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ مستقبل قریب میں ہی اس خاموشی کا خاتمہ ہو کر کسی نہ کسی طرح جرمنی میں بھی دوسرے ملکوں جیسی سیاسی زندگی پیدا ہونیوالی ہے کیونکہ اب یہ سکون بھی ایک پُر فریب نمائشی ڈھونگ سا جان پڑتا تھا جس کا منشا سوائے اس کے کچھ نہ تھا۔ کہ اس طرح چپکے ہی چپکے کمال ہوشیاری سے اس تمام ظالمانہ جبر و تشدد کا خاتمہ کر دیا جائے۔ جس نے قوم کو ایسا بے زبان اور بے دست و پا بنا رکھا ہے کہ دوسرے آزاد خیال ممالک اسکی حالت زار پر افسوس کرتے ہیں۔ اور کئی تنگ خیال رقیب تو میدان تجارت و حرفت میں اس سے بازی لے جانے کے لئے رقیبانہ چھینا جھپٹی سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ اور ہماری کوتہ اندیشیوں نیز غلطیوں سے ہر ممکن طریق پر فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس طرح گرد و پیش ایک ایسی پُر شور فضا پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ جیسی کہ ناٹک گھروں میں ہوا کرتی ہے۔ لیکن پھر جیسا کہ سٹیج کی مارکاٹ جا رہی ہو ، راحت کے

طبقات میں پرچار شروع کر دیا۔ جو زمانے میں نیشنل سوشلزم کی تحریک کے مرکز مانے جاتے تھے۔

اگرچہ بہ حیثیت مجموعی جرمن کبھی بھی مارکس ازم کے دلدادہ نہ تھے۔ مگر اپنے اُس وقت کے طریق زندگی کی رو میں وہ اپنی قومیت کے اِس دشمن کو اچھی طرح پہچان نہ سکتے تھے۔ اگرچہ اس اثنا میں بھی کبھی کبھی انہوں نے اس مرض کو دور کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن اس کی جڑ بنیاد تک پوری پوری پہنچ جانے کے باعث وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اور نہ کوئی اس بات کو جاننے کا پوری طرح خواہشمند ہی تھا۔ کہ کس طرح ایسے موقع پر مارکس ازم کی حمایت اور اُسکا پرچار کرنے والوں کی ایک زبردست ٹولی میں شریک ہو کر اُسکی مدد کرنے کا ہم معنی ہے۔"

دکھائی ہو۔ اس لئے اس کے ممکن انجام کی طرف بھی فوراً ہی میری توجہ گئی۔ اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا۔ گویا کہ جلد ہی دنیا پر تکالیف و مصائب کا ایک طوفانِ عظیم چھا جانے والا ہے۔ لیکن بعد میں جب یہ معلوم ہوا۔ کہ اس مہلک واقعہ کا ارتکاب کسی جرمن کے نہیں۔ بلکہ ایک سرو کے ہاتھوں ہوا ہے۔ تو میں نے یہ سوچا۔ کہ دیکھو! یہ غلامی کا دلدادہ حامی کس طرح آخر اپنے غلاموں کی ہی شیطانی چالوں کا شکار ہوا ہے

؏ "کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو"

جب اس قتل کے نتیجے کے طور پر آسٹریا نے سرویا اور اس کے دوستوں کو جنگ کا الٹی میٹم دے دیا۔ تو عوام نے آسٹریا کو گالیاں دینا شروع کر دیا۔ مگر میری رائے میں یہ بھی ان کی زیادتی بے انصافی ہی تھی۔ کیونکہ ایسے حالات میں کوئی دوسری حکومت بھی اس کے سوا اور کیا کر سکتی تھی؟ آسٹریا کی جنوبی حدود کے اس پار تو ایک بے رحم اور سنگدل دشمن جان کا قبضہ تھا۔ جو اکثر اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ رکھتا تھا۔ اور اس کی تباہی و بربادی کے کسی موقعے سے فائدے اٹھانے میں کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ اس لئے مجھے سب سے بڑا خوف بھی یہی تھا۔ کہ ولی عہد کے اس واقعہ کے بعد تو اب وہ آسٹریا کو اور بھی زیادہ تنگ کریگا۔ اور ایسی حالت میں حکومت آسٹریا کے لئے اپنی ہستی قائم رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ کیونکہ اس وقت تو آسٹرین حکومت کی زندگی نوجوان فرانسس کی زندگی کے ساتھ ایسی وابستہ تھی۔ کہ اسکی موت کے ساتھ ہی آسٹرین حکومت کی موت کا بھی اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے ان حالات میں اس جوان موت پر سبھی انصاف پسند لوگوں کو بہت افسوس ہوا۔

اگرچہ بظاہر اب حالات کچھ ایسے ہو چکے تھے۔ کہ جنگ کو ہمیشہ کے لئے نہیں ٹالا جاسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میری رائے میں سال دو سال کے لئے ملتوی ضرور ہو سکتا تھا۔ مگر اس واقعہ سے یہ امکان بھی مٹ گیا۔ اور جرمن آسٹرین اتحاد کی پالیسی کی

نظاروں سے اکثر ناظرین کچھ بھی متاثر نہیں ہوتے۔ ویسے ہی ان سب باتوں سے نہ تو ہمارے اندرونی سکون میں کوئی فرق پڑ سکتا تھا۔ اور نہ اس سے کوئی حقیقی نفع و نقصان ہمیں دکھائی دیتا تھا۔

ہماری یہ بے حسی کی سی حالت تقریباً مستقل ہی نظر آتی تھی۔ بلکہ دنیا کی اکثر قوموں کی نظروں میں تو پسندیدہ بھی تھی۔ اور جیسے اکثر یہودی تاجروں کے گوداموں کی ڈیوڑھیوں میں ہمیشہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے چاپلوسوں کی بھیڑ بنی رہتی ہے۔ اسی طرح ہمارے اردگرد بھی ان پردیسی تماشائیوں کی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ جو ہمیشہ ہمارے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور رقابت آمیز کشاکشی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اور یہ ہماری موجودہ صورت حال کا ایک دائمی سا پہلو بن گیا تھا جس میں کبھی کوئی تبدیلی ممکن نظر نہ آتی تھی۔

یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی تو میں یہ سوچا کرتا تھا۔ کہ ہائے! میں آج سے سو سال پہلے کیوں نہ پیدا ہوا جبکہ جرمن قوم کی آزادی کے لئے ایک زبردست جدوجہد جاری تھی۔ اور عوام کی توجہ صنعت و تجارت کے سوا دوسری انسانی قابلیتوں کی طرف بھی کافی دوانی تھی۔ چنانچہ جس وقت آسٹریا کے ولی عہد آرچ ڈیوک فرانسس فرڈی نینڈ کے قتل کی اطلاع میونخ میں پہنچی۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ان تمام واقعات کو دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سنا۔ مگر چونکہ میں یہ نہایت اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ ایک عرصہ دراز سے جرمن نوجوان اس غلامی کے جال پھیلانے والے گستاخ و شوخ چشم پژمردہ حکومت کی ہستی سے ملک کو پاک کرنے کی زبردست خواہش اپنے پہلو میں دبا رہے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے میرے دل میں یہی خیال ہوا۔ کہ کہیں یہ گولی بھی کسی جرمن نوجوانوں کے پستول کی گولی ہی نہ ہو۔ اور کسی بہادر جرمن نوجوان نے ہی اپنی حب الوطنی اور قوم پرستی کے جنون خیز جوش میں ہی یہ کام گذاری سے کر

سے خواہی نخواہی لڑنا ہی پڑیگا +

اس جنگ کے متعلق میرے خیالات بھی بالکل سیدھے سادے اور صاف تھے میں اسے آسٹریا اور سرویا کی لڑائی نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ میری رائے میں جرمنی اپنی زندگی کے اظہار کے لئے یہ لڑائی لڑ رہا تھا کیونکہ اس وقت جرمن حکومت کو اپنی ہستی اپنی آزادی اور اپنے مستقبل کی بہت زیادہ فکر تھی۔ وہ بسمارک کے نقش قدم کی پیروی کر رہا تھا۔ نوجوان جرمنوں کو بھی آخر اسکی حفاظت کے لئے میدان میں آنا پڑا۔ کیونکہ اس سے پہلے ان کے بزرگ بھی اس کی حفاظت میں کمال بہادری اور جانبازی سے داد شجاعت دیتے ہوئے "ویسن برگ سے سیڈا" اور پیرس" کی دیواروں کو پہنچ چکے تھے اس جنگ میں اگر جرمنی فتح یاب ہو جاتا۔ تو جرمن قوم کا شمار آج دنیا کی عظیم الشان طاقتوں میں ہوتا اور جرمن ریش (پارلیمنٹ) اپنے ہموطنوں کی روٹیوں میں ذرہ بھر بھی کمی کئے بغیر دنیا میں امن وامان قائم کرنے کی دعویدار قوموں میں سب سے آگے ہوتی +

۳ اگست کو میں نے بویرین رجمنٹ میں بھرتی کے لئے اپنی درخواست شاہ لڈوگ کی خدمت میں ارسال کی جو کہ منظور ہو گئی۔ اور اس سے مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ کیونکہ اس وقت ہر ایک جرمن کی مانند میرے دورِ زندگی میں بھی دنیا کے اندر ایک نئی اور شاندار صبح کا ظہور ہوا۔ اور اس عظیم الشان جدوجہد کے مختلف واقعات کے سامنے مجھے اپنی گذشتہ زندگی کے تمام واقعات ہیچ نظر آنے لگے۔ اسطرح خونریزی اور کشت وخون میں ہی سال کے بعد سال گزرتے چلے گئے۔ جدجنگ وجدل کا سب جوش وخروش ٹھنڈا ہو کر خوف وہراسانی ان کی جگہ لینے لگی۔ ہمت وجرأت ٹھنڈی پڑ گئی۔ استقلال کے پیر ڈگمگا گئے۔ ہر طرف موت کا بازار گرم دیکھ کر دل ڈوبنا شروع ہو گیا۔ آخر ایک وقت آیا۔ جبکہ ہر انسان کے دل میں قومی فرض شناسی،

نحوست کے زیر اثر جرمنی کو بھی اس میں خواہی نخواہی شریک ہونا پڑا +

بہرحال یہ نہایت ہی بے موقع لڑائی تھی۔ مگر یہ پختہ عقیدہ ہے۔ کہ اس جنگ کے نامبارک موقع پر بھی اگر مناسب طور پر کوشش کی جاتی۔ تو دنیا میں ایک بہت بڑی حد تک امن و امان قائم رہ سکتا تھا۔ یا کم از کم اتنے زبردست کشت و خون کی تو ہرگز نوبت نہ آتی۔ لیکن آفت تو یہ تھی۔ کہ ایک عرصہ دراز سے جرمن سوشلسٹ نہایت بھدے طریق سے روس کی شاہی حکومت کے خلاف نعرہ ہائے جنگ بلند کر رہے تھے ۔ یہاں کی مرکزی پارٹی مذہبی وجوہات کی بنیاد پر جرمن سیاسیات کا رشتہ آسٹریا ہنگری کے ساتھ جوڑنے میں الگ مصروف تھی۔ لہٰذا ہمارے لئے بھی اب اُن غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا لازمی و یقینی ہوگیا تھا۔ اور وہ کسی طرح بھی ٹال نہ سکتا تھا۔ کیونکہ جرمن حکومت سے پہلے یہ غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے حفظِ امن کا کچھ خیال نہ کیا۔ اور اس موقع سے مناسب فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ امنِ عالم کے نام پر آسٹریا کے اور اٹلی کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ جس کے نتیجے کے طور پر اسے بھی اس گروہ بندی میں شریک ہونا پڑا۔ جسکا مقصد دنیا میں امن و امان برقرار رکھنے کی بجائے ایک عالمگیر خونریزی کی فضا پیدا کرنا تھا +

چنانچہ اس طرح ایک نہایت وسیع پیمانے پر لڑائی چھڑ گئی۔ اور وہ آہستہ آہستہ اتنی وسعت اختیار کر گئی ۔ جتنی کہ شاید پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی۔ مجھے جب میونخ میں اسکی اطلاع ملی۔ تو دو طرح کے خیالات میرے دل میں پیدا ہوئے۔ ایک تو یہ کہ جنگ لازمی و لابدی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ ہیپسبرگ (آسٹریا) اپنے اتحاد پر قائم رہیگا۔ اسلئے جرمنی کو بھی ان جھگڑوں میں پھنسنا پڑے گا۔ جنکا تعلق صرف آسٹریا سے ہے کیونکہ میرا یہ پختہ یقین تھا۔ کہ آسٹرین حکومت اپنی اندرونی مصلحتوں کی بدولت کبھی کسی دوسری اتحادی طاقت کی کچھ مدد نہیں کر سکتی۔ مگر دوسری قوم کو اس کی وجہ

عالم پر موجود رہے گی۔ وُہ اپنے اُن مایۂ ناز و سرمایہ فخر سرفروش دلاوروں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ اگرچہ مجھے سیاسیات کا کچھ بھی خیال نہ تھا۔ لیکن پھر بھی میں تمام قوم اور بالخصوص فوجی سپاہیوں سے تعلق رکھنے والے چند ایک مسائل پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات اظہار کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ مارکس ازم کے پرچار کیلئے میں نے جو طریقے سوچے تھے۔ اُن کا خیال کر کرکے بھی کبھی میرا دل بڑے پرجوش جذبات سے بھرجایا کرتا تھا۔ کیونکہ انکا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ دنیا بھر کی سبھی یہودی قوموں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کے ماہ جولائی سے ہی میں جرمن مزدوروں کے دلوں میں اپنے خیالات پھونکنے کی کوشش میں نہایت سرگرمی کے ساتھ مصروف ہوگیا تھا۔ اور وُہ اسیوقت سے بیدار ہوکر آہستہ آہستہ مادر وطن کی خدمت میں لگتے جا رہے تھے۔ اور "یہودیت" آمیز خیالات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ غرضیکہ ایک محدود سے ہی زمانے میں یہودیت کی پُر فریب قومی ٹھگی کی مذموم فضا ایسے غائب ہوگئی تھی۔ جیسے کہ طلوعِ آفتاب سے کہرا اُڑ جاتی ہے۔ اب یہودی لیڈروں کی ٹولی تقریباً بے یار و مددگار رہ گئی تھی۔ جن سے وُہ گذشتہ آٹھ سال سے بھولے بھالے عوام کو بھڑ کا بھڑکا کر اپنے دام تزویر میں پھنسا رہے تھے۔ اور جرمن مزدوروں کیساتھ عیاری و مکاری کرنیوالوں کیلئے یہ ایک نہایت ہی نامبارک زمانہ تھا۔ اسلئے جب میں نے ان مکار لیڈروں کی مخالفت شروع کی اور میں ان کیلئے ایک بلائے بے درماں بنکر ظاہر ہوا۔ تو انہوں نے بھی اپنی حسب عادت جھوٹ اور کذب کے بےانتہا ہتھیاروں سے میرا مقابلہ شروع کردیا۔ اور اپنی حماقت و بے وقوفی سے جرمن قوم پرستی کے جذبات کی توہین و مذمت کرکے مجھے مدد دینے لگے ؛

ان دشمنان قوم و ملک کے جتھے پر حملہ آور ہونے کیلئے یہی موقعہ نہایت موزوں و مناسب تھا۔ چنانچہ جرمن محبانِ وطن و فدایانِ قوم و ملک نے بھی اپنی قومی و

اور ذاتی حفاظت کے جذبات کے درمیان کشمکش ہونے لگی +

۱۹۱۵-۱۶ء کی سردیوں میں جب اس جدوجہد سے نجات حاصل کرنے کے بعد میری خوابیدہ خواہشات کی فتح ہوئی - تو جن خیالات کو میں پہلے ہنسی مذاق میں اڑا دیا کرتا تھا - ان ہی میں اب مجھے پھر صداقت و اصلیت نظر آنے لگی - اور آہستہ آہستہ ان پر فتح حاصل کر کے میرے دل کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہوا - اب اس امتحان میں میری حوصلہ شکنی کے بغیر مجھے ان دلائل سے منحرف کرنے اور میرے طریق عمل میں کچھ تبدیلی پیدا کرنے میں صرف قسمت ہی کامیاب ہو سکتی تھی - اور اس کے سوا کوئی دوسری طاقت ایسی نہ تھی - جو مجھے اس سے ایک قدم بھی ادھر ادھر کر سکتی +

اب میں ایکدن ان گڑھ نوجوان والنٹیر کے درجہ سے بڑھ کر ایک فرض شناس سپاہی بن چکا تھا - اور تمام فوجی حلقوں میں ایک زبردست انقلاب بھی آ گیا تھا جسکا نتیجہ یہ تھا - کہ ہر شخص کو جس میں طوفان کا مقابلہ کرنے کی تاب و طاقت نہ تھی میدان چھوڑ کر بھاگ جانا پڑتا تھا - اسوقت جنگ آزما سورماؤں کے دلوں کی جو حالت تھی - اسے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا تھا - کیونکہ وہ برسوں سے مسلسل جنگ و جدل میں مصروف تھے - اور بڑے بڑے خوفناک اسلحہ جات جنگ سے مسلح دشمنوں کا شب و روز مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے بھوک پیاس سردی - گرمی وغیرہ وغیرہ کی گوناگوں تکلیفات جھیل رہے تھے - ان کے حقیقی اوصاف کو پہچاننے کے لئے یہی وقت سب سے زیادہ موزوں و مناسب تھا +

اگرچہ جدال و قتال کے یہ خوفناک نظارے ہزارہا سال سے پیش نظر آ رہے تھے - لیکن کوئی بھی انصاف پسند شخص اس عالمگیر جنگ میں جرمن بہادروں کی بہادری و جانبازی کی داد دیئے اور تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا - اور جبتک جرمن قوم صفحۂ

درخشاں ظاہر کر سکے۔ یعنی میدانِ مقابلہ میں دوسروں سے گوئے سبقت لیجانے کی کوشش کرے اور یہ سبقت لے جانیکی کوشش ہی ہمیشہ "حملے" کی مترادف ہُوا کرتی ہے۔ اسی لئے دنیا کے کسی بھی مسئلہ کی ترقی کے لئے کوئی کوشش اسوقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ جبتک کہ کسی مخالف مسئلہ کو سامنے رکھ کر اس سے مقابلہ یعنی رگڑ پیدا نہ کی جائے۔ اور یہ اسیوقت ہوتا ہے۔ جب کہ دو نو فریق ایک ہی اصول کو سامنے رکھ کر اپنے اپنے نقطۂ خیال سے اس پر بحث کرتے رہیں۔ ایسی حالت میں اپنی قوت و طاقت مضبوطی و پختگی کا اظہار کئے بغیر دنیا سے اپنے حق میں فیصلہ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ یہ صاف ہی ظاہر ہے۔ اسی لئے اسوقت تک نام نہاد مارکس ازم کیخلاف جو جنگ جاری تھا۔ انہیں پوری پوری کامیابی نہیں ہو سکی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ مسئلہ مساوات کے متعلق بسمارک کا فیصلہ بھی آخر بے اثر رہا۔ اور قدرتی موت مرگیا۔ گو اس میں شک نہیں کہ اس لئے ایک نیا مسئلہ پیش ہوا۔ اسکے پرچار کا راستہ کچھ مدت کے لئے ضرور کھول دیا۔ کی حمایت میں اسوقت ایک عرصہ تک جد و جہد بھی ہوتی رہی۔ اسی لئے ان خوشامدی چاپلوس لوگوں کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ ہر شخص کو اپنی قومی ہستی یعنی ملکی حکومت اور امن کی حمایت و حفاظت میں آخری دم تک لڑنا چاہیئے۔ اور اس کے سوا کسی اور چیز کے لئے نہیں +

اسی طرح ۱۹۱۴ء میں سوشلزم کے خلاف جو جد و جہد ہُوئی۔ وہ بھی قابلِ غور ہے لیکن چونکہ اسوقت کوئی زیادہ اہم مسئلہ قوم کے سامنے موجود نہ تھا۔ اسلئے عوام میں یہ خیال ضرور پھیلا دیا ہوگا۔ کہ ایسی کوئی لڑائی زیادہ عرصہ تک کامیابی کے ساتھ جاری نہیں رکھی جا سکتی اور یہی اس تحریک کا خوفناک کھوکھلا پن تھا۔ جس نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ مگر عالمگیر جنگ کے آغاز

ملکی آزادی کے لیے کام کرنے کا سیدھا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ اور جرمن حکومت کا بھی یہ فرض ہوگیا۔ کہ وہ جرمن آزادی اور جرمن قومیت کے ان دشمنوں پر کچھ رحم اور ترس نہ کھا کر انکا خاتمہ کر دے۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر ہر ایک ذمہ دار افسر اور حاکم کا یہ فرض ہوتا ہے۔ کہ وہ ان لوگوں کو بیخ و بن سے تباہ کر ڈالے۔ جو محض شرارت سے قومی ترقی و نشوونما کے راستے میں فضول رخنہ اندازیاں کرتے ہیں۔ مگر ہمارے قیصر جرمن نے اس طرف مناسب توجہ نہیں دی۔ بلکہ ایسے بد باطن شرارت پسندوں کو الٹا اپنی پناہ میں لے کر انکی اور بھی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں اپنی من مانی کرتے رہنے کا موقعہ دے دیا +

دنیاوی مسئلہ کے متعلق خواہ وہ مذہب سے تعلق رکھتا ہو یا سیاسیات سے یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ اسکا آغاز کہاں سے ہوا ہے۔ اور انجام کہاں ہوگا؟ کیونکہ شروع میں اسکا حقیقی مقصد دوسرے دنیاوی مسائل یا خیالات کی تباہی یا ان سے ٹکر لینا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ صرف اپنی ہستی کے اظہار اور اپنی حفاظت کی کوشش کیا کرتا ہے۔ اور اسی طرح دوسرے مسائل سے جو اسکے پرچار اور اظہار کی ترقی میں حائل ہوتے ہیں۔ اور اسکی ذاتی حفاظت کے حق پر حملہ کرتے ہیں۔ اس کی رگڑ شروع ہو جاتی ہے۔ جس سے حقیقتاً اسے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ یہی رگڑ دراصل اسکی فتح کا باعث ہوتی ہے۔ مگر یہ کہنا بھی مشکل ہے۔ کہ دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کا مقصد ہمیشہ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ تقریباً ہر ایک ہی مسئلہ بظاہر منطقی طور پر ٹھیک معلوم دیتا ہے۔ اور اپنی حفاظت کے ساتھ اور اپنے اظہار سے دوسروں کے کمزور پہلو پر حملہ کرنے کی پالیسی سے ہی وہ مضبوط اور طاقتور بن سکتا ہے۔ کیونکہ اسکا آخری مقصد اپنی حفاظت نہیں۔ بلکہ اپنا اظہار ہی ہوتا ہے۔ اور یہ صرف تبھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ اپنے آپ کو اوروں کی نسبت زیادہ پختہ مضبوط اور توانا

پرچار

۶

اب میں نے تمام سیاسی واقعات پر غور کرنے کے ساتھ ہی ساتھ انکے متعلق اپنے خیالات کا پرچار بھی شروع کر دیا۔ اور اس میں مجھے خوب آنند آنے لگا۔ ان ہی ایام میں مجھے مارکس ازم کے پیرو سوشلسٹوں کی تنظیم پر غور کرنے سے یہ راز معلوم ہوا۔ کہ انہوں نے کس دانشمندی سے اپنے اصولوں کا پرچار کر کے عوام کو انکا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ کہ پرچار بھی ایک باقاعدہ علم وفن ہے۔ جس سے ہر شخص اچھی طرح واقف نہیں ہوتا۔ اگر کرشچین سوشلسٹ تحریک کی کامیابی کا راز یہی تھا۔ جس نے اپنے اس اندرونی وصف کی بدولت ہی ڈاکٹر لوئزا کے زمانے میں اچھی شہرت حاصل کر لی تھی۔ لیکن کیا ہمارے پرچار کا طریقہ بھی ویسا ہی باقاعدہ ہے۔ جیسا کہ ہونا چاہیئے ؟

افسوس! کہ اس سوال کا جواب میں "نہیں" کے سوا کچھ بھی نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ اسوقت اس بارے میں جو کچھ بھی کیا گیا تھا۔ اُسکا آغاز ہی ناقابلیت اور دماغی نااہلیت کے ساتھ ہوا تھا۔ اس لئے اس سے ہماری تحریک کو کچھ فائدہ پہنچنے کی بجائے الٹا نقصان ہی پہنچا تھا۔ ہمارے پرچار کا طریق اپنی ظاہرا شکل وصورت کے لحاظ سے بھدا اور اندرونی اثر کے خیال سے بالکل غلط تھا۔ اسی لئے جنگ کی حمایت میں جرمنوں نے جو بھی پرچار کیا تھا۔ اسکا کوئی بھی پسندیدہ

سے بہت پہلے بھی میری یہی فیصلہ شدہ رائے تھی۔ اور اسی لئے اس وقت تک میں کبھی پارٹی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب سے جنگ شروع ہوا تھا۔ تب سے تو اس بارے میں میرے خیالات اور بھی زیادہ مضبوط ہو گئے تھے۔ اسوقت مجھے کوئی ایسی تحریک نظر نہیں آئی تھی۔ جو پارلیمنٹری حکومت کے متعلق زیادہ ہمت سے اس نام نہاد "سوشلزم" کیساتھ لڑ سکتی۔ اسلئے میں بھی خاموش رہا +

مگر اب میں نے اس بارے میں کمال بیخوفی سے اپنے دوستوں سے بات چیت شروع کر دی۔ اُسیوقت سے میرے دل میں بھی ایک سیاسی لیڈر بننے کا خیال پیدا ہوا۔ اور میں نے اپنے دستوں کو یہ یقین دلایا۔ کہ آج سے میرا کام اپنے کام کاج کے ساتھ ہی ساتھ اپنے خیالات کا پرچار بھی کرنا ہوگا۔ اور اب میں کبھی کبھی یہ سوچا کرتا ہوں۔ کہ اسوقت میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہونا ہی ایک نہایت اہم اور معرکہ خیز بات تھی +

ہماری قوم کو اپنی آزادی کے برقرار رکھنے میں بہت کچھ مدد دی ہے۔ اسلئے زندگی یا موت کے ایسے نازک ترین موقع پر جنگ کی حمایت میں پرچار کا بھی ایک قابل اعتبار ذریعہ تھا۔ جو ہمارے لئے مفید ثابت ہوسکتا تھا ۔

لیکن کاش کہ ہمارے ذمہ دار اعلےٰ افسران و حکام کو اسکا پورا پورا علم ہوتا۔ تاکہ وُہ مناسب طور پر اس زبردست ہتھیار سے ٹھیک ٹھیک اور باموقع کام لے سکتے۔ کیونکہ یہ کسی بھی دوسرے ہتھیار سے کچھ کم ضروری اور کم پُراثر نہ تھا۔ اور خصوصًا ان لوگوں کیلئے تو بیحد خوفناک تھا۔ جو اسکی مارا سکے اثر کی اہمیت و عظمت سے اچھی طرح واقف نہیں۔ اور نہ اسکے سمجھنے کی طاقت ہی رکھتے ہیں۔

پرچار کا کام ہمیشہ کھلا اور مقبول عام طریق پر ہونا چاہیئے۔ اور اسکا میدانِ عمل اتنا وسیع ہو کہ اسکی آواز سمجھ بوجھ رکھنے والے جاہل اور کم عقل انسانوں تک بھی پہنچ جائے۔ اس کے لئے ہر پرچارک کو اپنی دماغی طاقتوں کو نہایت نطیف اور سنجیدہ بنانا پڑتا ہے۔ تبھی وُہ عوام کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ جنگ کے موقع پر جیسا پرچار کیا جاتا ہے۔ اگر ویسا ہی پرچار عوام کو اپنے زیر اثر منظم کرنے کیلئے بھی کیا جائے۔ تو جنگ میں حصہ لینے کیلئے بھی انکے خیالات کی بلندی و پاکیزگی کے معیار کو کم کرنے کی کچھ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیونکہ عوام کی قابلیت بہت ہی محدود ہوتی ہے۔ اور اسی پر انکی سمجھ بوجھ کا انحصار ہوتا ہے۔ ماسوا اس کے ان میں بھول جانے کا مادہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اسلئے یہ ضروری بلکہ بہتر ہے۔ کہ جن باتوں کا بھی ان میں پرچار کیا جائے۔ وُہ ایک دم بہت سی نہ ہوں۔ بلکہ بہت محدود ہوں۔ اور تب تک انہیں نہایت سیدھے سادھے اور مختصر الفاظ میں ہی پیش کیا جائے۔ جب تک کہ حاضرین یہ سمجھنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ کہ اس پرچار کا حقیقی منشا کیا ہے۔ اگر اس طریق پہ لوگوں کی

نتیجہ رونما ہوسکتا تھا۔ کیونکہ ہم اب تک یہ بھی نہیں سمجھے تھے۔ کہ پرچار کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ذریعہ ہے۔ اصل مقصد نہیں۔ اسی لئے اس پہلو میں ہمارا سب کچھ کیا کرایا بے سود ثابت ہوا تھا۔

مناسب یہ تھا۔ کہ ہم پرچار کو کسی مقصد کو حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ سمجھکر اسی مقصد کے نقطہ خیال سے اس پر غور کرتے جس کی تکمیل مطلوب تھی۔ اور اسے ایسی صورت شکل دیتے۔ جو اس مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہوتی۔ پھر یہ بھی صاف ظاہر تھا۔ کہ کسی مقصد کی عظمت۔ اسکی معمولی اور وقتی ضرورت کے خیال سے ہی بالکل الگ ہوسکتی ہے۔ اور اس کے مطابق ہی اس کے پرچار کے طریقوں میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ مثلاً عالمگیر جنگ کے آغاز میں جس اعلیٰ مقصد کو پیش نظر رکھکر ہم اسمیں شریک ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ ہر شخص بآسانی لگاسکتا ہے۔ اور یہ مقصد صرف ہماری قومی آزادی اور زمانہ مستقبل میں اسکا تحفظ تھا۔ نیز فقط اسی طرح ہم اپنی قومی آزادی اور قومی عزت و عظمت کی حفاظت کر سکتے تھے۔

انسانیت کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مولٹکین نے کہا۔ کہ جنگ کے ہر پہلو کو جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ کیونکہ آخر میں اسکا بہت ہی گہرا اثر پڑتا ہے۔ زمانہ جنگ میں اسکی حمایت کا پرچار بھی اس مطلب براری کا ہی ایک طریقہ تھا۔ کیونکہ جرمن قوم کیلیئے یہ ایک ایسی کشمکش کا زمانہ تھا۔ جبکا اسکی زندگی اور موت سے بہت ہی گہرا تعلق تھا۔ اسی لئے اسی حقیقی مقصد کو پیش نظر رکھا اور اسی کی بنا پر جنگ کی حمایت میں پرچار کیا جاسکتا ہے۔ جب میدان جنگ میں جرمن نت نئی فتوحات کے خواہاں تھے۔ تو انکا سب سے زبردست اور ضروری ہتھیار عوام سے ہمدردی اور انکی بدحالی پر رحم کا باموقع اظہار ہی ہوسکتا تھا۔ اور اسی لئے درحقیقت

کو وحشی اور سنگدل ظاہر کرتے ہوئے وہ اپنے ہر ایک نوجوان کو جنگ میں حصہ
لینے کے لئے جوش دلاتے رہے۔ اور ہر مایوسی خیز و حوصلہ شکن فضا کو دور کرنے
جوش اور ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اسطرح ہم نے جو بھی
خوفناک سے خوفناک ہتھیار ان کے خلاف استعمال کئے۔ وہی انکے پرچار کو
زیادہ سے زیادہ تر تقویت دینے والے بن گئے۔ کیونکہ ان کے ہر ایک سپاہی
اپنی حکومت کے ہر بیان کی صداقت پر پورا اعتبار تھا۔ اور واقعات اس اعتبار
کو حق بجانب ثابت کرتے رہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس سے جو کچھ بھی کہا
جاتا تھا۔ وہی اس کے دل میں اپنے زبردست دشمن کے خلاف نفرت و
حقارت اور غم و غصہ کے جذبات بھڑکانے والا ثابت ہوتا تھا۔ اس طرح
برطانوی سپاہیوں کو یہ کبھی بھی محسوس نہیں ہوا۔ کہ جنگ کے متعلق جو بھی اطلاعات
ہمیں ملی ہیں۔ وہ کسی طرح غلط تھیں +

تعجب تو صرف یہ ہے۔ کہ جرمن سپاہی اپنی حکومت کے بیانات پر اعتبار
نہ کرتے ہوئے بھی کس طرح آخری وقت تک جنگ جاری رکھنے پر آمادہ رہے
اسلئے انہیں اگر شکست ہوئی بھی ہے۔ تو اسمیں انکا ذرہ بھر بھی قصور نہیں
قصور ہے صرف ان دھوکے باز اور جعلساز حکام کا جو ہمیشہ جرمن قوم کو غلط
اور دھوکے میں پھنسائے رکھنے کی ہی کوشش کرتے رہے ہیں +

اب رہا "جنگ کی ذمہ داری کا سوال"! اس بارے میں یہ کہنا کہ جرمنوں کو
اس جنگ کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ بھی ایک بنیادی غلطی ہے۔
کیونکہ کسی بات کے ثبوت کا بار ہمیشہ کہنے والے کے اوپر ہی رہتا ہے خواہ
وہ اُسے اپنے دشمن کے سر پر لادنے کی کتنی بھی کوشش کیوں نہ کرتا رہے! اور
خواہ حقیقی واقعات کے سلسلے سے اسکا کچھ تعلق ہو یا نہ ہو +

سمجھ بوجھ کے مطابق پرچار کیا جائے - تو عوام کے لئے یہ ناممکن ہو گا - کہ وہ اس پرچار کے بنیادی اصول کو کبھی تا عمر بھول سکیں - اور پھر اس پرچار کی زیادہ ضرورت بھی باقی نہ رہے گی - کیونکہ عوام خود بخود اس کے اصول کو سمجھنے لگیں گے - اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اس سے نہ صرف خود ہی فائدہ اٹھا سکیں گے - بلکہ اوروں کو بھی یہ سبق سکھانے کی کوشش کریں گے +

ذمہ وار جرمن حکام کی ایک بہت بڑی اور بنیادی غلطی یہ تھی - کہ انہوں نے اپنے دشمن اور فریق مخالف کو ہیچ و ناکارہ سمجھنا اور اسکا مذاق اڑانا شروع کر دیا - جرمن اور آسٹرین اخبارات نے اپنی ہرزہ سرائیوں سے اس غلطی کے اثرات کو اور بھی بڑھا دیا - کیونکہ جب ہمارے سپاہیوں کو دشمن کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لڑنا پڑا - تو ہر ایک پر اس کی اصلی طاقت و قوت صاف ظاہر ہو گئی ہے اسوقت یہ ضروری تھا - کہ ہم اپنے سپاہیوں کے دلوں پر ایسے اثرات ڈالتے جو ان پہلے اثرات کو بسہولت زائل کر سکتے - کیونکہ اسپر فتح پانے اور اس سے پُر اثر طور پر اپنا بدلہ لینے کا یہی ایک واحد طریقہ ہو سکتا تھا - لیکن دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد جب جرمن سپاہیوں کو یہ معلوم ہو گیا - کہ دشمن میں حملہ اور مقابلہ کرنے کی طاقت کیسی اور کتنی ہے؟ - تو ان کے دل میں خیال پیدا ہونا محض قدرتی تھا - کہ بدمعاشوں نے ہماری طاقت جنگ و جدل کے بڑھانے اور مضبوط کرنے کی بجائے بے بنیاد باتیں بنا بنا کر ہمیں ٹھگا ہے - نیز دھوکے کے جال میں پھنسایا ہے - اور یہ سب کچھ دیکھکر انکا دل بہت ٹوٹ گیا +

برخلاف اسکے برطانوی اور امریکن حکام و اخبارات کی طرف سے جنگ کے متعلق جو پرچار ہوا - وہ ہر پہلو سے صحیح تھا - اپنی اپنی قوموں کے سامنے جرمنوں

اس کے یہ بھی خیال ضرور رہنا چاہیئے۔ کہ جو بھی حقیقی۔ اصلاح یا سدھار اسکے اصلی اور بنیادی مقصد کے لئے حقیقتاً نقصان دہ ہو۔ اسکا فوراً اظہار حقیقت سے خاتمہ کر دیا جائے۔ تاکہ وہ زیادہ خرابی پیدا نہ کر سکے۔ اس کے سوا ٹھوس مستقبل اور دیرپا پروپیگنڈا کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر ایک اعلان یا اشتہار کی کامیابی کا انحصار خواہ وہ سیاسی ہو یا تجارتی۔ اس بات پر ہے۔ کہ سلسلہ مضمون باقاعدگی سے جاری رہے۔ اور اپنے حقیقی مطلب و مدعا کے خلاف ایک لفظ نہ نکلنے پائے۔

ہمارے دشمنوں کے تمام اعلانات اسی اصول کی پیروی کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ ایسی چند باتوں تک محدود رہتے تھے۔ جنکا عوام سے براہ راست اور گہرا تعلق ہو۔ اور وہ برابر ان ٹھیک طریقے سے اپنے مقصد کی پیروی میں مصروف پائے جاتے تھے۔ ان میں آغاز جنگ سے ہی ٹھوس اور واقعات پر مبنی امور کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اور خوبصورتی و عمدگی سے کہ اس میں کسی بھی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ لیکن ہمارے پروپیگنڈہ میں سب سے پہلے تو اس کی شرمناک لغو بیانیوں اور دروغ بیانیوں کے باعث ایک پاگل پن کی سی جھلک دکھلائی دیتی تھی۔ بعدازاں اس کے خلاف نفرت و حقارت پیدا ہوتی تھی۔ لیکن آخر میں بے اعتباری و بے اعتمادی پیدا ہو جاتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بالآخر جرمنی میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور ہمارے دشمنوں نے اپنی فوجی مصلحت کو مدنظر رکھ کر اس خانہ جنگی کے تباہ کن شعلوں کو ہمارے ملک میں اور بھی تیز کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ غرضیکہ برطانی مدبروں نے ہماری اس مصیبت سے بھی اپنا مطلب سیدھا کرنا چاہا۔ ان کا خیال تھا۔ کہ ان کی یہ دانشمندانہ چال

غیر ملکی حکومتوں کی زیادتیوں کا آغاز کہاں سے ہوا ہے؛ اور انجام کہاں ہوتا ہے؟ یہ ایسے گہرے سوالات ہیں۔ جن پر عوام غور نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے ایک بہت بڑے حصے کی قدرتی رائے اور ان کا نقطہ نظر اتنا وسیع ہوتا ہے۔ کہ وہ علت و معلول کی لطیف بحث میں پھنسنے کی نسبت اپنے معمولی علم و عقل پر زیادہ بھروسہ رکھتے ہیں۔ پھر یہ تو واقعات بھی کچھ ایسے پیچیدہ نہیں تھے۔ بلکہ بالکل ہی سیدھے سادھے اور صاف تھے۔ نہ ان میں کوئی خاص راز کی بات ہی تھی۔ چنانچہ دوراندیش برطانوی پرچارکوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اسلئے انہوں نے کوئی بھی مبہم اور مشتبہ اعلان شائع نہیں کیا +

عوام کے جذبات و خیالات کی قدامت پرستی کو سمجھنے کی جو طاقت برطانوی پبلسٹی افسروں کو حاصل تھی۔ اسکا اظہار ان واقعات کے متعلق ان ہیبت خیز اعلانات سے ہوتا تھا۔ جو برطانی فوجوں کے شکست پر شکست کھاتے رہنے کے باوجود بھی نہایت ہوشیاری اور بے دردی کیساتھ انکی اخلاقی طاقت و قوت بڑھانے کیلئے شائع ہوتے رہتے تھے۔ اور جن میں اس جھوٹ کو بھی سچ ہی ثابت دکھانیکی کوشش کیجاتی تھی۔ کہ جرمنی ہی چونکہ اس تمام جنگ و جدل کی آگ کو بھڑکانے اور تیز کرنیکا ذمہ دار ہے۔ اس لئے اسی کو تباہ و برباد کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور اسی شرمناک جھوٹ کے پرچار سے عوام کی ہمدردی حاصل کی جارہی تھی +

پرچار کا طریق بدلنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے۔ کہ اسکے ساتھ ہی ساتھ اس پرچار کا مقصد بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس تبدیلی کے باوجود بھی اس کے حقیقی مقصد و مدعا کو بدستور قائم رکھنے میں ہی پرچار کی تمام خوبی پوشیدہ ہے۔ کیونکہ اصلی بنیادی مقصد کو پیش نظر رکھ کر مختلف طور پر ہر مضمون و ہر مسئلے پر خاطر خواہ روشنی ڈالی جا سکتی ہے لیکن ساتھ ہی

انقلاب

۷

۱۹۱۵ء میں ہمارے دشمنوں نے آسمان پر سے ہماری فوجوں میں اشتہارات
برسانے شروع کر دیئے۔ اگرچہ وہ اپنے مضمون اور شکل و صورت میں مختلف ہوتے
تھے۔ مگر پھر بھی مطلب و مدعا سب کا ایک ہی تھا۔ وہ یہ کہ جرمنی میں مشکلات روز بروز
بڑھ رہی ہیں لیکن جنگ ایک لامحدود عرصہ تک جاری رہتا نظر آتا ہے۔ اور جرمنی کے
سبھی باشندے امن و امان کے لئے مضطرب ہیں لیکن جنگ و جدل کے دلدادہ حکام
جرمنی خصوصاً قیصر بذات خود۔ قیام امن کے راستے میں رخنہ انداز ہیں۔ چونکہ تمام دنیا اس
حقیقت سے واقف ہے۔ اسی لئے وہ جرمنوں کے خلاف بحیثیت ایک قوم برسر جنگ
نہ ہوتی ہوئی بھی قیصر جرمنی کے خلاف ہی معرکہ آرا ہے۔ کیونکہ وہی۔ صرف وہی اس
جنگ کا حقیقی طور پر ذمہ دار ہے۔ اس لئے جنگ کا خاتمہ اسوقت تک ناممکن ہے۔
جب تک نوع انسان کا سب سے بڑا دشمن قیصر جرمنی میں موجود ہے۔ سب اعتدال پسند
اور جمہوریت نواز قومیں جنگ کے بعد امن عالم کی قائمی اور برقراری کے لئے "لیگ آف
نیشنز" میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں۔ جو پرشیا (یعنی جرمنی کا ایک
حصہ) کی جنگی سپرٹ ٹھنڈا ہوتے ہی فوراً قائم کر دی جائے گی +

ہمارے بہت سے سپاہیوں نے تو اس کو اس پر کچھ توجہ نہ دی۔ اور اسے مذاق
میں ہی اڑا دیا۔ مگر پھر بھی ایک بات ضرور ہوئی۔ وہ یہ کہ جہاں کہیں بھی یورپین فوجیں

ہمارے عوام پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ اس میں شک بھی نہیں کہ اگر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ تو انہیں ہماری تباہی کا ایک بے نظیر موقع ہاتھ آ جاتا۔ کیونکہ پبلسٹی یا پرچار کو ہی اپنی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے لیکن برخلاف اس کے ہمارے غیر ذمہ دار مدبروں کی نظر میں اسے کچھ بھی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ اسی لئے انہیں اس میں جو کامیابی ہوئی۔ وہ ہر پہلو سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور یہی انکی ناکامی کا سب سے بڑا باعث ہوئی ۔



تھے۔ وہ بھی دشمنوں کے اس پرچار جال میں خوب پھنس کر یہ ہی سمجھنے لگے۔ کہ اس
جنگ میں ہم نے جو تکلیفیں اور مصیبتیں اب تک جھیلی ہیں۔ وہ سب جرمنی کے
لئے اور اسکی بدولت برداشت کی ہیں +

میں ۱۹۱۶ء کے ماہ اکتوبر میں زخمی ہو گیا۔ اور مجھے زخمیوں کی گاڑی میں
ڈال کر ایک دن ہسپتال بھیج دیا۔ مجھے اپنا گھر دیکھے دو سال ہو چکے تھے۔ اور ان
حالات میں اسے اگر ایک لامحدود نہیں۔ تو طول و طویل زمانہ ضرور کہا جا سکتا ہے
مجھے برلن کے قریب ہی ایک فوجی ہسپتال میں رکھا گیا۔ آہ! وہاں کیسا زبردست
انقلاب نظر آیا؟ گویا وہاں کی دنیا ہی سب سے بالکل نرالی تھی۔ میدان جنگ کے
بہادرانہ اور جانبازانہ خیالات کا یہاں کہیں نام و نشان بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ سب سے
پہلے یہاں ہی ایک ایسی بات میرے کان میں پڑی جو میدان جنگ میں کبھی
خواب و خیال میں بھی دیکھنے یا سننے میں نہ آئی تھی۔ وہ بات تھی اپنی نامردی اور
بزدلی پر گھمنڈ +

جب میں کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ تو مجھے رزرو دستے (بوقت ضرورت
میدان جنگ میں بھیجے جانے کے لئے محفوظ سپاہی) بنا کر برلن جانے کی اجازت دے
دی گئی۔ وہاں جا کر میں نے ہر جگہ افلاس و ناداری کا راج دیکھا۔ لاکھوں شہری بال
بچے۔ جوان۔ بوڑھے مرد عورت فاقہ مستی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر طرف اضطراب
و پریشانی کا دور دورہ تھا۔ سب فوجی سپاہیوں تک کے منہ سے وہی باتیں سننے
میں آتی تھیں۔ جو میں ہسپتال میں سن آیا تھا۔ مگر ہر شخص کا یہی خیال تھا۔ کہ وہ
اپنی رائے کسی اعلےٰ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ظاہر کر رہا ہے +

میونچ کی حالت برلن سے بھی زیادہ خراب تھی۔ اتنی خراب کہ میں بمشکل اس
شہر کو پہچان سکا۔ جہاں بھی میں گیا۔ وہیں غم و غصہ بیزاری و بدمزاجی۔ بدمعاشی اور

تھیں۔ انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا۔ کہ جنگ کے لئے اصلی قصور پرشیا کا ہی ہے۔
اور پرشیا کے دوسرے اتحادیوں خصوصاً اہل بویریا کے خلاف کسی دشمن کے دل میں
بھی کوئی عناد یا دشمنی نہیں۔ اسلئے یہ اغلب نہیں کہ باشندگانِ بویریا تہ دل سے
اس جنگ کے حق میں ہوں یا دیر تک اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ چنانچہ
۱۹۱۵ء میں ہی یہ فرقہ بندی اور پھوٹ پھیلانے والے اشتہارات اپنا اثر ظاہر
کرنے لگے۔ اور پرشیا کے خلاف دوسرے علاقوں کی فوجوں کے جذبات میں
زہر پھیلتا ہوا نظر آنے لگا۔ لیکن پھر بھی ہمارے کوتاہ نظر افسروں نے اس کے انسداد
کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اور ۱۹۱۶ء میں یہ اختلاف کی خلیج اتنی بڑھ بڑھ گئی۔
کہ دشمنوں کو اب آسمان سے اشتہار برسانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور سب سے بڑھکر
عورتوں کی حماقت اور بے وقوفی بھری چٹھیوں نے تو ہماری سینکڑوں بلکہ
ہزاروں جانوں کی قربانیاں فضول ہی کرادیں +

ملک میں یہ ناموافق فضا روز بروز بڑھتی گئی۔ عوام تو کھلم کھلا اربابِ
حکومت پر گالیاں اور بددعاؤں کی بوچھاڑ کرنے لگے۔ اور چاروں طرف بےچینی
اور اضطراب اور غم اور غصہ پھیل گیا۔ ایک طرف فوجی سپاہی میدانِ جنگ میں بھوک
پیاس کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال رہے
تھے۔ دوسری طرف ان کے بال بچے افلاس و تنگدستی کا شکار بنے ٹکڑے ٹکڑے
کو ترس رہے تھے۔ اس کے برعکس ان کے دشمنوں کو سب طرح کی سہولتیں مہیا تھیں
اور ان کے بیوی بچوں کو بھی کوئی خاص تکلیف نہ تھی +

اس طرح بڑی آسانی سے آپس کے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جو لوگ چند
روز پہلے جنگ آزمائی کو اپنا قومی فرض سمجھتے ہوئے دل و جان سے اس میں حصہ
لے رہے تھے۔ انہوں نے بھی اب بڑبڑانا شروع کر دیا۔ جو اب تک سب طرح مطمئن

ہمارے دشمنوں پر کیا اثر پڑ سکتا تھا؟

اچانک ہی ۱۷-۱۹۱۶ء کے موسم گرما میں ہمارے مخالف اتحادیوں کی دنیا پر رنج و الم کے بادل چھا گئے۔ کیونکہ انہوں نے روس کی طرف سے جو امیدیں لگا رکھی تھیں ان سب پر یکدم پانی پھر گیا۔ یعنی جن لوگوں نے اپنی خود غرضیوں اور مطلب پرستیوں کی تکمیل کے لئے میدانِ جنگ کو اپنے ہموطنوں کے خون سے لالہ زار محشر کا نمونہ بنا دیا تھا۔ انہوں نے ہی اپنے جانی دشمنوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ ان کی تمام قابلِ فخر انسانی طاقتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اپنی آن اور شان پر سب کچھ قربان کر دینے والے آج حالات سے مجبور ہو کر جھک گئے تھے۔ آہ! یہ کیا شرمناک انقلاب تھا؟ کتنا قابلِ رحم نظارہ تھا؟ میں اسے ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکا۔

جن فوجی سپاہیوں نے اب تک اندھی عقیدتمندی کے زیرِ اثر جنگ کیا تھا۔ ان کے دلوں پر یکایک خوف کے بادل چھا گئے۔ اور انکا مستقبل گھٹا ٹوپ تاریکی میں چھپ گیا۔ آئندہ موسم بہار کے خیال سے ان کے دل کانپ اُٹھے۔ میرا دل یہ دیکھ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ کہ ہر ایک جرمن اپنی فوجی طاقت کو مضبوط کرنے کی قوت رکھتا ہوا بھی کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب انہیں یہ بھی امید نہ رہی کہ قوم کی تمام منتشر شدہ طاقتیں پھر اکٹھی ہو کر اپنے دشمنوں پر حملہ کر سکیں گی۔ تب ان کے فتح یاب ہونے کی کیا امید ہو سکتی تھی؟ چنانچہ جب جرمن فوجوں کو متحد ہو کر دشمنوں پر حملہ کرنے کا حکم ملا۔ تو جرمنی میں ایک عالمگیر ہڑتال ہو گئی۔

تمام دنیا ان غیر متوقع واقعات پر انگشت بدنداں رہ گئی۔ دشمنوں نے پھر اپنا پرچار شروع کیا۔ اور انہوں نے اپنی فوجوں میں اس انقلاب انگیز بیداری کو پیدا ہونے سے روکا۔ اپنے سپاہیوں کے ڈوبتے ہوئے دلوں کو سنبھالنے اور ان سے زائل ہونے ہوئے اعتماد کو از سر نو برقرار کرنے کے متعلق انہوں نے ایک آخری

گالیوں کی ایک ایسی گھٹا سی چھائی ہوئی نظر آئی۔ جنگ سے واپس آئے ہوئے
سپاہیوں میں ہر طرف ایک ایسی خصوصیت صاف نظر آتی تھی۔ جو معمولی حالات میں
کسی پرانے تجربہ کار جرنیل کو ہی کسی سپاہی میں نظر آتی ہوگی۔ اسکی بدولت جنگ
کے متعلق عوام کا جوش وخروش بالکل ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ یہاں کے لوگ خوفزدہ ہوکر
پیچھے ہٹ جانا بھی بہادری اور دانائی کی ایک علامت ماننے لگے تھے۔ اور فرض
شناسی کو کمزوری وحماقت سمجھا جاتا تھا +

دفتروں میں ہر جگہ یہودی ہی یہودی نظر آتے تھے۔ سب کلرک یہودی تھے۔
اور ہر ایک یہودی کلرک تھا۔ گویا ہر طرف یہودیت کی ایک فضا چھا رہی تھی حالانکہ
میدانِ جنگ میں وُہ خال ہی خال نظر آتے تھے۔ اس لئے میں انہیں بزدل اور
ڈرپوک کہے بغیر رہ سکتا تھا۔ مجھے دنیا کے میدانِ کارزار میں ان کا یہ طریق عمل
نہایت ہی قابلِ نفرت معلوم ہوا۔ اور میرے لئے انکی شرمناک ہستیوں پر لعنت
نہ بھیجنا ناممکن ہوگیا +

۱۹۱۷ء کے آخر میں سب کارخانوں کے اندر ہڑتال کرادی گئی۔ اسکا مقصد
یہ تھا۔ کہ میدانِ جنگ میں فوجوں کے لئے ضروری سامان نہ بھیجا جا سکے۔ اس میں
اگرچہ متوقع کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر پھر بھی اسپر افسوس ہی ہے۔ عوام کی اخلاقی
طاقت کو تباہ کرنے کا یہ طریقہ کتنا اور کیسا شرمناک تھا؟ کیونکہ سب سے زیادہ قابلِ
غور بات تو یہ تھی۔ کہ ہماری فوجیں کس مقصد کے لئے پرانوں کا بلیدان دے رہی
تھیں؟ کوئی سمجھدار شخص بھی ان سوالات پر سنجیدگی سے غور کرکے انکا جواب سوچنے
کی کوشش نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جن سپاہیوں کو جی توڑ کر فتح کے لئے میدانِ
جنگ میں لڑنا چاہیئے تھا؟ وُہ بھی اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے آج فضول
انیس تباہ سے تھے۔ اور لڑنے والوں کی مذمت کر رہے تھے۔ پھر ان سب باتوں کا

کی بے بنیاد افواہیں سننے میں آئی تھیں۔ جن سے یہ صاف ظاہر تھا۔ کہ جنگ کی صورت
حال نہایت حوصلہ شکن اور مایوسی خیز ہو رہی ہے۔ اور ایسے وقت میں فتح کا خیال تک
بھی حماقت سے کم نہیں۔ اتنے میں یہ خبر پہنچی۔ کہ ملک کی سرمایہ دار حکمران جماعت تو
جنگ جاری رکھنے کے حق میں ہے لیکن عوام اس کے خلاف ہیں۔ اور اس خبر کے
ہر پہلو پر افسروں میں دیر تک بحث مباحثہ جاری رہا۔ شروع میں تو فوجی سپاہیوں
نے اس کی طرف کچھ توجہ نہ دی۔ اور جس طرح چار سال سے وہ میدان جنگ میں ڈٹے
رہے تھے۔ ویسے ہی برابر جمے رہے۔ مگر آخر میں رابرٹ۔ سکیڈمین۔ برتھ۔ لیب
نیٹ وغیرہ افسروں کی کوششیں رنگ لائیں۔ اور حکومت جرمنی کی جنگی پالیسی کچھ
بھی کام نہ آسکی۔ ہم سب حیران تھے۔ کہ یہ چالباز شخص باوجود اپنی ان شرمناک حرکتوں
کے قومی فوج پر اپنے کسی استحقاق کا دعوےٰ کس طرح کر سکتے ہیں؟ +

آغاز جنگ کے زمانے سے ہی میرے سیاسی خیالات نہایت پختہ اور اٹل تھے۔
مجھے قوم کو ہر وقت دھوکا دینے والے ان جو آچور۔ کرایہ کے ٹٹوؤں سے سخت نفرت
ہو گئی تھی۔ میں عرصہ دراز سے یہ دیکھ رہا تھا۔ کہ یہ گروہ قومی اور ملکی بہتری کیلئے
کوئی بھی پُر اثر خدمات سرانجام دینا نہیں چاہتا۔ اسے تو صرف اپنی جیب گرم کرنے کی
فکر پڑی رہتی ہے۔ اور وہ صرف یہی چاہتے ہیں۔ کہ ان کی مطلب براری اور کمینہ خواہشات
کی تکمیل کے لئے ہی جرمن قوم ہر طرح کی قربانیاں کرتی رہے۔ اور اگر ضرورت پڑے
تو اپنی ہستی تک بھی مٹا دے۔ یہ سب باتیں صاف طور سے اپنی نظروں کے سامنے ہوتے
ہوئے دیکھ کر بھلا کس محبِ وطن قوم پرست کا جی نہ جل اٹھے گا۔ اور ان کے خلاف
نفرت سے نہ بھر جائے گا۔ جو یہ سب شرارتیں کر رہے تھے۔ اسی لئے میری نظروں
میں ان کی کچھ بھی عزت نہ رہی تھی۔ اور میں ان کی ناپاک دلی خواہشات کی تکمیل میں کسی
طرح کچھ مدد دینا۔ جرمن فوجوں اور مزدوروں کے مفاد کیسا تھ دشمنی اور غداری سمجھتا

کوشش کی۔ کیونکہ ان کی اس کوشش کی کامیابی پر ہی ان کی فتح کا سب دارومدار تھا۔ اور اسی سے وہ دنیا میں اپنی عزت وعظمت کو قائم رکھ سکتے تھے۔ ادھر برطانی امریکن اور فرانسیسی اخبارات نے اس کوشش کو اور بھی تقویت بخشی اور ادھر مخالف اتحادی فوجوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے دوراندیشی و دانش مندی سے پرچار شروع ہو گیا +

مگر جرمنی آتش انقلاب کے شعلوں کا شکار بن رہا تھا۔ اس کے دوستوں اور ہی خواہوں کو اس کی فتح کے کوئی بھی آثار نظر نہ آتے تھے۔ اور اس کے دشمنوں کے لئے اپنے رقیبوں کو من مانے طور پر کچلنے کا اس سے اچھا موقع اور کونسا ہو سکتا تھا؟ ان سب واقعات کی جڑ تھی۔ ہمارے کارخانوں کی ہڑتال! جس نے ہمارے دشمنوں کی فتح کو یقینی بنا دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے روس کی حالت کو دیکھ کر ان کے دل اپنی ہستی کے خوف سے بھی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہزاروں جرمن سورماؤں کی جانیں فضول ضائع ہوئیں۔ اور کسی کے کرتے دھرتے کچھ نہ بنا۔ انکے اس خون ناحق کی تمام ذمہ داری ان فرض ناشناس لالچی اور ٹکڑ خور ذمہ دار افسروں کے سروں پر ہے۔ جو باغی جرمن قوم کی آئندہ حکومت میں اعلےٰ سے اعلےٰ عہدے حاصل کرنے کی غرض سے اس شیطانی ہڑتال کی تاریں ہلا رہے تھے +

میری یہ خوش قسمتی تھی۔ کہ میں جنگ کے پہلے اور آخری دونوں حملوں میں شریک تھا۔ اور انہوں نے مجھ پر وہ گہرا اثر ڈالا۔ جو عمر بھر رہے گا۔ کیونکہ آخری حملے میں ہماری پالیسی یہی تھی کہ اپنے تحفظ کے ہر خیال کو دل سے دور کر کے دشمن پر سخت حملہ کرتے۔ جیسے بھی ہو۔ اسے تباہ وبرباد کر دیا جائے۔ ۱۹۱۴ء کے واقعات نے بھی ہمیں یہی سبق دیا تھا۔ ۱۹۱۸ء کی سرگرمیوں کے آغاز سے ہی تمام میدانِ جنگ میں ایسی سخت گرمی پڑنے لگی۔ کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ گھر میں پھوٹ پھیل رہی تھی۔ فوجی مرکز دن میں آئے دن طرح طرح

میں نے سنا۔ کہ وہاں بھی ایسی ہی کھلبلی مچ رہی ہے۔ مگر مجھے ہر طرف اس میں صرف چند ایک شرارتی نوجوانوں کا ہاتھ کام کرتا ہوا معلوم دیا۔ غرضیکہ ہسپتال میں ہر شخص جنگ کے جلد ہی ختم ہو جانے کے متعلق ہی اپنا خیال اور اپنی خواہش ظاہر کرتا تھا۔ گویا کہ ہر ایک اسی دن کا منتظر نظر آتا تھا۔ وہاں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو مستقبل قریب یا بعید میں کسی شاندار اور فیصلہ کن جنگ کی خوشخبری کا خواہاں دکھائی دیتا ہو۔ اور اس پر غضب یہ تھا۔ کہ میں اخبار پڑھنے کے بالکل ناقابل تھا۔ کہ اسی میں کوئی حوصلہ افزا خبر پڑھ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا +

نومبر میں یہ بے چینی اور اضطراب اور بھی بڑھنے لگا۔ اچانک ایک دن بالکل غیر متوقع طور پر بحری سپاہیوں سے لدی ہوئی ایک لاری ہسپتال کے سامنے آ پہنچی۔ ہم سب حیرت و استعجاب سے اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ اور ان لوگوں نے بغیر کسی جھجک کے ہمیں بغاوت کے لئے بھڑکانا شروع کر دیا۔ چند یہودی نوجوان اس وقت ہماری قومی زندگی اور آزادی کی عظمت و شان کے تحفظ کا دعوٰے کرتے ہوئے اس وقت جنگ میں ہمارے خود ساختہ لیڈر بن بیٹھے۔ حالانکہ انہیں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی۔ کہ ان میں سے کوئی ایک بھی کسی میدانِ جنگ کے لئے قریب نہیں بھٹکا تھا +

اس طرح میری زندگی کے وہ ایام ان کے ہاتھوں میں بڑے تلخ تجربات برداشت کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ افواہیں روز بروز سچی ثابت ہوتی جا رہی تھیں۔ اور میرا یہ خیال مضبوطی و پختگی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کہ مختلف مقامی واقعات کی خبریں ہی عوام کے دلوں میں بغاوت کی آگ کو پیدا کر کے نیل چھڑک رہی ہیں۔ اور ان غدار مزاج لوگوں کے دلوں میں حکومت و افسری کا خیال پیدا کر رہی ہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن تھا۔ کہ وہ اپنی ملعون کوششوں میں کامیاب ہو جائیں ؟ +

تھا۔ اور بشیار دوسرے سپاہی بھی اس بارے میں میرے ہم رائے تھے +

"اگست اور ستمبر میں ہماری تباہی کی علامتیں صاف نظر آنے لگیں" +

یہانتک کہ دشمنوں کے حملوں کی تیزی و تندی کی نسبت ہماری فوجوں کا خوف و ہراس بدرجہا زیادہ معلوم دینے لگا۔ اور اس کے مقابلے میں سومی اور فلینڈرز کی لڑائیوں کی یاد بالکل ایک خواب و خیال سا دکھائی دینے لگی۔ ماہ ستمبر کے آخر میں ہمارا دستہ پھر تیسری مرتبہ اسی جگہ آپہنچا۔ جہاں ہمارے جانباز نوجوانوں کی والنٹیر فوجوں نے اپنی بہادری اور جانبازی سے دنیا میں ایک تھلکہ سا مچا دیا تھا۔ آہ! ان دنوں کی یادگار بھی کتنی شاندار اور حوصلہ افزا تھی؟ +

سنہ ۱۹۱۶ء کی سردیوں نے ہم میں ایک عجیب زندہ دلی کی روح پھونک دی۔ فوجی سپاہیوں میں ہر طرف سیاسی مباحثے گرم رہنے لگے۔ خانہ جنگی کا زہر یہاں بھی آہستہ آہستہ پھیلتا جارہا تھا۔ اور ہر طرف اس کا اثر نمایاں نظر آرہا تھا۔ ۱۳ اور ۱۴ اکتوبر کی درمیانی شب کو جنوبی محاذ پر جنوبی فوجوں نے گیس برسایا۔ ۱۳ اکتوبر کی شام کو ہمارا دستہ "ٹیبرولک" سے جنوب کی طرف پہاڑی پر مقیم تھا۔ جب کہ ہمیں برابر کئی گھنٹوں تک اس آفت کا سامنا کرنا پڑا۔ آدھی رات کے قریب ہم میں سے بہت جوان زخمی ہوگئے اور کئی تو ہمیشہ کے لئے موت کی گہری نیند سو گئے۔ صبح کے قریب مجھے بھی سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ جو آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی۔ میری آنکھیں جھلسی سی جانے لگیں۔ اور میں ایک اندھے کی مانند ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس جنگ میں یہ میری آخری لڑائی تھی۔ کچھ دیر میں ہی میری آنکھیں انگاروں کی مانند دہکنے لگیں۔ میرے چاروں طرف ایک اندھیرا چھا گیا۔ جلد ہی مجھے "پومیرانیا" کے ہسپتال میں بھیج دیا گیا اور وہاں بھی مجھے ہر طرف بغاوت کی چنگاریاں چمکتی ہوئی دکھائی دیں +

رفتہ رفتہ بحری افواج کی طرف سے بھی ویسی ہی وحشت خیز خبریں آنے لگیں۔

وہ تھی۔ جو مجھے ۴ اکتوبر کی صبح کو برداشت کرنی پڑی تھی۔ اسوقت مجھے دن جتنے خوفناک اور راتیں جتنی بھیانک معلوم ہوتی تھیں۔ وہ سراسر ناقابل بیان ہے۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ میرا سب کچھ لٹ گیا۔ اس حالت کو دیکھ دیکھ کر نفرت کی آگ میرے سینے میں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور ان ملعون کے خلاف میرے غم و غصے کی کوئی حد نہ رہی تھی۔ جو ان افسوسناک بلکہ شرمناک واقعات کے اصلی بانی مبانی تھے +

قیصر ولیم جو صرف جرمنی کے پہلے حکمران تھے۔ جنہوں نے نام نہاد مارکس ازم کے حمایتی بدمعاش یہودی لیڈروں کو اپنا مصاحب بنایا تھا۔ یہی انکی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کہ انہوں نے ان خود غرضوں اور مطلب پرستوں کو پہچانا نہیں۔ اور وہ بے اصول بدباطن ایک ہاتھ سے تو شاہی حکومت کو اپنے قابو میں کرتے رہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں خنجر سنبھالے اس پر وار کرنے کے لئے موزوں موقع تاکتے رہے۔ اسی لئے میرا یہ عقیدہ پختہ ہوگیا کہ یہودیوں سے کوئی سودا یا سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے لئے تو یہ یا وہ کا اصول ہی سب سے ٹھیک ہے۔ اسلئے میں نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا۔ کہ اب میں ایک فوجی سپاہی بنا رہنے کی بجائے ایک سیاسی لیڈر بنونگا +

آخر ۱۰ نومبر کو ایک بوڑھا پادری ہم لوگوں سے کچھ کہنے کیلئے ہسپتال میں آیا۔ ہم سب نے اس کی باتوں کو بڑے غور سے سُنا۔ میں بھی اسوقت وہاں ہی موجود تھا۔ اسکی باتوں کا مجھ پر بہت اثر پڑا۔ اس بوڑھے کی ٹانگیں جوش سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ لیکن وہ نہایت مضبوط لب ولہجے میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ "ہمارے پیارے وطن میں ایک جمہوری حکومت قائم ہوگئی ہے۔ اور "ہوہنزولرن شاہی خاندان" کا تاج وتخت اب کسی صورت میں قائم نہیں رہ سکتا۔ ہم نے اسکی حفاظت کیلئے جو کچھ کیا سب فضول گیا۔ افسوس! بیس لاکھ انسانوں کی قربانی اور ناگفتہ بہ مصائب بھی اسے تباہی وبربادی سے محفوظ نہ رکھ سکیں" +

لیکن آہ! ہمارا وطن عزیز! اسکا کیا حشر ہُوا؟ کیا ہماری سب قربانیاں بے اثر رہیں؟ کیا اسی دن کیلئے ہم نے سب تکلیفیں اُٹھائی تھیں؟ ہمارے تخیل کے سامنے اسوقت جرمنی کی گذشتہ عزت وعظمت کے سوا سب کچھ ہیچ تھا۔ اور رہ رہ کر یہ خیال اٹھتا تھا۔ کہ کیا ہم اپنی شاندار قومی تاریخ کا خیال کرکے اسوقت اپنے قومی فرض کے متعلق کچھ بھی فیصلہ نہیں کرسکتے؟ کیا ہم اپنی اس عظیم الشان زمانہ ماضی کی شان و شوکت سے اپنے زمانہ حال کی عظمت کو دوبالا کرنے کے قابل بالکل ہی نہیں رہے؟ اگر ان سوالات کا جواب "ہاں" میں نہیں دیا جا سکتا تھا۔ تو پھر ہمارے لئے یہ سوچنا نہایت ضروری تھا۔ کہ اب ہمیں اپنی آئیندہ نسلوں کے سامنے کیا مُنہ لے کر واپس جانا چاہیئے؟ آہ! ہم کیسے پنچ۔ کمتنے کمینے۔ کسقدر فرض ناشناس اور کیسے سخت مجرم ثابت ہوگئے تھے؟ +

میں نے اسوقت ان خوفناک واقعات کا اپنے تخیل اور اپنے ذہن میں جتنا بھی صاف وصریح نقشہ کھینچنے کی کوشش کی۔ اتنی ہی میرے سینے میں ایک ایسی آگ سی بھڑکتی اور دھدکتی چلی گئی۔ جسکے مقابلے میں میری آنکھوں کی وہ تکلیف عشر عشیر بھی

جانچ پڑتال کی طرف کچھ کچھ مبذول ہوئی - اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹ ۱ مارچ ۱۹۱۹ء کو ہی صبح کے وقت مجھے گرفتار کر لینے کی کوشش کی گئی - لیکن خوش قسمتی سے جونہی کہ میں نے اس گرفتاری سے بچنے کے لئے اپنے گرفتار کرنے والے تین نوجوانوں پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنی بندوق اٹھائی - وہ گھبرا کر الٹے پاؤں بھاگ گئے - اور میں انکے پھندے سے بچ نکلا - چند روز کے بعد ہی مجھے دوسری رجمنٹ کی بغاوت سے تعلق رکھنے والے واقعات کی تحقیقاتی کمیشن میں شرکت کے لئے حکم ملا - اور یہی میدانِ سیاسیات میں میرا پہلا قدم تھا +

کچھ ہفتے بعد مجھے ڈیفنس فورس (یعنی مدافعت کے بورڈ) کا ایک ممبر بنا دیا گیا - جس کا فرض تھا - کہ وہ سب اعلےٰ فوجی افسروں کو حکومت کے متعلق فیصلوں سے ہروقت مطلع رکھے - تاکہ دوسرے شہریوں کی مانند اپنے اور اپنے ماتحت سپاہیوں کے خیالات کو پاک وصاف رکھ سکیں - جہاں تک اس کام سے میرا تعلق تھا میری نظروں میں اس کی قدر وقیمت صرف اتنی ہی تھی - کہ اس کی بدولت مجھے اپنے ہمخیال چند دوستوں سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا رہتا تھا - اور میں ان کیسا تھ حالات موجودہ کے متعلق ہر سوال کے مختلف پہلوؤں پر خوب بحث کر کے انہیں اپنے ہمخیال بنا سکتا تھا - کیونکہ ہم سب کو یہ پورا پورا یقین تھا - کہ اس وقت جرمنی اس تباہی و بربادی سے کسی طرح نہیں بچ سکتا - جو آہستہ آہستہ اس کے قریب آرہی ہے - اور اسکی تمام ذمہ داری مرکزی پارٹی کے ممبروں یا اُن مجلسی جمہوریت کے نام نہاد شیدائیوں پر ہے - جنہوں نے ماہ نومبر میں انقلاب کی آگ بھڑکائی تھی - چنانچہ ہم سب کافی دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے - کہ متذکرہ بالا لوگ کتنے ہی بھلے بن کر کیوں نہ آجائیں - وہ انکے نقصانات کی کسی طرح بھی تلافی نہ کر سکیں گے - جو ان کی حماقت اور غلط کاریوں سے اس وقت تک جرمنی کو پہنچ چکا تھا - آئندہ جس کے

میری سیاسی زندگی کا آغاز

(۸)

نومبر ۱۹۴۰ء کے آخر میں میونچ پہنچ کر میں اپنی رجمنٹ کی "ریزرو بٹالین" میں شامل ہو گیا۔ جو اس وقت ایک فوجی بورڈ کی ماتحت تھی۔ اس وقت مجھے سب باتیں اتنی غیر مرغوب و ناپسندیدہ محسوس ہو رہی تھیں۔ کہ میں نے جلد سے جلد اس فوجی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور میں کسی طرح کچھ انتظام کر کے اپنے دلی و قابل اعتماد دوست شمٹ آرنسٹ کے ہمراہ ٹرونسٹین چلا گیا۔ اور جب تک فوجی کیمپ نہیں ٹوٹا تب تک وہیں رہا۔

مارچ ۱۹۱۹ء میں ہم دونوں میونچ واپس آ گئے۔ وہاں کی فضا ہمیں نہایت مایوسی خیز معلوم ہوئی۔ اور مستقبل قریب میں ہی ہمیں ایک اور انقلاب کے زبردست آثار نظر آنے لگے۔ ایسنر کی موت کے بعد صورت حال کچھ تبدیل ہوتی ہوئی سی دکھائی دی اور آخر میں (فوجی) کونسل کی طاقت مضبوطی پکڑ گئی۔ جسے لوگ یہودی حکومت سے بدرجہا بہتر سمجھنے لگے۔ یہ خیال خصوصاً ان لوگوں کا تھا۔ جنہوں نے ملک میں بغاوت کی آگ پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر میرے دل و دماغ سے اس وقت گذشتہ واقعات اور آئندہ کام کرنے کے پروگرام کا سلسلہ کچھ ایسا ٹوٹا تھا۔ کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی اسکا تار نہ جڑ سکتا تھا۔

اس نئے انقلاب کے بعد ہی میری توجہ مرکزی کونسل کے اعمال و افعال کی

اس طرح ہم نے ان سبھی باتوں میں اصلاح کی۔ جو اُس وقت ہمیں انسانی طریق کار کی عمدگی اور خوش اسلوبی میں رخنہ انداز ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس وقت سرمایہ کی قومی اہمیت یہ تھی۔ کہ اسے پورے طور پر قومی عظمت قومی طاقت اور قومی آزادی پر منحصر رہنا پڑتا تھا۔ ہر ایک ملک و قوم میں محنت اور سرمایہ کے باہمی اتحاد کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ قوم کا سنگٹھن مناسب شکل وصورت میں پایۂ تکمیل پہنچایا جائے۔ اور جو قوم اس بنیادی اصول کی پیروی کرتی ہوئی معمولی طریقوں سے سرمایہ پیدا کر کے اسے اس کام میں صرف کرتی ہے۔ صرف وہی اپنی قومی ہستی کی تکمیل اور اس کی عظمت و اہمیت کی قائمی و برقراری میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ تمام ملکی سرمایہ کا اسطرح قوم پر انحصار رکھنا ہی کسی قوم کو مضبوط طاقتور اور آزاد رکھ سکتا ہے +

اس نقطۂ نظر سے سرمایہ کے متعلق ہر ایک قوم کا فرض نہایت صاف اور سیدھا سادا ہے اور وُہ یہ کہ "سرمایہ ہر پہلو سے قومی ضروریات اور قومی مقاصد کا غلام بنا رہے اور قوم پر اسکا کوئی دباؤ زور یا اثر نہ ہو"۔ ان دونوں باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے ہی ہر قوم کے دو محدود سے مقصد ہو جاتے ہیں۔ ایک تو خالص قومی نقطۂ خیال سے کامل آزادی کیساتھ ملکی حکومت کا چلانا اور دوسرے باشندگانِ ملک اور قومی کارکنوں کے مجلسی حقوق کو ہر پہلو سے محفوظ رکھنا"

اس سے پہلے یہ میری طاقت سے بالکل باہر تھا۔ کہ میں سخت محنت و مشقت کے ذریعہ پیدا کردہ سرمایہ اور تجارتی کاروبار سے حاصل کردہ دولت و ثروت کے درمیانی فرق میں کوئی تمیز یا تخصیص قائم کر سکوں اور نہ مجھے یہ معلوم تھا۔ کہ ان دونو طرح کے سرمایہ پر کن پہلوؤں سے غور کر کے ان میں تمیز و تخصیص قائم کرنی چاہیئے۔ خوش قسمتی سے گوٹ فریڈ فیڈر کی چند تقریروں نے میری ان تمام مشکلات کو بہ آسانی حل کر دیا۔ اسکی پہلی تقریر سنتے ہی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا۔ کہ اب میں نے ایک نہایت

پہنچنے کا سخت احتمال - ان شرارتیوں نے "بورجیوس نیشنل" نام سے اپنی ایک پارٹی قائم کر رکھی تھی - اور وہی ان شرارتوں کی جڑ تھی +

ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے بھی ایک ایسی پارٹی بنانے کے سوال پر خوب بحث کی - آخر ہم نے اس کے وہی اصول قائم کئے - جو بعد میں جرمن ورکرز پارٹی کے ہوئے - اس نئی پارٹی کا افتتاح ایسی شان کیساتھ کیا گیا - کہ اسکی طرف سب کی توجہ کھچ گئی - کیونکہ اگر اس میں اس بات کی کمی رہ جائے - تو ہماری سب کوششیں فضول تھیں - ہم نے اس پارٹی کا نام مجلسی انقلاب پسند پارٹی رکھا +

اس کی وجہ یہ تھی - کہ اس کے مجلسی خیالات حالات موجودہ میں ایک زبردست انقلاب کی تائید و حمایت کرنے والے تھے - ماسوائے اس کے ایک اور نہایت اہم وجہ یہ بھی تھی - کہ اپنے آغاز شباب سے ہی اقتصادی گتھیوں کو سلجھانے میں میں نے جو مغزپچی کی تھی - اس کا نتیجہ یہ ہوا - کہ مختلف اقتصادی مسائل کے متعلق بھی میرے خیالات ایسے پختہ و مضبوط ہو گئے تھے - جیسے کہ بعض ضروری مجلسی یا سیاسی مسائل پر - لیکن پختگی ان میں اسی وقت پیدا ہوئی تھی - جب کہ مجھے بین الاقوامی اتحاد کے متعلق جرمنی پالیسی کے ہر پہلو پر غور کرنے کا پورا پورا موقع ملا - اسی کا یہ انجام ہوا - کہ میرا نقطۂ خیال ہماری قومی ضروریات کے کسی ایک پہلو تک ہی محدود نہ رہا - بلکہ ان کے سبھی پہلوؤں پر مناسب غور و خوض کرنے کی طاقت و وسعت اس میں پیدا ہو گئی - ورنہ شاید پہلی صورت حال بہت سی اقتصادی غلطیوں کا باعث ثابت ہوتی اور ہم ان اہم مسائل کو کسی طرح بھی حل نہ کر سکتے - جن کا آئندہ جرمن قوم کی روٹیوں کے سوال سے بہت گہرا تعلق تھا - کیونکہ باقی سب مسائل محض اسی ایک خیال کی بنیاد پر قائم تھے - کہ سرمایہ صرف محنت مزدوری کا پھل ہے - بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ محنت مزدوری ہی ایک اصلی چیز ہے" +

جنگ وجدل کی ضروریات کی بدولت جرمنی کبھی بین الاقوامی سرمایہ کے خلاف جد وجہد نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اس وقت جنگ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اور تمام صلح نامے و عہدنامے ردی کاغذوں کی طرح کس مپرسی کی حالت میں پڑے سڑ رہے تھے +

اب میرے اور دوسرے قوم پرست سوشلسٹوں کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا۔ وہ یہ کہ مادر وطن کی عزت و عظمت کی حفاظت کس طرح کی جائے۔ کیونکہ اپنی نسل اور اپنی قوم کی ترقی۔ اپنی ہستی اور اپنے بال بچوں کی۔ اپنے خون کی پاکیزگی۔ اپنی مادر وطن کی آزادی۔ اپنے ذاتی اعتماد نیز جرمن قوم کو ایشور کی طرف سے جو گیان عطا ہوا ہے ان سب کی عزت و عظمت کی حفاظت کے لئے ہی جنگ و جدل کرنا ہے۔ ہم نے اپنا ایک واحد مقصد سمجھ لیا تھا۔ اور اس کے سوا ہم کسی بھی فضول جھگڑے یا جھنجٹ میں پڑنا ہرگز پسند نہ کرتے تھے +

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر ہی میں پھر مطالعہ کرنے لگا۔ اس مرتبہ کے مطالعہ میں مجھے یہودی کارل مارکس کے تمام احکام اور اس کے خیالات و جذبات اپنے حقیقی روپ میں نظر آ گئے۔ اسی زمانے میں اس کی مشہور تصنیف "کیپٹل" (سرمایہ داری) کا بھی میں نے بغور مطالعہ کر کے اسے خوب اچھی طرح سمجھنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اور ساتھ ہی اس کے سوشلزم اقتصادی پہلو یعنی سرمایہ داروں کے خلاف اس کی تمام جد وجہد کی اصلی وجوہات کو جان لیا۔ کیونکہ ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں۔ کہ سٹاک ایکسچینج یعنی سرمایہ داروں کی بین الاقوامی دولت و ثروت کی عظمت و اہمیت کو قائم رکھ کر غریب محنت کش اور فاقہ مست مزدوروں کو ہمیشہ ان کے گاڑھے پسینوں کی کمائی سے محروم رکھا جائے +

ایک خاص واقعہ سے بھی مجھے اپنے اس کام میں بہت کچھ مدد ملی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دن میں نے اپنی تقریر کا اعلان کرا دیا۔ جو لوگ اس روز میری تقریر سننے آئے

ہی مفید اور کار آمد مسئلہ کے مناسب حل کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔ اور اُسی کی بنیاد پر ہماری نئی پارٹی کی تنظیم کی جاسکتی ہے +

اِس پر غور کرتے ہوئے میں بہت ہی جلد یہ سمجھ گیا۔ کہ یہ تو صرف ملی صداقت و بے غرضی کا سوال ہے۔ جو زمانہ مستقبل میں جرمن قوم کے لئے بہت ہی مفید و منفعت بخش ہوسکتا ہے۔ ملک کے قومی سرمایہ کو اگر سٹاک ایکسچینج سٹہ بازی کے طور پر مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے حصص کی خرید و فروخت) کے سرمایہ سے الگ نہ رکھا گیا۔ تو اسکی بدولت جرمنی کے بین الاقوامی اقتصادی مسائل کو حل کرنے میں ہمیشہ مشکلات پیدا ہوتے رہنے کا امکان قائم رہے گا۔ یہ راز ہم بہت اچھی طرح سمجھ گئے۔ لیکن چونکہ ابھی سے اسکے خلاف کسی طرح سے کوئی رگڑ پیدا کر کے آزاد قومی ہستی کے حصول میں نئی دقتیں بھی نہیں پیدا کی جاسکتی تھیں۔ اس لئے فی الحال ہم اس کام کے لئے بہترین موقع کی انتظار میں خاموش رہے +

اب مجھے جرمنی کی آئندہ قومی ترقی کے ذرائع صاف صاف نظر آنے لگے۔ کیونکہ انکا مقصد اتنا دشمن اور بدخواہ اقوام سے مقابلہ کرنا نہ تھا۔ جتنا کہ بین الاقوامی اور اقتصادی جنگ سے پہلو بچانا۔ اور ہر وقت اس کے خلاف مردانہ وار جدوجہد کرنا۔ انکی تقریروں نے اس آئندہ جدوجہد سے مجھے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ اور اب میں اس سے بچنے یا اسمیں پھنس جانے پر اُسکا مقابلہ کرنے کے طریقوں پر غور و خوض کرنے لگا +

حالت موجودہ میں ہمارا گذشتہ عروج و عظمت یہ ثابت کرتا تھا۔ کہ زمانہ ماضی میں بھی ہمارے تجربات و قیاسیات کتنے صحیح و معقول تھے۔ جنکے باعث بے وقوف کوتہ اندیش اور فرقہ پرست مدبروں کو جو ہمیشہ ہی ہمارے مخالف رہے ہیں۔ ہمارا مذاق اڑانے کا موقع کبھی نہیں ملا۔ اگرچہ وُہ بھی اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مگر اپنی بہانہ سازیوں اور دروغ بافیوں کی بدولت وُہ ہمیشہ یہی ظاہر کرتے رہے۔ کہ

الوطنی کی ایک ناقابلِ تسخیر سپرٹ پھونکنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور ان کے معمولی فوجی نظام و تربیت کو میں نے قوم و ملک کے لئے ایک نہایت زبردست طاقت و قوت بنا دکھایا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے اپنی ایک زبردست نئی پارٹی بھی ایسی قائم کرلی۔ جس کے ہر ممبر کے خیالات میرے ہی جذبات کا آئینہ تھے۔ اسی پارٹی نے بعد میں مجھے اپنی نئی تحریک کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرکے اپنا دلی مقصد حاصل کرنے میں پوری پوری مدد دی۔ اسکی تفصیلات اگلے باب میں ملاحظہ کیجئے +



ان میں سے ایک شخص نے یہ سمجھا۔ کہ میں یہودیوں کے خلاف تقریر کر رہا ہوں۔ اس لئے وہ مجھے بیچ بیچ میں دخل دیکر میرے مضمون کے خلاف اپنی لمبی چوڑی دلیلیں پیش کرنے لگا۔ میں تو کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہی تھا۔ اس طرح ایک اچھی بحث سی چھڑ گئی۔ اور میں نے بھی خوب ان لوگوں کی قلعی کھولی۔ حاضرین میں سے بھی اکثر میرے ہمرائے ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اسوقت میونچ میں جو فوجی رجمنٹ مقیم تھی۔ اس کے سپاہیوں کو تعلیم دینے کا کام میرے سپرد ہو گیا۔

فوجی سپاہیوں میں نظام وترتیب کی بہت کمی تھی۔ اور وہ فوجی بورڈ کی حکومتی پالیسی کی بدولت سخت مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ میں نے خیال کیا۔ کہ آہستہ آہستہ اُن کی مدد سے ہی موجودہ طریق حکومت میں بہت کچھ تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اُس میں نہایت ہی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ اسلئے اب تک انہوں نے اپنے سابق استاد کرنل ایس کر سے جو کچھ سیکھا تھا۔ اسکی بنا پر ہی میں نے انہیں فوجی نظام وترتیب اور فرمانبرداری کی پوری پوری تعلیم دینے لگا۔ کیونکہ اس وقت یہ نہایت ضروری تھا۔ کہ کم از کم ہر ایک فوجی سپاہی کو یہ سوچنے اور سمجھنے کے قابل بنا دیا جائے۔ کہ وہ بھی اپنی قوم اور مادرِ وطن کا ایک خدمتگذار سپوت ہے۔ اسلئے میں نے اپنی تمام کوششوں کو ہی ایک کام پر مرکوز کر دیا۔ اور نہایت ہی دلی محبت ومحنت سے انہیں پڑھانے لگا۔ چنانچہ اب میں کمال فخر سے یہ دعوئے کر سکتا ہوں۔ کہ مجھے اپنی ان کوششوں میں کامیابی بھی خاطر خواہ ہوئی۔

غرضیکہ اپنی طاقتِ گویائی کے اثر سے میں نے سینکڑوں ہی نہیں۔ بلکہ ہزاروں ہموطنوں کے دلوں میں اپنی قوم اور اپنی مادرِ وطن کی عزت وعظمت کا ایک زبردست خیال پیدا کر دیا۔ آہستہ آہستہ اُن کے سینوں میں ان دونوں کے لئے ہی سچی محبت و الفت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اور اسطرح میں تمام فوجوں میں قوم پرستی وحُب

مخالفت کرنے کے حق میں اپنی آواز اٹھانے کی ضرورت پڑی تھی +

مندرجہ بالا سنٹرل پارٹی جو اپنی اندرونی کمزوریوں کے باعث حقیقتاً آج کل اپنی آخری گھڑیاں گن رہی تھی - اس طرح فوج کے ایک مرتبہ پھر پہلے کی مانند ملکی تحفظ کے لئے مضبوط طاقتور ہو جانے کو اپنی ہستی کے لئے نہایت خطرناک سمجھنے لگی اور اس کے لیڈر بین الاقوامیت کے شیدائی سوشلسٹوں کے ساتھ مل کر بجائے خود قوم پرستی اور حب الوطنی کے زہر کو فوج کے جسم سے خارج کرنے کی مکروہ کوششوں میں مصروف ہو گئے - کیونکہ وہ دونوں ہی یہ اچھی طرح جانتے تھے - کہ اس نام نہاد زہر کی موجودگی فوج کو بھی محکمہ پولیس کی مانند غدار حکومت کے ہاتھوں کی کٹ پتلی ہرگز نہ بننے دیگی اور جرمن فوجیں گذشتہ چند برسوں کی مانند پھر عین وقت پر ملک و قوم کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے ناقابل ہرگز ثابت نہ ہو سکیں گی +

موجودہ ملکی و قومی ضروریات کے ان سب پہلوؤں پر پورا پورا غور کر کے میں نے بھی "جرمن ورکرز پارٹی" کے آئندہ جلسے میں اول سے آخر تک شریک رہنے کا پختہ فیصلہ کر لیا - حالانکہ مجھے اس جلسے کے اندرونی اغراض و مقاصد کا کچھ بھی علم نہ تھا - فیڈر کی تقریر سن کر مجھے بہت ہی خوشی حاصل ہوئی - کیونکہ اس نے بہت سی ایسی باتیں صاف کر دیں جو اس وقت میری سمجھ میں اچھی طرح نہ آئی تھیں - بعد ازاں میں واپس جانیکی سوچ ہی رہا تھا - کہ اور بھی چند تقریروں کے متعلق جلسے میں اعلان کر دیا گیا - اسلئے میں وہیں ٹھہر گیا - لیکن دیر تک کوئی خاص تقریر نہ ہوئی - اور کاروائی پھیکی سی رہی - مگر پھر ایک پروفیسر صاحب نے کھڑے ہو کر اپنی تقریر میں فیڈر کے خیالات پر کچھ اعتراضات جڑ دیئے - جنکا جواب دینے کیلئے فیڈر کو پھر کھڑا ہو کر یہ اچھی طرح ظاہر کرنا پڑا کہ اس نوجوان پارٹی کی قائمی حقیقی اور مضبوط بنیادوں پر ہوئی - اور پرشیا کی غلامی سے بویریا کو آزادی دلانا ہی اس پارٹی کا اصلی منشا ہے +

جرمن ورکرز پارٹی

(۹)

ایک دن مجھے اپنے صدر دفتر سے حکم ملا۔ کہ میں ایک سیاسی پارٹی کی کار گذاریوں پر خفیہ طور سے نظر رکھوں۔ اس پارٹی کا نام "جرمن ورکرز پارٹی تھا" چند روز میں ہی اسکے زیر اہتمام ایک پبلک جلسہ ہونے والا تھا جن اصحاب کو اس جلسے میں تقریریں کرنا تھیں۔ ان میں گوٹ فریڈ فیڈر کا کام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جس کا میں پہلے ہی تذکرہ کرچکا ہوں۔ مجھے یہ حکم دیا گیا تھا۔ کہ میں اس جلسے میں شامل ہو کر اس کی کاروائی رپورٹ کروں۔ اور یہ اطلاع دوں۔ کہ اس پارٹی کے متعلق عوام کی رائے کیسی ہے؟ +

سیاسی پارٹیوں کے کاموں میں فوجی سپاہیوں کی یہ دلچسپی کچھ حیرت انگیز نہ تھی کیونکہ گذشتہ انقلاب کے اثر کے طور پر ہر ایک فوجی سپاہی کو ایک ترقی کُن مدبر بننے کا حق حاصل ہو چکا تھا۔ اور ہر نکمّے سے نکمّے اور معمولی سے معمولی سمجھ بوجھ والے سپاہی نے بھی اپنے اس حق سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ سنٹرل پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی نے بڑی شرم اور تکلیف کیساتھ یہ محسوس کیا۔ کہ کس طرح فوجی سپاہیوں کی ہمدردی ان باغی اور غدار جماعتوں کیطرف سے پھرتی جاتی ہے۔ اور قومی تحریک میں حصہ لیکر ملک و قوم میں پھر ایک نئی زندگی پیدا کرنے کے سوال میں پوری پوری دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان غدار پارٹیوں کو فوجوں کا حق رائے دہی چھیننے اور انہیں سیاسیات میں حصہ لینے کی

والے ہیں۔ اسلئے میں نے اپنے خیالات کے اظہار کو آخری وقت ملتوی رکھا اور سب کاروائی چپ چاپ دیکھتا سنتا رہا۔ آخر کچھ دیر بعد صدر اعلےٰ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ یہ وہی پروفیسر صاحب تھے۔ جنہوں نے پہلے جلسے میں مسٹر فیڈر کی تقریر پر اعتراض کئے تھے۔ اس سے مجھے اور بھی پُرشوق حیرت ہوئی۔ اور میں نہایت اشتیاق سے سب کاروائی دیکھنے لگا کچھ دیر میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صدر اعلےٰ صاحب کا اسم مبارک ہیر (مسٹر) ہیرر ہے۔ اور شاخ میونخ کے صدر کا نام نامی ہیر اینٹن ڈریکسلر! +

اب باقاعدہ اجلاس شروع ہوا۔ سب سے پہلے رسمی طور پر گذشتہ اجلاس کی کاروائی پڑھے جانے کے بعد اس میں حصہ لینے والے اصحاب کا شکریہ ادا کیا گیا۔ بعدازاں نئے ممبران کے داخلے کی باری آئی۔ اور میرا نام ممبری کے لئے پیش کیا گیا۔ تب میں نے اپنے اطمینان کے لئے پے درپے سوالات شروع کئے۔ مگر چند بڑے بڑے خاص اور بنیادی اصولوں کے سوا تب تک وہاں اور کچھ بھی نہ تھا یعنی نہ تو جلسے یا پارٹی کا کوئی خاص پروگرام ہی بنا تھا۔ اور نہ کوئی چھپا ہوا پرچہ یا کوئی اور چیز ہی تھی۔ حتیٰ کہ ربڑ کی مہر تک بھی نہ تھی۔ لیکن سب سے گرانبہا اور بیش قیمت چیز جو وہاں موجود تھی۔ وُہ دلی اعتماد اور باہمی خیر اندیشی کے اظہار کی سپرٹ تھی جس کا مجھ پر بہت ہی اثر ہوا +

میں حاضرین کے خیالات کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ اور مجھے معلوم ہوا۔ کہ ابھی تک وہ سب کے سب ہی ایک کسی ایسی نئی تحریک کی تلاش میں ہیں۔ جو لفظی معنوں کے لحاظ سے پارٹی کے محض نام کی نسبت حقیقتاً عظمت و اہمیت رکھتی ہو۔ اب میری زندگی کا یہ نہایت اہم سوال میرے سامنے پیش ہوا۔ کہ میں اس پارٹی میں شریک ہوں یا نہ ہوں۔ اس موقعہ پر میری آیندہ قسمت بھی کچھ پُرمعنی اشارے

میری رائے میں اس موقع پر فیڈر نے اپنے خیالات کے اظہار میں کسیقدر غلطی کھائی تھی۔ کیونکہ بات درحقیقت یہ تھی۔ کہ اگر بویریا پرشیا کی غلامی سے آزاد ہو بھی جاتا تو آسٹریا کی غلامی میں پھنس کر اسکا حال شاید جرمن آسٹریا جیسا ہی افسوسناک ہو جاتا۔ اس صورت میں بھی اگر وہ جرمن آسٹریا کے ساتھ شامل ہو کر آسٹریا کی غلامی سے بھی نجات حاصل کر لیتا۔ تب تو جرمنی کا اندرونی امن و امان پہلے کی نسبت کسی قدر بہتر صورت اختیار کر سکتا۔ چنانچہ میں نے بھی اس سوال پر اپنی رائے ظاہر کرنے کیلئے صاحب صدر جلسہ سے اجازت طلب کی۔ جو مجھے بسہولت مل گئی۔ اور مجھے اپنا مطلب صاف کرنے اور حاضرین کو سمجھانے میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی۔ کہ صاحب صدر خود بھڑک اُٹھے۔ اور جوش مسرت میں انہوں نے میری پیٹھ ٹھونک کر مجھے شاباشی دی +

اس دن میں نے اپنے فرصت کے لمحوں میں اس سوال پر کئی بار غور کیا۔ اور اس کے ذکر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا عہد کر لیا۔ مگر اس واقعہ کے چند روز بعد ہی مجھے یہ اطلاع ملی۔ کہ "جرمن ورکرز پارٹی" کی ممبری کے لئے میرا نام تجویز کیا گیا ہے۔ اس لئے مجھے آئندہ بدھ کے دن اس کی ورکنگ کمیٹی میں شریک ہونا چاہیئے۔ ممبر بھرتی کئے جانے کے اس انوکھے طریقے پر مجھے بہت تعجب ہوا۔ اور میں یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ اپنے یوں زبردستی ممبر بنائے جانے پر اظہار مسرت کروں۔ یا اس کا مذاق اڑاؤں۔ کیونکہ اس طرح کسی مقامی جماعت میں شریک کئے جانے کا خیال اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی میرے پاس نہ پھٹکا تھا۔ مگر سوچ کر آخر میں نے یہ دعوت منظور کر لی +

بدھ وار کا دن بھی آگیا۔ اور جلسہ گاہ میں پہنچ کر مجھے یہ معلوم کر کے خوشی بھی ہوئی۔ کہ آج کے اجلاس میں تحریک کے صدر اعلےٰ بھی بذات خود شریک ہونے

کی ہو حق میں پڑے رہنے کی فکر میں ہی ہمیشہ غلطان و پیچاں نظر آئیں +

آخر دو دن کے گہرے سوچ وچار کے بعد اس نئی تحریک میں شریک ہونے کا فیصلہ کر کے میں "جرمن ورکرز پارٹی" کا ممبر بن گیا - اور مجھے پارٹی کی طرف سے ساتویں نمبر کا ایک ٹکٹ مل گیا +



کرنے لگی +

اب تک میں کسی بھی مقامی انجمن میں کیوں شامل نہ ہوا تھا۔ اسکی اصلی وجوہات پر میں کبھی پھر مفصل روشنی ڈالونگا۔ اس وقت مجھے اس عجیب وغریب جماعت کی ممبری خاص طور پر کچھ فائدہ مند محسوس ہوئی۔ کیونکہ اس کے ممبروں کی تعداد بھی بہت ہی محدود تھی۔ اور اسکی شرائط ممبری بھی کچھ بہت زیادہ سخت نہ تھیں۔ ہر ممبر کو ذاتی طور پر اپنی قابلیت و لیاقت کے اظہار کا موقع بھی دیا جاتا تھا۔ پھر وہ زمانہ بھی کچھ کام کر دکھانے کا تھا۔ اس لیے اس چھوٹی سی تحریک کے آئیندہ خاطرخواہ طور پر ترقی و نشوونما حاصل کرنے کا امکان بھی کچھ تھا۔ ابھی تو اس کے منشاء و مدعا اغراض و مقاصد اور آئیندہ طریق عمل پر غور وخوض کرکے اس کا فیصلہ کرنے کا ابتدائی مرحلہ ہی درپیش تھا۔ جو کسی قائم شدہ بڑی پارٹی کی صورت میں اسکی پیدائش کے ایک عرصہ دراز کے بعد پھر کبھی آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اسے پہلے سے ایک تصفیہ شدہ حقیقت مان لیا جاتا ہے +

میں نے اس سوال پر جتنا بھی زیادہ غور کیا۔ اتنا ہی میرا یہ یقین زیادہ پختہ ہوتا گیا۔ کہ مستقبل قریب میں ایسی ایسی کئی چھوٹی چھوٹی تحریکیں قوم و ملک کی رہنمائی و رہبری کی دعویدار بننے والی ہیں۔ کیونکہ وہ پرانی اور بوسیدہ دقیانوسی جماعتیں جو ایک عرصہ دراز سے پارلیمنٹری لکیر کی فقیر بن رہی ہیں۔ ضروریات زمانہ کے مطابق اپنی موجودہ صورت میں خاطرخواہ تبدیلی کرنے کے قطعی ناقابل ہیں۔ اور ان کی تمام توجہ اس وقت پالیسی بازی کی ناکارہ بنیادوں پر نئے نئے اور فضول قوانین وضع کرنے میں ہی صرف ہو رہی ہے۔ حالانکہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی۔ کہ وہ ملک و قوم کی آئیندہ ترقی و نشوونما کو مدنظر رکھ کر بالکل ایک نیا اور زندگی بخش پروگرام ملک کے سامنے رکھتیں۔ نہ کہ ہی پرانے ڈھرے پر انتخاب

ہے۔ اور تقریباً سبھی لوگ انفرادی طور پر اس سے متاثر تھے۔ جو مصیبت نازل ہوتی تھی۔ اس کی یہی ایک وجہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی اکثر آدمی اس کا اندرونی راز سمجھنے اور پہچاننے سے قاصر رہتے تھے۔ اسی لئے عوام کے سامنے ان بواعث کو دور کرنے کا سوال کبھی پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔

مگر پھر بھی ملک کے زیادہ تر اہل رائے اصحاب اقتصادی خستہ حالی کو ہی اس کا باعث خیال کرتے تھے۔ اور ان کی رائے میں ملک کی مالی حالت کو بہتر بنانا ہی اسکا ایک واحد علاج تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اب تک ان کے کرتے دھرتے کچھ بھی نہیں بنا سکے تھے۔ اور "ہنوز روز اول" کا سا ہی معاملہ تھا۔ کیونکہ جب تک ہم یہ نہیں سمجھ لیتے۔ کہ اقتصادی صورت حال کا انحصار بھی قومی اور سیاسی حالات پر ہی ہوتا ہے۔ تب تک موجودہ بد حالی کی اصلی وجوہات کسطرح ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں؟ یا اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ ہماری بدقسمتی کا سب سے زیادہ صاف نمایاں اور قابل یقین باعث میدان جنگ میں ہماری شکست کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

بلاشک وشبہ اکثر لوگ اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے تیار تھے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے تھے۔ جو محض ایک "ڈھکوسلہ" خیال کرتے تھے۔ بلکہ کئی ایک تو اسے ایک "سفید جھوٹ" ظاہر کرنے میں بھی کچھ پس وپیش نہ کرتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر حکومت کی ناند میں کھانے والے کتے ہی تھے۔ جو کھاتے بھی تھے۔ اور غراتے بھی! لیکن کیا ان بین الاقوامی اتحاد کے پرچاروں نے خود ہی یہ اعلان نہ کیا تھا۔ کہ جرمنی کی شکست سے جس کی ڈاٹی اس کی بھینس . . . کے فوجی اور وحشیانہ اصول کا خاتمہ ہوگیا ہے؟ کیا اس تمام بغاوت اور انقلاب کی بنیاد اسی ایک غلط خیال پر نہ تھی۔ لیکن حقیقت یہ تھی۔ کہ اسی قومی خودداری اور قومی عزت وعظمت کے تحفظ کی پالیسی سے جرمن قوم اپنے ملک میں اور اس سے باہر دنیا بھر میں اپنی آزادی کا نقارہ پیٹنے کے قابل تھی۔ ان حقائق کی موجودگی میں بھی کیا

سابقہ حکومت کی تباہی کی وجوہات

(۱۰)

جن بواعث سے زمانے میں جرمن قوم اور پارلیمینٹ (ریشتاغ) طرح طرح کی مصیبتوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ وہ اتنے اہم اور عظیم تھے۔ کہ ان کی طرف سے ہمیشہ یہ ہی خوف بنا رہتا تھا۔ کہ یہ آئندہ بھی ہماری کوششوں کو اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے دینگے یا نہیں ؟ اگرچہ حالات موجودہ میں پہلی عظمت وشان کو حاصل کرنا تو کسی طرح بھی ممکن نہ معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ موجودہ حالت کے مقابلے میں قدیم شان وشوکت کا خیال بھی ایک دل پسند خیال سے بڑھ کر وقعت نہ رکھتا تھا۔ اور اس نے بار بار دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ہم لوگوں کی آنکھوں میں زمانہ گذشتہ کے عروج وجلال کے خیال سے اب تک ایسی چکا چوند کیوں چھا رہی ہے۔ کہ ہم ان وجوہات وبواعث کا پتہ تک لگانے کی بھی کبھی کوشش نہیں کرتے ؟ جو ہمارے اس شان دار ماضی کی تباہی کا موجب ہوئے ہیں۔ اور جواب بھی کسی نہ کسی صورت میں لازمی ولابدی طور پر ہم میں موجود ہیں ؟

اگرچہ وجوہات نمایاں تھیں۔ مگر پھر بھی ایسے شخص بہت کم تھے۔ جنہوں نے انہیں معلوم کرنے یا ان سے کچھ سبق سیکھنے کی کوشش کی ہو۔ حالانکہ پہلے کی نسبت آجکل ان سے پوری پوری واقفیت حاصل کرنا نہایت ضروری تھا۔ جرمنی کی زیادہ تر شہری آبادی تو صرف یہ سمجھتی تھی۔ کہ ملک کی تمام کمزوری عوام کے افلاس و ناداری کا نتیجہ

کے آغاز سے ہی انکی فوجی طاقت جرمنوں کی نسبت بہت زیادہ رہی تھی - پھر اپنی دانائی و دوراندیشی سے انہوں نے سامانِ جنگ جمع کرنے میں دنیا بھر کی ہمدردی و معاونت حاصل کر لی تھی۔ مگر پھر بھی ایک طرح جرمن سورماؤں نے برابر چار سال تک دنیا بھر کی تمام مجتمع طاقتوں کے مقابلہ میں کمال بہادری و جرأت کیساتھ جنگ کر کے جو شاندار اخلاقی فتح حاصل کی تھی - اسے ہم محض اپنے بہادر جرنیلوں کو بدنام کرنے والوں کی خوشی حاصل کرنے کے لئے ہرگز نہیں بھول سکتے۔ جرمن فوج کا نظام اور اس کے بہادر جرنیلوں کی طاقت رہنمائی دنیا بھر کی نظروں میں بے نظیر و لاثانی ثابت ہو کر سب سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس لئے جنگ میں ہماری شکست کی وجہ "نوشتہ تقدیر" کی بجائے کچھ بدذات و بد باطن انسانوں کی عداوانہ و شرارت آمیز رخنہ اندازیاں ہی کہی جا سکتی ہیں +

لہٰذا ہماری موجودہ بدقسمتی کا باعث ہماری فوجی طاقت کی تباہی بھی نہ تھا۔ بلکہ صرف چند مفسد طاقتوں کی فتنہ پردازیاں تھیں۔ جنمیں سے ایک کا تو اسی وقت راز افشا ہو گیا تھا۔ اور دوسری اب نمایاں صورت میں ہمارے سامنے موجود تھی - اس سلسلہ میں یہ سوال بھی پوچھا جا سکتا ہے - کہ کیا صرف کسی جنگی شکست کے باعث ہی کوئی قوم تباہ و برباد ہو سکتی ہے ؟ اسکا نہایت مختصر و سیدھا سادہ جواب یہ ہے - کہ بیشک جنگی شکست ہی کسی بربادی کا حقیقی باعث نہیں کہلا سکتی - کیونکہ وہ شکست بھی تو درحقیقت قوم کی ناقابلیت - کاہلی - بزدلی - فرض ناشناسی اور چال چلن کی کمزوری کی وجہ سے ہوتی ہے - اگر کسی قوم میں یہ عیوب نہ ہوں - تو میدانِ جنگ میں اس کی شکست بھی آئندہ عروج و ترقی کا باعث بن جاتی ہے - اور اسکی عظمت و شان پر کبھی کلنگ کا دھبہ نہیں لگا سکتی - اس صداقت کے ثبوت میں تواریخ عالم سے بے شمار واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں - اسی لئے جرمنی کی یہ فوجی شکست بھی کوئی ناقابلِ تلافی بات نہ تھی - بلکہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے ایک ایسا سبق ہو سکتی تھی - ہمیں کبھی

کوئی جھوٹا اور مفسدہ پرواز بدمعاش یہ کہنے کی جرأت کرسکتا تھا۔ کہ درحقیقت یہ
بات اسطرح نہ تھی +

پھر فوجی شکست کو اس تباہی کا باعث ظاہر کرنا بھی تو یہودی بےحیائی کا ایک دیگر
منظر تھا۔ حالانکہ ان دھوکے بازوں کے سرپرآوردہ ترجمان برلن کے "واڈرپرشن" اخبار
نے جرمن افواج کی شکست پر مگرمچھ کے سے آنسو بہاتے ہوئے یہ لکھا تھا۔ کہ درحقیقت
میدان جنگ سے فتحیاب ہوکر گھر واپس آنا۔ جرمن قوم کی قسمت میں ہی نہ تھا۔ اسلئے کیا اس
کے قول کے مطابق اس نوشتہ تقدیر کو ہی اس تباہی کا باعث نہیں سمجھا جاسکتا ؟ -
بلاشک وشبہ جنگ میں شکست کا اثر ہمارے ملک وقوم پر نہایت تباہ کن پڑا
تھا۔ لیکن ہماری موجودہ تباہی اور خستہ حالی کی صرف یہی ایک وجہ نہ تھی۔ یہ تو مختلف وجوہات
و بواعث کا صرف لازمی و لابدی نتیجہ تھا۔ اور سبھی دوراندیش و معاملہ فہم اشخاص یہ مانتے
تھے۔ کہ زندگی اور موت کی کشمکش کا یہ بدبخت انجام کیا ہلاکت آفریں ہوسکتا تھا۔ لیکن
بدقسمتی سے کچھ ایسے بھی تھے جنکی طاقت غور وخوض اس نازک وقت میں بالکل ہی ماری
گئی تھی۔ یا جو اپنی بدنیتی کے باعث سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی محض ہٹ دھرمی
سے اس حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے درحقیقت وہی اس بربادی
کے حقیقی باعث بلکہ منبع و مخزن تھے۔ نہ کہ یہ جنگی شکست جو صرف انکی بداعمالیوں
اور غداریوں کا ایک نتیجہ تھی۔ اور اسی لئے وہ اس شکست کو ہی کا ایک حقیقی باعث نہ
ماننے میں سراسر راستی پر تھے۔ کیونکہ یہ شکست بھی تو حقیقتاً انہیں کی کردہ و مذموم کوششوں کا
ایک لازمی ثمر تھی۔ جسے وہ غلط "رہنمائی و رہبری" کے پردے میں چھپا کر ظاہر کرنے
کی کوشش کرتے تھے +

مگر یہ بھی انکی سراسر غلطی تھی۔ کیونکہ ہمارے دشمنوں اور مخالفوں کا یہ اجتماع بھی
کچھ نرے بزدلوں کا جمگھٹ ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ مرنا مارنا بھی خوب جانتے تھے۔ اور جنگ

یہ محض قدرتی تھا۔ کہ یہودیوں اور سوشلسٹوں کے غلط نقطۂ نظر سے صرف وہی شخص اس تباہی کا ذمہ دار سمجھا جاتا جس نے اپنی غیر معمولی اور زبردست قوت ارادی اور نقطہ رس ذہین اور حقیقت شناس فہم و فراست کی مدد سے قوم کو اسکی مصیبت سے بالخصوص ایسے موقع پر نجات دلائی تھی۔ جبکہ تمام قوم اپنی ذلت وخواری و بے حرمتی کے صدمے سے مضطرب و بیتاب تھی۔ اس لئے لوڈنڈرف کو ہی اس شکست کا ذمہ دار قرار دیکر انہوں نے ایک نہایت زبردست یعنی بر خلاف اخلاقی وسیاسی طاقت کو اپنے ہاتھوں سے کھو دیا تھا۔ اور ساتھ ہی اسکے وہ اپنی مادر وطن کیساتھ بھی ایک ناگفتہ بہ شرمناک بے انصافی کے مرتکب ہو رہے تھے ؛

مگر ہم اسے بھی جرمن قوم کی خوش قسمتی ہی سمجھتے ہیں۔ کہ اس وقت یہ رُلا رُلا کر مارنے والی بیماری پیدا ہو گئی۔ اور فوراً ہی اسکا علاج بھی کر لیا گیا۔ ورنہ بصورت دیگر جرمن قوم کی تباہی لازمی ولابدی تھی۔ چنانچہ یہ مرض پرانا پڑنے سے پہلے ہی علامات کی حقیقی صورت کو پہچان کر دور بین نظروں سے دیکھنے والے طبیبوں نے اس مرض کی حقیقت کو اچھی طرح جان لیا۔ اور وہ سب اسے جڑ بنیاد سے دور کرنے میں مصروف ہو گئے +

عالمگیر جنگ کے شروع ہونے سے پہلے جو بظاہر امن وامان کا طول طویل زمانہ تھا۔ اسمیں بھی کچھ خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ دور بین مدبروں نے ان تمام خرابیوں کو سمجھ بھی لیا تھا۔ مگر پھر بھی چند ایک کے سوا باقی خرابیوں کی حقیقی وجوہات کو جاننے کی طرف کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اور جو خرابیاں انہیں سب سے بڑھکر قابل غور تھی اس کا تعلق قوم کی اقتصادی زندگی کیساتھ سمجھ لیا گیا۔ اسلئے اور سب خرابیوں کی نسبت اس اقتصادی زندگی کیطرف زیادہ توجہ دی۔ حالانکہ اس وقت بہت سی دوسری خرابیوں کی علامات بھی ویسی ہی نمایاں تھیں۔ اس لئے ان کی طرف بھی مناسب توجہ دی جانی چاہیئے تھی۔ مثلاً جنگ سے پہلے ہی جرمنی کی آبادی نے جو حیرت انگیز طریق پر بڑھ رہی تھی۔ یہ سوال پیدا کر دیا تھا۔ کہ اس کے لئے کہیں لمبی جگہ تلاش کی جائے۔

بھی فراموش نہ کرنا چاہئیے تھا۔ تبھی ہمیں ہماری قابلیت کے مطابق اسکا پھل مل سکتا تھا۔

مجھے یقین ہے۔ کہ اگر جرمن فوج کو کسی بھی طرح غداری کی ترغیب نہ دی جاتی بلکہ اُسے اسکے حال پر ہی چھوڑ دیا جاتا۔ اور ہماری قومی بدقسمتی سے یہ شکست ہی ہمارے گلے پڑتی۔ تو جرمن اسے کسی اور ہی رنگ میں دیکھتے۔ اس حالت میں وُہ اپنے آپکو ہی اس ذلت اور ان تمام تکالیف و مصائب کا باعث سمجھتے۔ جو انکے حصے میں آتیں۔ اس کیساتھ ہی قسمت کی چالبازیوں کیخلاف انکا دل غم و غصہ سے بھر جاتا۔ اور وہ اپنے دشمنوں کی خوش قسمتی اور فتح کو کسی طرح بھی ٹھنڈے دل سے برداشت نہ کر سکتے۔ بلکہ اپنی اس شکست کا ان سے انتقام لینے کیلئے ہمیشہ بیقرار و مضطرب نظر آتے۔ اس حالت میں نہ تو عیش عشرت ہی منا سکتے تھے۔ اور نہ کبھی ناچ گانے سے ہی انہیں اپنا دل بہلانے کی سوجھتی۔ اسوقت انہیں بزدلی پر کوئی گھمنڈ اور غرور بھی ہرگز نہ ہو سکتا تھا۔ اور نہ وُہ اپنی شکست کا خود اسطرح مذاق نہ اڑاتے۔ سب سے بڑھ چڑھ کر وُہ ناپسندیدہ اور افسوسناک صورت حال بھی ملک میں ہرگز پیدا نہ ہوتی۔ جس نے کرنل ہینگٹن (ایک برطانی افسر) کو یہ رائے ظاہر کرنیکا موقع دیا تھا۔ کہ ہر ایک جرمن مکار اور دھوکے باز ہے"۔

اس لیے یہ کہنا ہی پڑتا ہے۔ کہ درحقیقت ہماری گوناگوں کمزوریوں نے ہی ہماری فوجی طاقت کو تباہ و برباد کر دیا۔ اور اس کے لئے ان بزدلوں کو ذمہ وار ٹھہرایا جاسکتا ہے جو امن و امان کے زمانے میں بھی ہمیشہ ہی قوم میں طرح طرح کے عیوب پیدا کر کے اسے کمزور بناتے رہے ہیں۔ کیونکہ قوم میں یہ اخلاقی اور سیاسی زہر پھیل جانے سے تباہ کن نتیجے کے طور ہی ہمیں یہ شکست کھانی پڑی تھی۔ اسکی بدولت ہی ذاتی حفاظت کے متعلق ہمارے خیالات بے حد کمزور پڑ گئے تھے۔ جرمن قوم نیز جرمن پارلیمنٹ نامعلوم طور پر اس زمانے کے بربادی خیز اصولوں کا شکار ہو گئی۔ اور اگر اس شکست کو بھی اسی کمزوری کا نتیجہ مانا جائے۔ تو ہرگز اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا+

ہوا۔ کہ اس کا آغاز اس زمانے میں ہوا۔ جبکہ ملک کو بہادری اور جانبازی کی خاص طور پر ضرورت تھی۔ کیونکہ یہ وقت تھا جبکہ ہمارا ملک ہر طرف سے خوف و خطر میں پھنسا ہُوا تھا۔ اس وقت جرمنی کو اپنی تلوار کی طاقت سے اپنی صنعت و حرفت کو مضبوط بنانا چاہیئے تھا۔ تاکہ اس کے باشندے اپنی روزانہ روٹی پُرامن صنعتی محنت و مشقت اور مناسب عزت کے ساتھ کما سکتے۔ مگر بدقسمتی سے زر پرستی کی عظمت و اہمیت کے خیال نے ان کے دل پر قبضہ پا لیا تھا۔ جسے حاصل کرنے کیلئے مستقبل قریب میں ہی مزدوروں کے اندر کشمکش پیدا ہونی لازمی و لابدی تھی۔ اس پر ہمارے قیصر اعظم نے غلطی یہ کی۔ کہ اپنے اہلکاروں کو بھی "دولت کی دیوی" کے اس نئے مندر میں بیروک ٹوک داخل ہونے کی کھلی اجازت دے دی +

اس میں شک نہیں کہ قیصر کا یہ قصور قابل معافی ہے۔ کیونکہ بسمارک جیسے دور اندیش اور معاملہ فہم مدبر بھی اس خوفناک صورت حال کا خیال اپنے دل میں نہیں لا سکے تھے۔ لیکن حقیقتاً اس زر پرستی کی غلطی نے ہی تمام حقیقی اور معراجی (آدرش) اوصاف کو دولت و ثروت کا زر خرید غلام بنا دیا۔ کیونکہ اس تجربے سے یہ صاف ظاہر ہو گیا۔ کہ ایک مرتبہ زر پرستی کے برگامزن ہو جانے کے بعد ایثار مجسم اور جانباز فوجی درباری اور کارکن بھی اپنی تمام مردانہ خُو بُو چھوڑ کر لکشمی (دولت) کے مایا جال میں پھنسنے اور اسکا غلام بے دام بننے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں +

جنگ سے پہلے جرمن قوم کی تجارت و حرفت حصص کی بین الاقوامی خرید و فروخت کی بدولت خوب چل رہی تھی۔ جرمنی کی ایک اولوالعزم جماعت نے اس میں سے تمام غیر ملکی عنصر کو نکال باہر کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی لیکن آخر اسے خود [illegible] لالچی زر پرستوں کے مشترکہ حملے کا شکار ہونا پڑا۔ مگر یہ سب کچھ ہمارے "مارکس ازم کے بین الاقوامی اصولوں کے پیرو دوستوں اور عنایت فرماؤں کے ہتھکنڈے" ہی

جو اقتصادی اور سیاسی دونوں نقطہ ہائے نظر سے موزوں و مناسب ہو۔ مگر افسوس کہ ارباب حکومت اس کے متعلق کسی صحیح فیصلے پر اتفاق رائے سے نہیں پہنچ سکے۔ کیونکہ انہوں نے یہ سمجھ لیا۔ کہ ہم اس سوال کو آسانی سے ہی حل کرنے میں کامیاب ہو جائینگے۔

اس مقصد کے لئے انکے دلوں میں نئے ملکوں اور نوآبادیوں کو فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر اقتصادی فتوحات کے نشہ میں پھنس جانے کے باعث صنعت و حرفت کی لامحدود ترقی کی۔ وُہ دھن جو اس وقت اٹل سی ہو گئی تھی۔ پھر اس خیال پر غالب آگئی۔ اور اسکا بنیادی کن نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مزدور اور کسان روز بروز کمزور ہوتے چلے گئے۔ اور جیسے جیسے انکی یہ کمزوری بڑھتی انکی جسمانی و اخلاقی طاقت کا زوال ہوتا گیا۔ وہ دیہات کی صحت افزا فضا کو چھوڑ چھوڑ کر شہروں کو بھرتے چلے گئے۔ اور انکی تعداد کی روز افزوں ترقی سے اس مساوات و تناسب کا بھی خاتمہ ہوتا چلا گیا۔ جو کہ قومی زندگی کی جان ہوا کرتی ہے۔

اسطرح غریبوں اور مالداروں میں باہمی کشاکشی شروع ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ خطرناک صورت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس طرح فضولیات اور افلاس کا تعلق ہمیشہ تنا گہرا اور ایسا نزدیکی ہو گیا۔ کہ اسکا انجام نہایت خوفناک نظر آنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس ناداری اور عام بیکاری نے عوام کے لئے ایک قیامت خیز صورت اختیار کر لی۔ اور اس سے ہر طرف بے اطمینانی اور بے چینی پیدا ہو کر باہمی مغائرت اور دشمنی کے خیالات بڑھنے لگے۔ مگر پھر بھی اس بےحد و حساب فضول صنعت و حرفت کی ناقص فضا بدستور جاری رہی۔ حتیٰ کہ رعایا کی نظروں میں روپیہ ہی خدا بن گیا۔ اور اسی کی جی حضوری کا فکر ہر ایک کو ستانے لگا۔ اور اسکی ہی طاقت کے سامنے ہر خاص و عام خواہی نخواہی سر جھکانے کے لئے مجبور کیا جانے لگا۔

اخلاقی زوال کا یہ افسوسناک دور اس کے لئے اور بھی خاص طور پر نقصان دہ ثابت

جرمنی کی یہ صنعتی رغبت اور کمزور دلی ہی تھی۔ جو تہذیب تمدنی کے درجے تک پہنچ کر آغازِ
جنگ سے ہی انکی زندگی کے ہر شعبے پر اپنا پورا پورا قبضہ جما چکی تھی۔ اور جو ان کی عملی بے یقینی اور
تذبذب پرستی کا ایک نتیجہ تھی۔ اسی سے انکی تباہی کی دوسری وجہ یعنی بزدلی پیدا ہو گئی
تھی۔ جو ہر شک و شبہ کرنیوالی شخصیت میں دوسری کمزوریوں کیساتھ از خود نمودار ہو جایا
کرتی ہے۔ مگر ان سب کیلئے اگر اس زمانہ کے طریق تعلیم کو ہی قصور وار ٹھہرایا جائے۔ تو بھی کچھ
مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ جنگ سے پہلے جرمنی کا طریق تعلیم اکثر پہلوؤں سے نہایت کمزور ہو گیا تھا۔ اور
اُسے ایسی شکل و صورت دیدی گئی تھی۔ جس سے عوام میں اپنی روزانہ زندگی کے کاموں کو مناسب
دانائی و دور اندیشی سر انجام دینے کی قابلیت ہی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ ایک طرف انکی طاقت علم و
عمل کو محدود کر دیا گیا تھا۔ اور دوسری طرف اس میں خود غرضی و مطلب پرستی کا زہر لبالب
بھر دیا گیا تھا۔ برعکس اس کے چال چلن میں پاکیزگی و عظمت پیدا کرنیکی طرف کوئی بھی توجہ نہیں
دی جاتی۔ اور کسی ذمہ داری کو مناسب طور پر پورا کرکے جو خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے اُسے سمجھانے
اور سکھانے کا تو کسی کو ذرہ بھر بھی خیال نہ تھا۔ اور نہ طلباء میں عدل پرستی و انصاف پسندی کا
مادہ پیدا کرنے یا انکی قوت ارادی کو مضبوط بنانے کو ہی ضرور سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ کہ سب
اوصاف عوام میں کم ہونے چلے گئے۔ اور بہ ہیئت مجموعی انکا کہیں نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔
اسطرح قوم روز بروز کمزور و بزدل ہوتی گئی۔ کیونکہ یہی وہ سب ضروری اوصاف ہیں۔ جو کسی
شخص یا قوم کو مضبوط طاقتور اور شیر دل بناتے ہیں۔ اور اسمیں ہر مصیبت اور
تکلیف کو صبر و استقلال سے برداشت کرنیکی طاقت پیدا کرتے ہیں +

مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانے کے جرمن ارباب حکومت عوام میں ان صفات کو پیدا
کرکے انہیں مضبوط بنانیکی بجائے ارادتاً انہیں روز بروز نااہل کرکے کمزور کرنا چاہتے
تھے۔ اور انکا دلی مقصد ہی یہ تھا۔ کہ عوام سب طرح کے علم و ہنر جانتے ہوئے بھی بزدل
کم ہمت۔ ڈرپوک اور عملی طور پر ناکارہ بنتے چلے جائیں۔ یہاں تک کہ دنیا بھر کی آزاد

تھے۔ جنکی بدولت ہیں جرمن محب وطن جماعت کو ناکامی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد جرمنی کے خفیہ اور پُرہلو مصنوعات کے خلاف بھی مارکس ازم کے پیروں نے کھلم کھلا جہاد اور بین الاقوامی جدوجہد شروع کردی۔ جسمیں ایک طرف تو جرمنی کے قوم پرست اور دوسری طرف دنیا بھر کے نام نہاد سوشلسٹ اور مارکس ازم کے نام لیوا لیکن آخر انہیں اپنے اس ناپاک مقصد میں کامیابی اور مارکس ازم کی فتح صرف اسی صورت میں نظر آئی۔ کہ کسی نہ کسی طرح جرمنی میں بغاوت اور انقلاب برپا کرا دیا جائے۔

مجھے بھی جرمنی کی ریلوں پر مارکس ازم کے پیرؤں کا یہ مشترکہ بین الاقوامی حملہ ہر طرح کامیاب ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا جسمیں بین الاقوامی سرمایہ داروں کے خوب گھرے تھے۔ اسطرح ان بین الاقومیت کے شیدائی سوشلسٹوں نے سرمایہ پرستوں کی حمایت میں اپنی جمہور نوازیوں" کا . . . بھانڈا پھوڑ کر اپنا ایک مقصد تو من مانے طور پر حاصل کر لیا۔ اور یہ اندھا دھند تجارتی و صنعتی ترقی کا ہی نتیجہ تھا۔ کہ جنگ کا خاتمہ ہوتے ہی ان تجارتوں اور صنعتوں کے رہبروں اور رہنماؤں نے پھر یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ کہ جرمنی صرف اسی طرح پھر اپنے پیروں کھڑا ہو سکتا ہے۔ کہ اسکی ان تجارتوں اور صنعتوں کو پھر پہلے کی مانند ترقی اور نشو و نما دی جائے۔ چنانچہ شائن کے ان کے الفاظ نے ایک مرتبہ پھر ایک غیر متوقع اور ناقابل اعتبار سا جوش اور سرگرمی ملک میں پیدا کر دی۔ اور جتنے بھی بکواسی پاکھنڈی عیار و مکار پہلے ارباب حکومت کے بھیس میں جرمنی کے عروج اقبال کو ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد کرنے میں پیش پیش رہ چکے تھے۔ وہ سب کے سب اب ایک مرتبہ پھر اس پر فریب مقصد کی تکمیل میں مصروف نظر آنے لگے۔ کہ جرمنی اور باشندگان جرمنی کو پھر اسی تجارتی صنعتی گورکھ دھندے میں پھنسا دیا جائے۔ جس نے اسے پہلے برباد کیا تھا۔

اسی لئے میری رائے میں جرمنی کی تباہی و بربادی کی سب سے بڑی وجہ عام باشندگان

اسی طرح بادشاہوں کے خیالات و اوصاف کی عظمت ان کی ذات واحد تک ہی محدود نہیں رہتی۔ بلکہ تمام ملک و قوم میں آہستہ آہستہ سرایت کر جاتی ہے۔ لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے۔ جبکہ ایشور تخت و تاج کا مالک کسی فریڈرک اعظم یا ولیم اول جیسے لاثانی عالم۔ بے نظیر ماہر جنگ اور بے مثال مدبر کو بنا دے۔ مگر کہیں کئی کئی صدیوں کے بعد بصد مشکل یہ روح افزا و زندگی بخش نظارہ دنیا کو نظر آتا ہے ورنہ زیادہ تر صورتِ حالات تو اس کے بالکل ہی برعکس دکھائی دیتی ہے۔

قومی طریق تعلیم میں ان تمام تذکرہ بالا خرابیوں کا ہی یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ کہ انسان اپنی ذمہ واریوں کا بوجھ اپنی گردن پر لینے سے ہمیشہ خوف کھاتا ہے۔ اور اُن سے حاصل ہونے والے فوائد کے لئے دن رات للچاتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں میں عوام کی ان چند باتوں کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ جن کا میری ذات خاص سے کچھ تعلق ہے۔

مثلاً اخبار نویسی کے میدان میں پریس کو قوم کی ایک نہایت زبردست طاقت ماننے کا کچھ رواج سا پیدا ہوگیا ہے۔ اس میں شک بھی نہیں۔ کہ حقیقتاً اس کی طاقت بھی بہت ہے۔ لیکن اس کی صحیح صحیح تشریح و توضیح بہت مشکل ہے۔ مگر پھر بھی جو کچھ اخبارات کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے متعلق یہی سمجھا جاتا ہے۔ کہ یہ سب کچھ زیادہ تر تعلیم و تلقین کی نشوونما کو زیادہ سے زیادہ ترقی کے درجے تک پہنچانے کیلئے کیا جاتا ہے۔ اور یہ قوم و ملک کی بہتری کے لئے ہے بھی مفید لیکن یہ دیکھنا بھی تو اخبارات کا ہی سب سے اہم اور ضروری فرض ہے۔ کہ کہیں قوم نالائق۔ ناقابل۔ خود غرض اور مطلب پرست لوگوں کے جال میں تو نہیں پھنس رہی۔ اور قوم کا بھی یہ فرض ہے۔ کہ وہ ہمیشہ عوام کی تعلیم و تلقین کو گہری غور بین نظروں سے دیکھتی رہے۔ اور اُسے کسی غلط رستے پر ہرگز ہرگز نہ پڑنے دے۔ خصوصاً اسے اخبارات کے رنگ، ڈھنگ پر تو

قوموں نے جرمنوں کے متعلق یہی رائے قائم کرلی تھی - کہ ایک جرمن کسی چیز کو اپنے لئے
مفید و کار آمد سمجھ کر اسکے پانیکی خواہش تو ضرور کر سکتا ہے لیکن اسکی قوت ارادی اتنی
کمزور ہے - کہ وہ اسے حاصل کرنے کے لئے کوئی سرگرم کوشش نہیں کرسکتا - اور
کرتا بھی ہے - تو اسے زیادہ دیر تک جاری رکھ کر آخر میں پوری پوری کامیابی حاصل کرنیکی
ہمت نہیں دکھا سکتا +

یہ کمزور دلی اس وقت ان کیلئے اور بھی نقصان دہ ثابت ہوئی جبکہ ان میں وہ سب
عادات و خصلات پیدا ہوگئیں - جو کہ رئیسوں اور نوابوں میں پائی جاتی ہیں - اور جنکی
بنیاد غیر ذمہ داری کے اصولوں پر ہوتی ہے - لیکن پھر بھی جرمنوں کی یہ خواہش ضرور
تھی - کہ ملک کا ہر باشندہ اپنے عمل و فعل میں مکمل طور پر آزاد ہونا چاہیئے - ورنہ
شاید اس خواہش کی عدم موجودگی کے باعث صفحہ ہستی سے ہی اسکا نام و نشان بھی
کا مٹ گیا ہوتا +

اسمیں شک نہیں - کہ خوشامد پسند اور چاپلوس لوگوں کے لئے یہ صورت حال
نہایت تسلی بخش تھی - لیکن کوئی بھی دور اندیش معاملہ فہم - محب وطن شخص اسے برداشت
نہیں کرسکتا تھا - کیونکہ انکی نگاہوں میں تاریخ بہر حال تاریخ ہی تھی - اور تاریخی صداقتیں
سب پر یکساں ہی اثر انداز ہوا کرتی ہیں - خواہ انکا تعلق کسی بڑے سے بڑے بادشاہ
سے ہو یا ادنٰے سے ادنٰے رعایا سے +

گویا یہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے - کہ کسی قوم کے اندر ایک ہی وقت میں کوئی اعلیٰ
درجہ کا دانشمند موقع شناس رہنما - بادشاہ نیز باکمال عالم فاضل ماہران علوم و فنون
موجود رہے ہوں - لیکن جس ملک میں خوش قسمتی سے ایسا ہو جاتا ہے - اسے دنیا کی
کوئی بھی آفت و بدقسمتی کبھی نہیں ستا سکتی - اور اس کی زندگی نہایت ہی امن و امان و
اطمینان آرام و چین نیز فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی ہو جاتی ہے +

نے بہ حیثیت ایک قوم کے ملک کو اس خطرناک زہر سے محفوظ رکھنے کے لیئے کیا کیا؟ کچھ نہیں! بالکل کچھ نہیں!! کبھی کبھی دبی سی زبان سے کسی کسی اخبار کو صرف فہمائش یا کسی بیحد پُرخوف و خطرناک الزام کے لئے کسی؟ گفتہ بہ حقیر سی رقم کا جرمانہ جو ہر پہلو سے قابل نظر اندازی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں!

اپنی حفاظت کے لیئے وقتی گورنمنٹ نے اخبارات کے خلاف یہ جو روش اختیار کی تھی اس میں بھی یہودیوں کا بہت کچھ ہاتھ تھا۔ اور اس کی جسطرح بھی رہنمائی کی گئی حکومت کی کم نظری اور کوتہ اندیشی کو پوری طرح ظاہر کرتی ہے۔ سب سے زیادہ قابل افسوس بات تو یہ تھی۔ کہ اس پہلو میں حکومت کا کوئی بھی تصیفہ شدہ مقصد نظر نہ آتا تھا۔ خوشامدیوں کی مطلب پرستیوں کے باعث اس سے قدم قدم پر غلطی ہوتی تھی لیکن نہ تو اس مخالفت کے اثر پر ہی غور کیا جاتا تھا۔ اور نہ اسے دبانے کے لئے ہی کبھی کوئی پُراثر طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ اسلئے وہ خوشامدی ہمیشہ ہی اپنے بچاؤ کا کوئی نہ کوئی رستہ تلاش کر لیتے تھے۔ اور اگر وہ کبھی بُری طرح پھنس بھی جاتے تھے۔ تو اپنے انقلاب پسند مضمون نگاروں یا ایڈیٹروں کے گلے اپنی تمام ذمہ داری سنڈھ کر آپ صاف بچ نکلتے تھے۔ اس لئے آستین کے ان خوفناک اور زہریلے سانپوں کی طرف جو اُن تمام خرابیوں کے موجب تھے۔ کسی کی بھی کبھی کوئی توجہ نہ ہوئی۔

کم علم اور ادھ کچرے پڑھے لکھے آدمیوں میں "فرینک فرٹز ٹیگ" اخبار اچھی نظروں سے دیکھا جایا کرتا تھا۔ یہ کبھی روکھے پھیکے مضامین شائع نہ کرتا تھا۔ یہ ہمیشہ وحشیانہ طاقت کی مذمت کرتا ہوا دماغی طاقت کے ہتھیاروں سے کام لینے کی حمایت کیا کرتا تھا۔ تاکہ ..... عوام کے دلی خیالات پر اُن کا کچھ اثر پڑے۔ ایک یہودی اخبار نویس کو بھی اپنے پرچے "اُن ٹیلی جنیجا پریس" میں اس کی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھنا پڑا تھا۔ کہ ہمارے کم خواندہ عوام کیلئے "زٹیگ" بہت اچھا اخبار ہے"۔ فرینک

ہمیشہ ہی نہایت سخت نگرانی رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کا اثر نامعلوم طور پر نوع انسان پر دیگر سب ذرائع تعلیم کی نسبت بہت ہی زیادہ پڑتا ہے۔ اور وہ دیرپا بھی بہت ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تنظیم و تعلیم کے اصولوں کی لگاتار پیروی ہی ہے۔

اسی لئے میں نے یہ کہا ہے۔ کہ قوم کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ملکی اخبارات کی مناسب نگرانی میں کسی طرح بھی کوتاہی نہ کرے اور ہمیشہ اپنے پاک مقصد کو مدِ نظر رکھے۔ کسی قوم و ملک کو بھی کبھی پریس کی آزادی کے لفظی فریب اور دھوکے میں نہ آنا چاہیئے۔ اور اس بارے میں اپنے فرض کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اسی سے تو عوام میں اس کی قوت و طاقت کو مضبوطی و پائداری نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے ہر قوم کا یہ فرض ہے۔ کہ عوام کی تعلیم و تلقین کے اس نہایت زبردست ذریعہ کو نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنے قابو میں رکھے۔ ہمیشہ اُسے مناسب بے غرضی کے ساتھ قوم و ملک کی خدمت کے راستے پر آگے بڑھنے دے۔ اور کبھی کسی نہری روپہلی مصلحت سے گمراہ ہو کر اسے کسی غلط اور نقصان دہ سڑک نہ پڑنے دے۔

آغاز جنگ سے پہلے ہمارے نام نہاد "لبرل پریس" نے جو کچھ بھی کیا۔ وہ جرمن قوم اور پارلیمنٹ (ریش) کی ترقی کے راستے میں کنواں کھودنے کی ناپاک کوششوں سے کسی بھی صورت میں کچھ کم نہ تھا۔ ہمیں جھوٹے اور پر فریب "مارکسی" اخبارات کے متعلق یہاں کچھ حاشیہ آرائی کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اُن کے لئے تو جھوٹ بولنا اور جھوٹ لکھنا اتنا ہی ضروری تھا۔ جتنا کہ بلی کے لئے "میاؤں میاؤں" کرنا۔ اُن کا تو واحد اور بیرونی لغریز مقصد ہی یہ ہے۔ کہ جیسے کیسے قومی طاقتوں کو کمزور کیا جائے۔ اور ان کی قوت کو توڑا جائے۔ یعنی جرمنوں کو بین الاقوامی سرمایہ اور اپنے (اخبارات کے) مالک یہودیوں کا غلام بنایا جائے۔ لیکن جرمنوں

کے رنج و افسوس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ اس لئے میں یہ یقین کر سکتا تھا۔ کہ اس کے پہلو میں بھی ہماری حالت ہمارے ان بزرگوں کی نسبت بہت اچھی ہے۔ جو پہلے یہودی اخباروں کی آنکھوں سے دیکھنے اور ان کے ہی دماغ سے سوچنے کے عادی ہو چکے تھے۔ کیونکہ اب ہم یہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ کہ تیس سنٹی میٹر والی بارود کا ایک گولہ ایک ہزار قوم فروش غدار یہودی نامہ نگاروں اور مضمون نویسوں کی نسبت زیادہ آواز پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا ان کی بکواس و لغو گوئی کی ہمیں کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔

اسی لئے میرا یہ خیال تھا۔ کہ ہماری تعلیم ایسی ہونی چاہیئے۔ جس سے ہمارے نوجوانوں کی فرصت کا ایک ایک لمحہ اُن کی جسمانی حالت تو بہتر بنانے میں صرف ہو سکے۔ کیونکہ انہیں اس بارے کوئی بھی حق حاصل نہیں۔ کہ وہ اپنی گراں بہا زندگی اُن بیش قیمت برسوں سڑکوں اور بازاروں میں گھومتے ہوئے ہلّو حق مچانے میں یا سینماؤں کے لغو و بیہودہ کھیل تماشوں کے دیکھنے میں ہی ضائع کر دیں۔ بلکہ انہیں اپنے روزانہ کام کاج سے چھٹی پانے کے بعد اپنے جسم اور دل و دماغ کو مضبوط اور طاقت ور بنانے میں صرف کرنا چاہیئے۔ تاکہ زندگی کی جدوجہد میں انہیں کبھی کوئی کمزوری محسوس نہ ہو۔ نوجوانوں کو آئندہ کارزار حیات میں پورے پورے جوش خروش اور طاقت و قوت سے حصہ لینے کے قابل بنانا ہی ہر ایک نوجوان مرد و عورت کی تعلیم کا حقیقی مقصد و مدعا ہونا چاہیئے۔ لیکن کورے کتابی علم سے ہی یہ کام نہیں چل سکتا۔ اُسے خود یہ محسوس کرنیکی ضرورت ہے۔ کہ اپنے جسم کو مضبوط اور چاق و چوبند بنانا ہر شخص کا اپنا ذاتی فرض ہے۔ اس لئے اس کو بھی اپنی خاندانی روایات کی بنا پر اپنے آپ کو اپنے پاک فرض کی طرف سے لاپرواہی کا مرتکب نہ ہونے دینا چاہیئے۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی جسمانی حالت کو بہتر بناتے ہوئے اپنے دل و دماغ بلکہ روح تک کو بھی موجودہ پرعیب ناقص اور کمزور کن گندی فضا کیخلاف

فرٹرزٹیک اور ترلینیزنیگ بلیٹ" کی تحریرات کا اثر ہمارے عوام پر خوب پڑ رہا تھا ان دونوں اخبارات کا مقصد یہ تھا۔ کہ عوام کی آنکھوں پر جھوٹ اور مکر کا پردہ اُٹھا دیا جائے۔ وہ ایک طرف تو عوام کی زبان کے بھدے پن کو دُور کرنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسری طرف ان کے دل سے گندے اور ناپاک خیالات کا زہریلا اثر ہٹانے کے لئے کوشاں تھے۔ اور اپنے دلکش طرز تحریر سے وہ اپنے ناظرین کے دل پر یہ نقش کرتے جا رہے تھے۔ کہ پاکیزہ علم اور اخلاقی سچائیاں انسان کی اپنی ہی کوششوں کے نتیجے کے طور پر حاصل ہو سکتی ہیں۔ بلا شک وشبہ اپنے مخالفوں کا منہ بند کرنے کے لئے یہ طریقہ نہایت دانشمندانہ تھا۔ اور اگرچہ وقت پر دشمن بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی میں اسے یہودیوں کی تمام کوششوں کا ایک منہ توڑ جواب سمجھتا تھا۔ کیونکہ محض ادھوری کوششوں سے کسی جوش کو ٹھنڈا کرنیکی سعی ہمیشہ اندرونی کمزوری اور تباہی کی ایک بیرونی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کے انجام کے طور پر مستقبل قریب میں ہی قومی بربادی اٹل اور لازمی ہو جاتی ہے۔

مجھے امید تھی۔ کہ جرمن قوم موجودہ خطرات پر جولسے ہر طرف گھور رہے تھے۔ بہ آسانی قابو پالے گی۔ اور ان سے خوفزدہ ہو کر ہمت نہ ہار بیٹھے گی۔ اور یہ اعتقادات جنہیں وہ اچھی طرح سوچنے اور سمجھنے لگے تھے۔ جلد ہی یقینی طور پر ان کے دلوں میں گھر جائیں گے۔ یہودی اخبارات عوام کی اس حالت پر جس کی طرف اُنکا ابھی بالکل بھی دھیان نہ تھا۔ ایک نہ ایک دن ضرور اپنے غم وغصے کا اظہار کرینگے۔ کیونکہ جب وہ دیکھیں گے۔ کہ ان کا وہ ہتھیار یعنی اخبارات جسے وہ اس نقصان دہ طریق پر استعمال کر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں سے اس طرح چھن گیا ہے۔ اور اب وہ اسکے ذریعہ مزید کچھ شرارت نہیں کر سکتے۔ بلکہ اب وہ ہتھیار پھر قوم و ملک کی خدمت میں استعمال ہو کر اس کے بدظن بدخواہوں کے غرور و تکبر کو چکنا چور کرنے لگا ہے۔ تو اُن

کے ناپاک جذبات سے پر تھی "نوجوانو! ہوشیار" کی اس عام تنبیہہ و فہمائش کی آواز کی کچھ توجہ دیتے۔ جو ملک و قوم کے ہر بہی خواہ کی زبان سے بلند ہو کر فضا میں گونج رہی تھی۔ یہ خیال کہ یہ سب کوششیں وہاں ہونی چاہئیں تھیں۔ جہاں نوجوانوں کی آئندہ زندگیوں کو بنانے کیلئے سبھی ساز و سامان موجود تھے۔ کچھ بہت حوصلہ افزا اور دل خوش کن نہ تھا۔ کیونکہ تمام نکتہ شناس پاکیزہ خیال ڈرامہ نویس اسکے متعلق پہلے ہی ایک عرصہ دراز سے نہایت زوردار الفاظ میں عوام کو فہمائش کر رہے ہیں۔ ذرا شلر کے غم و غصہ اور غیض و غضب بھرے الفاظ کی طرف توجہ دیجئے اور دیکھئے کہ گوئٹے جیسا شخص بھی اس صورت حال پر غور کرتے کرتے کیسا غضبناک ہو جاتا تھا۔ لیکن درحقیقت شلر گوئٹے شیکسپیئر وغیرہ کی تصانیف جرمنی کے پرجوش رزمیہ شاعروں کی بہادری اور دلاوری کے ہنگامہ خیز جذبات پیدا کرنے والے کلام کا کیا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ انہوں نے جو کچھ عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کی یاد اب بھی ہمارے نیم مردہ جسموں میں دوڑتے ہوئے لیکن سرد خون میں جوش پیدا کر سکتی ہے۔ مگر اس کی طرف کوئی توجہ بھی تو دے۔

عالمگیر جنگ سے پہلے ہماری قومی تہذیب کی یہ قابل افسوس حالت صرف اسی لئے نہ تھی۔ کہ ہماری وہ طاقتیں جو تمدن اور مختلف فنون میں ایک نئی زندگی اور قوت پیدا کرتی ہیں۔ بالکل کمزور ہو گئی تھیں۔ بلکہ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری ہمارے اُن قابل نفرت و پرعیب تعلیمات پر تھی۔ جو ہمارے شاندار ماضی کی تمام پاکیزہ یادگاروں پر کلنگ لگا لگا کر انہیں ہماری نظروں سے گرا رہے تھے۔ اور ہمیشہ کے لئے غائب کرنے کی ناپاک کوششوں میں شب و روز مصروف تھے۔ یہاں تک کہ گذشتہ صدی کے آخری زمانہ میں ہمارے تمام علوم و فنون میں عموماً اور ڈرامہ علم و ادب میں خصوصاً تمام خاص طور پر قابل فخر باتوں کو ناممکن۔ بعید از قیاس۔ مہمل۔ ناقابل عمل وغیرہ ظاہر کر کے الٹا انہیں ہیچ و ناکارہ ظاہر کیا گیا تھا۔ اور انکا مذاق اڑایا گیا تھا۔ گویا زمانہ حال

سر توڑ جنگ میں مصروف ہو جائیں۔ آجکل ہماری قومی زندگی جنسی یعنی مردوں اور عورتوں کے متعلق مکروہ خیالات کا مرکز بن رہی ہے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کی نفس پرستی کے لئے مقناطیسی طاقتوں سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ اگر آپ سینماؤں تھیٹروں اور کھیل تماشوں کے اخراجات پر نظر ڈالیں۔ تو آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے مایۂ ناز ملکی نوجوان کے لئے یہ مناسب خوراک مہیا نہیں کرتے۔ اشتہار بازی اور گانے بجانے سے عوام کے خیالات بری باتوں کی طرف بھی کھینچے جا سکتے ہیں۔ اور اچھی باتوں کی طرف بھی لیکن کوئی بھی شخص جس نے نوجوانوں کی بھلائی برائی کے متعلق اپنی سوچنے اور غور کرنیکی طاقت کو بالکل ہی زائل نہیں کر دیا۔ بہت ہی آسانی سے یہ سمجھ سکتا ہے۔ کہ آج کل یہ سب چیزیں جس صورت میں نوجوانوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں۔ وہ ان کے لئے نہایت ہی نقصان دہ ہیں۔ اس لیئے ہمیں اپنی قومی زندگی کو زمانہ حال کی شہوت پرستوں کی ناپاک فضا سے بچانا ہی پڑے گا۔ اور یہ تبا ہی ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم ایسے طریقوں سے انکا مقابلہ کرنے کی کوشش کریں۔ جو نہایت محتاط لیکن نہایت ہی زبردست ہوں۔ اور ایسے پاکیزہ نفس و بلند خیال انسانوں کے تجویز کردہ ہوں۔ جو معمولی طبقے کے لوگوں سے بہت بلند پایہ ہیں۔ ان سب طریقوں میں عوام کی رہنمائی ایسے خیالات سے ہونی چاہیئے۔ جو ہمارے قومی اور ہماری قومی روحوں کو درست اور صحت مند رکھنے والے ہوں۔ تب کہیں اسکے بعد سلسلہ نسل قائم رکھنے کے لئے ذاتی فرض اور شخصی آزادی کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں!

ہماری تہذیب و فن کے تقریباً ہر ایک شعبہ میں یہ کمزوری نمایاں تھی۔ اور ہماری اندرونی تنزل و تباہی کی یہی سب سے بڑی علامت تھی۔ کہ ہمارے نوجوانوں کیلئے یہ ناممکن ہو گیا تھا۔ کہ وہ ایسے فنی مرکزوں میں پہنچتے ہوئے جہاں کی فضا شہوت پرستوں

صرف عقیدتمندی بلکہ خوش اعتقادی پر ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے مروجہ ومقبول عام مسائل کے مقابلہ میں اسی طرح کے دوسرے مسائل کا پرچار اتنا کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جتنا کہ اُن مسائل پر مخالفین کی طرف سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ انکا کوئی معقول اور منہ توڑ جواب کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور معترضوں کی زبان پر قفل خاموشی لگا سکتا ہے۔ جو مذہبی مسائل یا عقائد عوام کے دلوں پر اپنا اثر جما لیتے ہیں۔ اُنکی بنیاد صرف اس مذہب یا مسئلہ یا عقیدے کے بانی مبانی کی شخصیت پر قائم سمجھی جاسکتی ہے۔

غرضیکہ ایک سیاسی مدبر کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ وہ ہر مذہب کی قدر وقیمت کا اندازہ اُسکی کمزوریوں اور نقائص کی بنا پر نہ کرے بلکہ اُس کی مضبوطی طاقت اور خوبیوں کے معیار سے کرے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ کسی سیاسی مدبر کے ایسا کرنے سے پہلے ہی پہلے جاہل وکم عقل معترض اپنے معقول و نامعقول اعتراضات کے کلہاڑے سے عوام کے دل سے اسکی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ اور اسطرح اُس کی برائیوں کیساتھ ہی ساتھ اُس کی تمام بھلائیاں اور خوبیاں بھی تباہ وبرباد ہوجاتی ہیں۔

اسی طرح جرمنی کے اس وبائے جنگ میں مبتلا ہونے سے بہت پہلے عیسائیت کی طرف سے جرمن قوم کی بداعتقادی کی تمام ذمہ داری اُن عیسائی فرقوں کے سر پر عائد ہوتی تھی۔ جنہوں نے کہ مذہب کو غلط طور پر استعمال کیا تھا۔ یا جنہوں نے کیتھولک مذہب سے اپنی عقیدتمندی کے اظہار کی دُھن میں مذہب کو سیاسات کے ساتھ جکڑ دیا تھا۔ یہ ان کی ایک بہت ہی بڑی غلطی تھی۔ اس غلطی نے جرمن پارلیمنٹ کے چند ناقابل اور کوتہ اندیش ممبروں کی حوصلہ افزائی کرکے انہیں میدان عمل میں سب سے آگے بڑھا دیا۔ جس کا نتیجہ بعد میں عیسائیت کے لئے بہت ہی نقصان دہ ثابت ہؤا۔ اور یہ اُسی کا پھل تھا کہ ایک ایسے زمانے میں جبکہ

ان عیوب سے بالکل ہی پاک وصاف ہے۔ جس کو زمانہ ماضی کی تصنیفات سے ڈھونڈھ ڈھونڈ کر نہایت شرمناک طور پر ہمارے سامنے لایا جاتا ہے۔ کتنے حیرت تعجب اور افسوس کی بات ہے۔

جنگ سے پہلے کے مذہبی و دینی حالات کو بنظر غور دیکھنے و مطالعہ کرنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ کس طرح ہر ایک ضروری مسئلہ پر بحث و تحیص کو نامکمل ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ جس کے باعث قوم کے اعلےٰ اور سمجھہ دار طبقے کا وہ اعتقاد و اعتماد جو کسی زمانے میں نہایت عالمگیر اور اٹل تھا۔ آہستہ آہستہ اُن پر سے اٹھتا اور ہٹتا چلا گیا۔ اور اِس کام میں دینیات (چرچ) کے ساتھ کھلم کھلا لڑنے جھگڑنے والوں کی نسبت اُن لوگوں نے بہت زیادہ حصہ لیا۔ جو بظاہر اس جھگڑے سے بالکل ہی الگ تھلگ نظر آتے تھے (یعنی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ)، جو ایشیا اور افریقہ میں اپنے اپنے عقائد کا پرچار کر رہے تھے۔ لیکن دھرم پرچار کے متعلق ان کی یہ زبردست خواہش مسلمانوں کے مذہبی عقیدت کے مقابلے میں کچھہ بھی نہ تھی۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ یورپ میں عیسائیت کا اثر روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ اور پادری لوگ اپنے اُن کروڑوں پیروؤں کو اپنے تعاون سے بالکل محروم رکھہ رہے تھے۔ جو عیسائیت کی زندگی سے لاپرواہ ہو چکے تھے۔ یا جن کا اعتقاد عیسائیت پر سے ہل گیا تھا۔ کیونکہ سیاسی نقطہ خیال سے بھی اسکا نتیجہ کچھہ نقصان دہ نہیں تھا۔

آج کل بھی کئی علامات اس رگڑ اور کشمکش کی ایسی ہیں۔ جو روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ کیونکہ عیسائیت کے مختلف فرقہ جات میں بہت سے مسائل و عقاید اب بھی عملی طور پر انسانی سمجھہ بوجھہ کی حد سے باہر ہیں۔ جن پر کوئی بھی سمجھہ دار شخص اپنی معمولی عقل و تمیز سے کام لیتا ہوا ایمان نہیں لا سکتا۔ مگر کسی بھی قوم کے معمولی افراد منطق و دلائل کے دیوانے نہیں ہوتے۔ اور اُن کی روزانہ زندگی و اخلاق کی بنیاد

ہی ایسا رہا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے لوگ اسکی نمائشی چمک دمک پر لٹو ہو کر اس کی طرف کھچے جا رہے تھے۔ مگر اب اس کی قلعی کھل گئی تھی۔ اور وہ اس کی اصلیت سے آگاہ ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی اسے ہی جرمنی کے زوال اور تباہی کا باعث قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اسکی تمام ذمہ داری ان خود غرض اور مطلب پرست لوگوں پر ہی تھی۔ جو اپنے مخالفوں کی معقول سے معقول بات کو بھی ٹھنڈے دل سے نہیں سُن سکتے۔ اسے فائدہ اٹھانا تو بہت دُور کی بات ہے۔

اس لئے ہر سمجھدار شخص یہ آسانی یہ دیکھ سکتا تھا۔ کہ جرمن پارلیمنٹ نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا۔ وہی نامکمل رہا یا ناکامیاب ثابت ہوا۔ مثلاً اس کے اتحاد و اتفاق کی پالیسی کو ہی لے لیجئے۔ وہ ارباب حکومت کی ناقابلیت کا ماتم کرتی ہوئی دکھائی دے گی۔ اگرچہ انہوں نے دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کی کوشش ضرور کی۔ مگر پھر بھی وہ جنگ کو نہ روک سکے۔ اسی طرح پولینڈ کے متعلق بھی اُس کی پالیسی سراسر ناکام رہی۔ اور انہوں نے پولینڈ والوں کو ناراض کر لیا۔ ساتھ ہی اس کے روس سے بھی فضول کی دشمنی پیدا کر لی گئی۔ ایلکس اور لورین کے سوال کا جو حل انہوں نے کیا۔ وہ بھی بالکل ناقابل اطمینان رہا۔ سر چڑھے فرانسیسی سانپ کا ہمیشہ کیلئے پوری طاقت سے کچلنے کی بجائے انہوں نے ویسے ہی بنا کر اسے چھوڑ دیا اور وہ کرتے ہی کیا، ملک بھر میں بڑے بڑے عیاروں اور دھوکے بازوں نے مختلف پارٹیوں کے روپ میں اپنے اپنے مضبوط اڈے تیار کئے تھے۔ مثال کے طور وبٹرے کی سنٹرل پارٹی کو ہی دیکھ لیجئے! جسکا ایک عرصے سے خوب بول بالا رہا ہے۔ یہودیوں نے اپنے مارکس پرست سوشلسٹ پریس کی طاقت سے دنیا بھر میں حکومت جرمنی کی جنگی پالیسی کے خلاف جھوٹا پرچار کرکے جرمن قوم کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اور نہ اُن سوشلسٹ پارٹیوں نے جرمنی کی قومی فوج کو مضبوط طاقت ور بنانے میں ہی کچھ مدد دی تھی۔

ملک ایک نہایت زبردست انقلاب کے ہنگامہ خیز طوفان میں پھنسا ہوا تھا۔ عوام کی مذہبی زندگی کمزور ہو جانے سے مذہب کی تمام اصلی طاقت بھی ایک بہت بڑی حد تک زائل ہو گئی۔ اور مذہب صرف ایک نمودی و نمائشی چیز رہ گیا۔ اور اسی سے دوسری طرف عوام کی خوش اخلاقی اور نیک چلنی کی بھی تباہی و بربادی کا زبردست خوف پیدا ہو گیا۔ جس سے تمام قوم کسی طرح بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔

لیکن ہماری قومی عمارت میں آئی اُن درزوں اور درازوں کی اب بھی نہایت آسانی سے مرمت کی جا سکتی تھی۔ بشرطیکہ اُن پر اور کسی طرح کا بھی کوئی بوجھ نہ لادا جاتا مگر چند اہم واقعات سے پیدا شدہ تاثرات کی بدولت ملک میں جو انقلاب رونما ہوا تھا۔ اُس کا کچھ نہ کچھ اثر اس کمزور عمارت پر پڑنا لازمی و لابدی تھا۔ یہ تمام خرابیاں جو حکومت کی ملکی و خارجی پالیسی کو آہستہ آہستہ تہ و بالا کر رہی تھیں کسی دُوراندیش تیز نظر مدبر کی دُور بین نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ اکثر مدبروں نے ان علامات کو دلی تکلیف اور بےچینی بھری نظروں سے دیکھا۔ اور حکومت کی اس نقصان دہ مذموم پالیسی میں اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ارباب حکومت کی اس بارے میں لاپرواہی کی مذمت بھی کی۔ کیونکہ وہ اس کے اندرونی کھوکھلے پن کو اچھی طرح جانتے تھے۔ لیکن میدان سیاسیات میں وہ صرف نووارد تھے۔ اسلئے اُنکی مذمت حکومت کے حلقوں میں کچھ زیادہ اثر نہ رکھتی تھی۔ اور اُس وقت بھی اقلیت کی معقول سے معقول بات کو اسی طرح نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ جس طرح کہ آج کل!

ایسے مدبر اپنے متعلق سوچنے میں خواہ کتنے بھی حماقت بیگ کیوں نہ ہوں۔ مگر انہیں ہمیشہ دوسروں کی فکر دامنگیر رہتی ہے۔ ان کی بہت سی خام خیالیوں میں سے ایک خام خیالی یہ بھی تھی۔ کہ زمانہ انقلاب کے بعد سے ہی جو پارلیمنٹری طریق حکومت رائج تھا وہ پہلے سے بہت کچھ مختلف تھا۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اُس کا حال ہمیشہ سے

اس زمانے کے جرمن حکام اور افسروں کو خواہ آج کل ہم نوکرشاہی کے غلام ہی کیوں نہ کہیں۔ مگر وہ دوسری قوموں کے حکام اور افسروں کی نسبت بدرجہا اچھے تھے۔کیونکہ ان کے پاس نہ تو ایسے مضبوط و کارآمد ہتھیار ہی تھے اور نہ ایسے ہوشیار سمجھدار فرض شناس اور کبھی بھول نہ کرنے والے افسر و سپاہی ہی غرضیکہ کسی قدر بداطوار ہوتے ہوئے بھی جاہل اور لاعلم رہنے کی نسبت رجیسے کہ آج کل اکثر آدمی نظر آتے ہیں) ایمان دار نیک چلن اور قابل اعتماد بنے رہنا نیز اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے علم و ہنر پر فخر کرتے رہنا ہی ہمارے لئے ہزار درجہ اچھا اور قابل تعریف ہے۔ اگر ساتھ ہی اُس کے بدچلنی و بداطواری کے عیب سے بھی ہم پاک ہوں۔تب تو کہنا ہی کیا ہے؟

اُس وقت جرمن افسر اور نظام حکومت دونوں ہی خاص طور پر شخصی حکمرانی کے اثر سے آزاد تھے۔کسی طرح کا بھی کوئی غیر مستقل خیال اُن کی سیاسیات پر اپنا اثر جما سکتا تھا۔ مگر انقلاب نے اُس کی کایا پلٹ دی۔ پارٹی بازی کے خیال نے قابلیت ولیاقت کے معیار کو بھی نظرانداز کرا دیا۔ کیونکہ ذاتی اوصاف کی قدر و قیمت کی بجائے سفارشی ٹٹوؤں کا بول بالا ہو رہا تھا۔ اسی لئے حکومت کے کرتا دھرتا یعنی فوجی اور سول افسروں نے آپس میں مل ملا کر قدیم حکومت کی حیرت انگیز طاقت کے تمام اثرات کو آہستہ آہستہ زایل کر دیا تھا۔

تھے۔ لیکن دنیا میں بالکل ہی بے نقص چیز کونسی ہے۔ اسکے برعکس ہمارے دشمن زبردست اور ہوشیار تھے کہ وہ ہماری ہر ایک غلطی سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیتے تھے۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جبکہ تمام انتخابات کے موقع پر فوجی سپاہیوں نے اپنی رائے کا اظہار کرکے قوم و ملک کی پوری پوری خدمت کی تھی۔ یہودی جمہور نوازی" یا اکثریت کے خیال کا پجاری ہوتے ہوئے بھی ہر ایک فوجی سپاہی اپنی ذاتی اور انفرادی رائے رکھتا تھا۔ کیونکہ عہدِ گذشتہ میں اُسے اس امر کی تعلیم دی گئی تھی کہ اس زمانہ میں ایک سپاہی کے لیۓ کیا کیا اوصاف ضروری تھے۔ نزاکت، نامردی اور بزدلی کے شرمناک بحر ذلالت سے دور رہ کر اپنی مردانہ طاقت و قوت، ہمت و جرأت اور دلاوری و جانثاری پر ہی فخر کرنے والے ۳ لاکھ نوجوان ہر سال فوجوں میں داخل ہُوا کرتے تھے۔ اور دو سال تک فوجی تعلیم پانے کے باعث انکے عالم شباب کی تمام نزاکت اور کمزوری ہمیشہ کے لیۓ اُنسے دُور ہو جایا کرتی تھی۔ جس سے اُنکے جسم فولاد کی مانند مضبوط ہو جاتے تھے۔ یہ اُسی دو سال کی فوجی ڈسپلن اور فرمانبرداری کا نتیجہ تھا۔ کہ ہر ایک نوجوان میں حکومت کرنیکی قابلیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور اپنی معمولی سمجھ بوجھ سے ہی ہر شخص یہ جان سکتا تھا۔ کہ وہ ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ فوجی سپاہی ہے۔

غرضیکہ یہ رضار کار فوجیں ہی جرمن قوم کی وہ تعلیم گاہیں تھیں۔ جن میں رہ کسی وجہ سے یا کسی لالچ اور حرص یا بغض و حسد کے جال میں پھنس کر کبھی کوئی سپاہی بھول کر اپنے دل میں یہ خیال نہیں لا سکتا تھا کہ اس کی قوم کسی طرح کمزور ہو جائے یا اس کے ہموطن شہری بالکل غیر مسلح رہ کر بیدست و پا بنے رہیں غرضیکہ عہد گذشتہ کے دورِ حکومت میں فوج اور قوم کی اس تیاری و ساخت میں اس زمانے کے ارباب حکومت نے اپنی بے اندازہ قوت و طاقت خرچ کی تھی۔ اور اسی لیۓ دنیا بھر میں جرمن حکومت کی خوش انتظامی اور تنظیم بے مثال مانی جاتی تھی۔

مفتوح لوگوں کے دلوں پر اپنے رحم و ہمدردی کا سکہ جمائے رکھنا ہی سب سے اچھی بات ہے ایسی حالت میں وہ جو بھی اصول عوام کے ہوں۔ پیش کرینگے۔ وہ کبھی نقصان دہ یا بے چینی پھیلانے والے ثابت نہ ہونگے۔ اسطرح پہلے سختی اور بعد میں نرمی کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ اس کے یہ معنی ہونگے۔ کہ وہ قوم انسانیت کی پہلی حدود سے گزر کر وحشی پن کے راستہ پر قدم بڑھا رہی ہے۔ سیاسی نقطہ خیال سے اسکا انجام صرف ظلم و ستم پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے خلاف انسانیت وحشی پن کیساتھ ہی نسلی تنزل اور وغلہ پن بھی شروع ہو جاتا ہے۔ قدرتاً اسپر کچھ لوگ ہنستے اور مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ لیکن لاکھوں برس سے آہستہ آہستہ اس دنیا کی یہی حالت ہوتی جارہی ہے۔ اور یہ تب ہی ہوتا ہے۔ جبکہ انسان یہ بھول جاتا ہے۔ کہ اسکی ہستی دیوانہ پن اور جنون کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ہزارہا سال پرانے قدرتی اصولوں پر نہایت سختی کیساتھ عمل کرنے اور ان کی بدولت حاصل شدہ خداداد عقل و فہم کے زور و طاقت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور جب یہ بنیادیں کھوکھلی یا کمزور ہو جائینگی۔ تب اسکا بھی قائم رہنا ناممکن ہوگا +

وہ تمام صفات جنکی دنیا میں کچھ عزت کی جاتی ہے۔ مثلاً علم و ہنر مختلف فنون و فنتا یجادات وغیرہ وغیرہ انکی دریافت کا سہرا خاص خاص قوموں کی طاقت عقل و فہم کے سر پر ہی ہے۔ اور بنیادی طور پر شاید وہ سب ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے اپنی ہستی کی پائداری و مضبوطی کیلئے تہذیب و اخلاق کو اکثر ان ہی پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ کسی طرح تباہ و برباد ہوگئیں۔ تو دنیا کی تمام خوبصورتی و دلفریبی بھی اُن ہی کے ساتھ ہی ساتھ خاتمہ ہو جائیگا +

اگر ہم (۱) نسل انسانی کو تہذیب عالم کی بنیاد رکھنے والے (۲) اسمیں حسب ضرورت اصلاح کرنے والے (۳) اسے تباہ کرنے والے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہیں تو یقیناً انمیں سے پہلے فریق میں آریہ نسل ہی جگہ پائیگی۔ جس نے اپنی تعداد و شمار میں

قوم اور نسل

۱۱

تاریخ میں ایسی بے شمار نظیریں مل سکتی ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسطرح آریہ نسل کا خون دوسری ادنےٰ النسل کی قوموں سے مل گیا۔ اس کا انجام یہ ہؤا۔ کہ ہمارے ملک میں بہت سے خاندانوں کا بھی جو آریہ نسل کے محافظ تھے آہستہ آہستہ خاتمہ ہوگیا۔ شمالی امریکہ میں زیادہ تر ایسے ہی جرمن آباد ہیں۔ جنہوں نے ادنیٰ نسل کی قوموں سے بہت کم میل ملاپ کیا ہے۔ اس لئے اُن کی نسلی و تہذیبی پاکیزگی جنوبی امریکہ میں آباد لاطینی باشندوں کی نسبت بدرجہا افضل و برتر ہے۔ جن کا خون وہاں کے اصلی باشندوں کے خون اور نسل کیساتھ بہت اچھی طرح مل گیا۔
متذکرہ بالا مثال کو پیش نظر رکھ کر نسلی دوغلے پن کے نتائج بڑی اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ کہ براعظم امریکہ میں آباد جرمن نسل کے لوگوں نے اپنی پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے اُس ملک پر اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ اور آئندہ بھی تب تک وہ اپنی وہی شان قائم رکھنے میں ہر طرح کامیاب رہیں گے۔ جب تک کہ ادنیٰ النسل کی قوموں سے ربط وضبط بڑھا کر وہ اپنی خوبیوں کو تباہ و برباد نہ کر دینگے۔ نیز دوغلی اولاد پیدا کرنے کی غلطی کے مرتکب نہ ہوں گے۔
جب کوئی قوم دنیا میں فتح حاصل کر کے دوسروں کو مغلوب کر لیتی ہے۔ اور اُن پر ہر طرح اپنا اقتدار قائم کر لیتی ہے۔ تب اُسکے لئے پرامن طریقوں سے

اور جانتے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ لیکن اس کی بیرونی علامات مثلاً مختلف دریافتوں تحقیقاتوں۔ ایجادوں۔ عمارتوں اور تصویروں وغیرہ کی بدولت دوسرے انہیں بآسانی پہچان سکتے ہیں۔ مگر خود انہیں اپنے آپ کو جاننے اور سمجھنے میں کثر بہت دیر لگتی ہے۔ جیسے کسی انسان کی زندگی میں اسکی کوئی خاص قابلیت یا کوئی غیر معمولی صفت صرف اسی وقت ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ کسی پیچیدہ سوال کے سامنے آجانے یا کسی ایسے خاص موقعہ پر گردوپیش کے حالات اسکی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ویسے ہی قوموں کی زندگیوں میں انکی عظیم الشان حقیقی طاقتیں بھی (جو معمولی حالات میں کبھی دکھائی بھی نہیں دیتیں)، خاص خاص اہم موقعوں پر ظاہر ہو کر نمایاں صورت اختیار کر لیتی۔ اور انہیں ترقی و عروج کی غیر معمولی منزلوں تک پہنچانے کا باعث بن جایا کرتی ہیں لیکن یہ بھی اسی ایک نسل کی قوموں میں زیادہ تر دکھائی دیتا ہے۔ جو شروع سے ہی انسانی تہذیب کی ترقی یافتہ زندگی کی واحد بنیاد رہی ہے۔ اور اب بھی ہے۔ وہ نسل تہذیب و ترقی کی قدیم پجاری "آریہ نسل" ہی ہے۔ اور اس کے سوا دوسری کوئی نہیں!

غرضیکہ اعلےٰ تہذیب کی خاطر خواہ ترقی کے لئے مختلف ادنی تہذیبوں اور ان کے پیروؤں کی موجودگی بھی نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ وہی تو اس وقت اس کی ترقی کا ایک موزوں زینہ ہیں۔ جن کے بغیر کسی اعلےٰ تہذیب کی خوبیاں انسان کی سمجھ میں آسکتیں ہیں اور نہ دنیا میں ان کی کچھ قدر و قیمت ہی ہو سکتی ہے۔ مثلاً جب ابتدائے عالم میں مہذب انسانوں نے جانوروں کو پال پال کر ان سے اپنا کام لینا شروع کیا۔ تو اس سے بھی پہلے وہی سب کام اپنے سے کم تہذیب یافتہ لوگوں سے لیا کرتے تھے۔ اسی طرح جب انہوں نے کچھ غیر مہذب قوموں کو اپنا غلام بنا لیا تبھی اس کے بعد حیوانات کی بھی قسمت جاگی۔ کیونکہ پہلے غلاموں سے ہل کھچوایا جاتا تھا بعد

کم ہونے کے باوجود بھی دنیا میں دوسری نسلوں اور قوموں پر فتح حاصل کی۔ دوران دتی قوموں کی مدد سے جو اس کے ماتحت آئیں۔ اس نے اپنے فتح کردہ ممالک میں وہاں کی ضروریات کے مطابق ہی ترقی و اصلاح کا دور شروع کر دیا۔ اور اس طرح وہاں کی سرزمین کی طاقت پیداوار۔ آب و ہوا اور اصلی باشندوں کو ایک نظام کے ماتحت کام کرنے کی قابلیت اور انکی دماغی طاقت کے صحیح استعمال سے وُہ میدان ترقی میں آگے ہی آگے قدم بڑھاتی چلی گئی۔ اور چند ماہ کے عرصے میں اس نے اپنے مفتوح ممالک اور قوموں کی مقامی حالت کے مطابق وہاں کی تہذیب میں بھی ضروری ردّ و بدل کر کے اُسے کچھ اور ہی شکل دے دی۔ یہی حقیقتاً مختلف تہذیبوں کے باہمی اختلاف و مشابہت کا نمایاں باعث کہا جا سکتا ہے +

لیکن جہاں ان فاتحوں نے زمانہ کی رفتار کیساتھ ہی ساتھ اپنے خون اور نسل کی پاکیزگی کو قائم رکھنے کے اصول کو نظر انداز کر کے مفتوح قوموں اور نسلوں کے لوگوں کیساتھ میل جول بڑھا کر رشتہ و رابطہ یگانگت بھی پیدا کرنا شروع کر دیا۔ وہاں ہی اس پاپ کی بدولت انہیں گراوٹ شروع ہو گئی۔ اور آہستہ آہستہ وُہ ایسے گرے کہ انہوں نے اپنی جداگانہ و آزاد ہستی کو بھی ان ہی میں غائب کر دیا۔ کیونکہ انسان جو بھی گناہ کرتا ہے۔ اسکی بدولت اسکی عظمت و شان لازمی طور پر کچھ نہ کچھ کم ہی ہوتی ہے۔ بڑھتی ہرگز نہیں +

دنیا میں ہمیشہ سے ہی اعلےٰ قومیں افضل و برتر مانی جاتی رہی ہیں۔ خواہ کوئی بیرونی مشاہدہ کار اسے سمجھے یا نہ سمجھے لیکن پھر بھی اگر اور کچھ نہیں۔ تو انکی غیر معمولی لیاقت و قابلیت ہی اُن مشاہدہ کرنے والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اور انہیں انکی عظمت و اہمیت کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں [illegible] ایسے بھی ہیں۔ جو خود بھی اپنی پوشیدہ دخوابیدہ طاقتوں کو سمجھنے

مگر کہیں کہیں آریوں نے اپنے خون کی پاکیزگی کا پھر اظہار کر دیا۔ یہ اپنی بنائی ہوئی دنیا وہی بہشت پر اپنا ہی قبضہ ظاہر کیا۔ لیکن اپنے اس نسلی میل جول کو دیکھ کر وہ بحر فکر میں ڈوب گئے۔ اور ان کے تعجب کی کوئی حد نہیں رہی۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ وہ تہذیب کی توسیع کیساتھ ہی ساتھ اپنے بزرگوں کی نسبت بحیثیت قوم کہیں بہت زیادہ ملتے جلتے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ ابھی کچھ مدت تک اپنی اس اعلے تہذیب کا لطف لے سکتے تھے مگر اسکی طرف سے لاپرواہی اختیار کر کے انہوں نے سخت غلطی کی۔ اس سے یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہے۔ کہ قدیم تہذیبوں اور سلطنتوں کو کس طرح زوال پہنچ کر انکی بجائے نئی تہذیبیں اور سلطنتیں رونما ہوتی رہی ہیں +

یہودیوں کے دماغی اوصاف میں بھی یہ تبدیلیاں نمودار ہوتے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ حتیٰ کہ آج ہم انہیں عیاری و مکاری کا پتلا سمجھتے ہیں حقیقتاً وہ ہمیشہ ایسے ہی تھے۔ اور آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے۔ انکی یہ دماغی قابلیت ان کی شخصی ترقی کے باعث نہیں۔ بلکہ غیروں کی دی ہوئی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ لیکن چونکہ شروع سے ہی یہودیوں کی اپنی کوئی خاص تہذیب نہیں رہی۔ اسلئے ان کی دماغی لیاقت کی بنیاد بھی اوروں کی ہی قائم کردہ ہے۔ اور ہر زمانے میں ان کے خیالات کو اپنے ہمسایوں کی تہذیب و تعلیم سے ترقی و نشوونما حاصل ہوتی رہی ہے۔ اس کے سوا اسکی وجہ اور کچھ بھی نہیں +

ساتھ ہی اس کے یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ کہ یہودی ہمیشہ ہی اپنے پڑوسیوں سے لڑتے بھڑتے انہیں لوٹتے کھسوٹتے رہے ہیں۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے انمیں بھی قربانی و ایثار نفسی کا مادہ موجود ہے۔ حالانکہ اس بارے میں خود یہودیوں نے کسی بھی طرح کا کوئی رخ کبھی اختیار نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہودی قوم جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ بھی کوئی انسانی تہذیب یا نسل قائم کرنے یا مستقل

میں انکی بجائے بیل اور گھوڑے جوتے جانے لگے۔ شاید آج کل امن داماں کے بہت سے چھوٹے پجاری انسانوں سے ہل کھچوانے کو انسانی کمینہ پن کی آخری حد خیال کریں مگر انہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیئے۔ کہ انسانی تہذیب کا ترقی کی ان تمام منزلوں میں سے گذرنا کتنا لازمی و لابدی تھا۔ اور بغیر اس کے دیوتا بھی جہالت و لاعلمی کی اس تاریکی کو کیسے دور کر سکتے تھے ؟

درحقیقت انسانی تہذیب کی ترقی ایک لامحدود زینے کی مانند ہے۔ اس پر ہر ایک انسان رفتہ رفتہ نیچے سے ہی اوپر کو چڑھتا ہے۔ یکایک کوئی بھی اوپر نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے آریہ جاتی کو بھی اسی آزمائے ہوئے راستے کی پیروی کرنی پڑی۔ مگر ان کا یہ راستہ بالکل صاف تھا۔ ایک فاتح کی حیثیت سے انہوں نے مفتوح لوگوں کو مغلوب کر لیا تھا۔ اس لئے وہ انہیں اپنے قابو میں کر کے ان سے حسب منشا کام لینے لگے۔ اگر وہ ان سے اپنے لئے کچھ مفید کام لیتے تھے۔ تو اس کے معاوضہ میں وہ صرف ان کی جان کی ہی مناسب طور پر حفاظت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انہیں انکی پہلی جنگلی اور وحشیانہ ہستی کی نسبت ایک زیادہ خوبصورت اور ترقی یافتہ ہستی کے سانچے میں بھی ڈھال رہے تھے۔ جسے دوسرے الفاظ میں "آزادی" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے ۔

اسطرح جب تک آریہ لوگ اپنے آپ کو حکمران سمجھتے رہے۔ تب تک انہوں نے نہ صرف اپنی ماتحت اقوام پر اپنا قبضۂ اقتدار ہی قائم رکھا۔ بلکہ انہیں تہذیب کے اعلے درجوں پر پہنچانے۔ ترقی دینے اور وہاں انہیں قائم رکھنے میں بھی اپنی سب کوششوں کو لگا دیا۔ پھر جیسے جیسے وہ مفتوح لوگ ترقی کرتے گئے ان کی زبان بھی شاید فاتحوں کی زبان جیسی ہوتی گئی۔ اور اسطرح آہستہ آہستہ فاتح اور مفتوح اور آقا و غلام کی درمیانی خلیج بھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ اور آخر دونوں میں بہ حیثیت ایک انسان کے کچھ بھی فرق نہ رہا

انسان کے رحم پر زندگی بسر کرنے اور انکے پیچھے پیچھے چلنے والے ہی تھے۔ اسلئے ہر موقع پر انکی فضائے زندگی میں جو تبدیلی ہوتی ہے۔ اسکا انحصار انکی اپنی خواہش پر تھا۔ بلکہ ان قوموں کی فیاضی پر تھا۔ جن کی عنایات کا انہوں نے ہمیشہ ہی نہایت شرمناک استعمال کیا ہے۔ ماسوائے اسکے دوسری پیچھے پیچھے چلنے والی قوموں سے بھی انکی فضائے زندگی کچھ بالکل ہی نرالی رہتی ہے۔ اور یہ ہمیشہ ہی اپنی نسلی ترقی کے لئے نئے سے نئے سنہری روپہری موقع تلاش کرتے رہے ہیں +

دوسری قوموں کیساتھ انکی قومی زندگی صرف اسی وقت کچھ مشابہت رکھ سکتی ہے۔ جبکہ کسی کو انہیں یہ سمجھانے کا موقع ملے۔ کہ انسانی زندگی کا تعلق جتنا قومی معاملات سے ہے۔ اتنا مذہب سے نہیں۔ مگر انہیں یہ کچھ بہت ہی عجیب سی بات معلوم ہوگی ساتھ ہی اسکے یہ خیال کرنا بھی بالکل ہی غلط ہے۔ کہ دوسری قوموں کے پیچھے پیچھے چلنے کی جو عادت ان میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے متعلق انہیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ یہ انکی اندرونی خصلت نہیں ہے۔ کیونکہ یہودی اپنی دانشمندی جتنی بھی زیادہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اتنا ہی انہیں مکر و فریب سے کام لے کر اپنی اندرونی حقیقی خصلت کی مخالفت کے گناہ عظیم کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔ یعنی دل سے ایک مختلف مذہب کے پیرو ہونے پر بھی وہ دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ وہ ویسے ہی اطالین فرنچ۔ انگریز یا جرمن ہیں۔ جیسے کہ کوئی اور!

غرضیکہ زمانہ حال کی اقتصادی ترقی ہر ایک قوم کی زندگی کی فضا میں ایک عجیب و غریب انقلاب پیدا کر رہی ہے۔ چونکہ چھوٹی چھوٹی کمزور صنعتیں اور کاروبار آہستہ آہستہ تباہ ہو رہے ہیں۔ اسلئے محنت و مزدوری کرنے والے پیشہ داروں کیلئے یہ مشکل ہو رہا ہے۔ کہ وہ اپنی پہلی سی خوشحالی مالی حالت کو قائم رکھ سکیں۔ اس لئے وہ ایک نہایت ہی معمولی سی حالت میں رہنے کے لئے مجبور ہیں۔ اسی لئے وہ بڑے بڑے

ہستی رکھنے والی جماعت ہے۔ ہر طرح کی ملکی حدود سے آزاد ہے۔ کیونکہ خاص ملکی حدود کے اندر آباد رہنے والی قوموں کے دلوں میں اپنی نسل بزرگی کا جو اندرونی خیال موجود رہتا ہے۔ وہی انکی عظمت و اہمیت ظاہر کرتا ہے۔ اور اسی سے ان کے قومی و نسلی آدرش اور مقاصد کا پتہ چل جاتا ہے۔ جس قوم میں یہ خیال موجود نہیں۔ وُہ کبھی یہ دعوےٰ نہیں کرسکتی۔ کہ وہ کبھی کسی ایسی قوم یا نسل کو پیدا سکتی ہے۔ جو کسی محدود ملک کو اپنا مسکن یا وطن بنا سکے۔ اس لئے اس کے پاس کوئی بھی ایسی مستقل بنیاد نہیں ہوتی۔ جس پر وُہ اپنی تہذیب کو قائم کر سکے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اپنے نمایاں دماغی اوصاف کے باوجود یہودیوں کی کوئی بھی حقیقی تہذیب نہیں۔ اور نہ کوئی ایسا مشکوک تمدن ہی ہے جس پر کہ وُہ فخر کر سکیں۔ موجودہ زمانے میں انکی جو بھی تہذیب دکھلائی دیتی ہے وُہ صرف دوسروں سے عاریتاً لی ہوئی دولت و ثروت ہے۔ اور وُہ بھی آج کل ان کے قبضہ میں آکر ناپاک ہو رہی ہے +

ابتداً شاید آریہ لوگ بھی پردیسی ہی تھے۔ مگر بعد میں رفتار زمانہ سے دوسری قوموں کیساتھ مل جل کر وُہ جہاں بھی گئے۔ وہیں کے باشندے بن گئے۔ مگر یہ صاف طور پر ثابت ہے۔ کہ وُہ کسی بھی حالت میں یہودی نہ تھے۔ اور نہ یہودی ہی آریوں کی مانند پردیسی کہلا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان آریہ پردیسیوں کا بھی تو مقررہ طریقہ اور پروگرام تھا جس سے انکی ترقی کا راستہ بھی پختہ بنیادوں پر قائم تھا۔ اور وُہ اسی پر اپنی تمام فطرتی قابلیتوں سے کام لیتے ہوئے آئندہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہیں اپنے کسی ایک خاص آدرش کی پیروی کرنے کی طاقت بھی موجود تھی۔ اسلئے وُہ بظاہر کسی گری ہوئی اور کمزور حالت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے آدرش کی طاقت سے اپنی ہستی کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کر سکتے تھے۔ لیکن یہودیوں میں وُہ طاقت بھی نہ تھی۔ اس لئے وُہ نہ تو پردیسی ہی تھے۔ اور نہ دیسی ہی۔ بلکہ صرف دوسری قوموں کے بھروسے

کے رکھیہ یہ تو خوب اچھی طرح مانتے ہیں۔ کہ اپنا قصور غیروں کے سر کس طرح منڈھا جا سکتا ہے۔ اسلئے جب سے انہوں نے عوام کا لیڈر بننے کا ارادہ کیا ہے۔ تبھی سے یہ اور بھی زیادہ مکار و عیار ثابت ہو رہے ہیں +

غرضیکہ ان یہودیوں کے طریق عمل کی ابتدا اسطرح ہے۔ کہ پہلے تو یہ اپنے آپکو نہایت سرگرم کارکن ظاہر کرتے ہوئے لوگوں کی قابل رحم حالت سے ہمدردی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے مصائب و افلاس پر نفرت بھرا غم و غصہ ظاہر کرکے انکے دلوں میں اپنے لئے اعتبار و اعتماد پیدا کرتے اور بڑھاتے رہتے ہیں۔ مگر عوام کی مشکلات زندگی کا اصلی یا نمائشی مطالعہ کرنے میں سخت دقت در پیش ہوتی ہے کیونکہ وہ درحقیقت اُن حالات میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ اس طرح وہ اپنی ناقابل بیان ہوشیاری و معاملہ فہمی سے اس مجلسی انصاف کے لئے وقتاً فوقتاً اپنی آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ جس کی محبت اب بھی اور اس حالت میں بھی آریہ نسل کے بچے بچے کے دل میں ایک خوابیدہ خواہش کی طرح موجود ہے۔ لیکن اس پردے میں بھی یہودیوں کا صرف مقصد چھپا رہتا ہے۔ کہ کس طرح وہ مارکس ازم کے اصولوں کا عوام میں پرچار کرکے اُن کی بنیادیں مضبوط کرتے رہیں۔

غرضیکہ وہ اس پراسرار طریق سے ان اصولوں کو عوام کے مناسب اور مبنی بر انصاف مطالبات کے ساتھ شامل کرکے انہیں عوام میں ہر دلعزیز بنانا چاہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کے اُن کی یہ بھی خواہش رہتی ہے۔ کہ کس طرح عوام اپنے اُن مطالبات پر جنہیں یہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ یا جو اُن کے اپنے مفاد کے خلاف ہیں۔ زور نہ دیں اور آہستہ آہستہ انہیں بالکل ہی چھوڑ بیٹھیں۔ کیونکہ ان کی ... نظروں میں ان کے متعلق شروع میں ہی آواز اٹھانا ایک سخت غلطی ہے۔

یہودی اپنی دنیاوی تعلیم کے نظام کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جو

سرمایہ دار کارخانوں کے غلام بن کر آہستہ آہستہ انسانی زندگی کے تمام آرام و آسائش سے محروم ہوتے جاتے ہیں۔ حقیقی معنی یہ ہیں۔ کہ ان کے بہت سے بنیادی انسانی حقوق رفتہ رفتہ ان سے چھن رہے ہیں۔ لہٰذا بڑھاپے کا شکار ہونے سے پہلے ہی انکی سنہری زندگی پیش از وقت خاک میں مل رہی ہے +

ابھی کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا کہ ہماری جرمن قوم کو اس قسم کے کئی اہم سوالوں کا ایک مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں مرد و عورت دیہات چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں آباد ہونے لگے۔ کیونکہ دیہات میں اب ان کے لئے کوئی بھی روزگار نہیں تھا اور زندگی کے دن بھی جیسے کیسے گذارنے ضروری ہی تھے۔ اس لئے انہیں شہروں میں آنے کیلئے مجبور ہونا پڑا۔ آہستہ آہستہ شہروں میں ایک نئی جماعت پیدا ہونے لگی۔ جسکی حالت پر ہم نے ابھی تک پورا پورا دھیان نہیں دیا۔ لیکن ایک دن جلد آنے والا ہے۔ جبکہ ہمیں اس سوال پر غور کرنا پڑے گا۔ کہ ہمیں اس نئی جماعت کو بھی شہروں کی معمولی آبادی میں شامل کر کے ان کی مدد سے اپنے کارخانوں اور ان کے کاروبار کو زیادہ مضبوط بنانا چاہیئے۔ یا شہروں کی پرانی اور اس نئی آبادی کے درمیان جو خلیج اسوقت نظر آرہی تھی۔ اُسے روز بروز زیادہ سے زیادہ وسعت دیتے رہنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ وُہ ایک مستقل صورت اختیار کرے۔ لیکن ایک طرف تو ہمارا درمیانہ طبقہ اس نہایت ہی مشکل سوال کی طرف سے لاپرواہی اختیار کر کے من مانی کارروائی کر رہا ہے۔ دوسری طرف یہودی مستقبل کے زبردست امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اُٹھانے کی فکر میں شب و روز لگ رہے ہیں۔ ادھر تو یہودی اپنے روپیہ کی طاقت سے انسانیت کو تباہ کرنے پر تلے ہیں۔ اور ادھر وُہ لوگوں کے دلوں پر اپنی پر فریب قربانیوں کا سکہ جما کر اس جنگ میں جو درحقیقت ان کے ہی خلاف ہے خود ہی عوام کے لیڈر بنے ہوئے انہیں اپنے مطلب کے لئے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وُہ جھوٹوں کے

تب ہی وہ اپنی مطلب پرستیوں اور خود غرضیوں کی تکمیل میں انہیں اپنے اشاروں پر نچاتے رہیں۔ اور اس طرح ملک کی اقتصادی ترقی کو تباہ و برباد کرنے میں ہر طرح کامیاب ہو سکیں
غرضیکہ جیسے یہودی ہر ایک میدان سے اپنے رقیبوں کو دور رکھنے اور بھگانے کے لئے ہر طرح کی چالیں چلتے ہیں۔ ویسے ہی وہ اپنی لالچ سے بھری حیوانی خصلت کے باعث ٹریڈ یونین تحریک کو بھی وحشیانہ حیوانی طاقت کے قدموں پر گرنے کیلئے مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس پر بھی کوئی دوراندیش ودانشمند شخص یہودی لالچ کے اس کپٹ جال میں نہیں پھنستا۔ تو اسے طرح طرح خوفزدہ کر کے اسکی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ اور خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ رہے۔ کبھی نہ کبھی کوئی ایسی غلطی کر ہی بیٹھتا ہے جس سے اُن کا اُلو سیدھا ہو جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اسی طرح یہودی اُن ہی ٹریڈ یونینوں کے ذریعہ قوم کی حفاظت کر سکتی تھیں۔ آج اس کی اقتصادی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

مگر سیاسی نظام بھی متذکرہ بالا طریق عمل کے متوازی خطوط پر ہی آگے ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ ٹریڈ یونین تحریک سے ہمدردی رکھتے ہوئے اس میں حصہ لینے اور عوام کو اس میں شامل ہونے کیلئے تیار کرنے میں ہی قوم وملک کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ روپیہ پیدا کرنے کا بھی یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی مدد سے سیاسی مشینری خوب اچھی طرح کام کر سکتی ہے۔ اور یہ تحریک دوسری ہر ایک سیاسی تحریک کو بھی اپنے قابو میں رکھنے اور تیز کرنے کیلئے وہی کام دے سکتی ہے۔ جو لگام اور چابک گھوڑے کو قابو میں رکھنے اور اس کی چال کو تیز کرنے میں کام دیتے ہیں۔ لیکن بالاخر اُسے بھی روپیہ کمانے کے متعلق اپنی اس خواہش کو ایک دن سیاسی مطالبات کی تکمیل کے لئے قربان کر دینا پڑتا ہے۔ اور موزوں وقت پر ہڑتال کا بگل بجا دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بظاہر مختلف ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر کسی طرح الگ نہیں سمجھے جا سکتے۔ یعنی اس سب اختلاف کے باوجود بھی اُن کا تعلق سیاسیات اور مزدور تحریک سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اُن میں سے مزدور تحریک کی اہمیت تو خاص طور پر قابل غور ہے۔ کیونکہ اپنی زبردست کشمکش اور جدوجہد سے ہی یہ مزدوروں کی طاقت بڑھاتی ہے۔ اور ہر طرح سے اُن کی حفاظت کرتی ہے۔ اضافہ مزدوری اور حقوق کے لالچ نیز غیر دور اندیشی اور بہ آسانی مورچہ لگانے کی طاقت سے ہی اس تحریک کو یہ ترقی نصیب ہوئی لیکن مزدور اپنے ان لیڈروں پر پورا پورا اعتماد کرنے سے گھبراتے ہیں۔ جو انکے حقوق کی حفاظت کرنے کے دعویدار ہیں۔ یا ایسے وقت میں جبکہ قوم باقاعدہ اور منظم طور پر اُن کے جائز مطالبات کی عملی حمایت کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی۔ وہ خود اپنی ذمہ واریوں کو اچھی طرح سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ آخر انہیں خود اپنے مفاد کی حفاظت کیلئے میدان عمل میں آنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ ادھر تو نام نہاد نیشنل بورژیوس پارٹی تو اپنی دولت اور سرمایہ داری کے نشہ سے سرمست ہو کر مزدور تحریک کی ہر ممکن طریق پر مخالفت کر رہی ہے۔ اور مزدوروں کی طرف سے اپنے اوقات مزدوری میں کمی کرانے۔ کم عمر بچوں سے کام نہ لئے جانے۔ عورتوں کی عزت وعصمت اور صحت کی مناسب حفاظت کرانے کارخانوں کی فضا کو زیادہ صحت بخش بنانے اور مزدوروں نیز اُنکے بال بچوں کی رہائش کے لئے زیادہ روشن ہوادار اور صاف ستھرے مکانات تیار کرانے کے متعلق جو بھی کوشش کی جاتی ہیں۔ ان سب میں ہی روڑا اٹکانے سے وہ باز نہیں آتی۔ اب آپ خود ہی یہ فیصلہ کر لیجئے۔ کہ ان خود غرض یہودیوں اور ان مطلب پرست کتوں میں کیا فرق ہے۔ جو ایک طرف چوروں سے یہ کہتے ہیں "کہ چوری کرو"۔ اور دوسری طرف سادھو سے کہتے رہیں۔ "کہ جاگتے رہو"۔ غرضیکہ یہ بدمعاش ٹریڈ یونینوں کی لیڈری پر قابو پانے کے لئے جو بھی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا منشاد مدعا صرف یہ ہے۔ کہ جب عوام آنکھیں بند کر کے اُن پر اعتماد کرنے لگیں۔

تب ہی وہ اپنی مطلب پرستیوں اور خودغرضیوں کی تکمیل میں انہیں اپنے اشاروں پر نچاتے رہیں۔ اور اس طرح ملک کی اقتصادی ترقی کو تباہ و برباد کرنے میں ہر طرح کامیاب ہو سکیں

غرضیکہ جیسے یہودی ہر ایک میدان سے اپنے رقیبوں کو دور رکھنے اور بھگانے کے لئے ہر طرح کی چالیں چلتے ہیں۔ ویسے ہی وہ اپنی لالچ سے بھری حیوانی خصلت کے باعث ٹریڈ یونین تحریک کو بھی وحشیانہ حیوانی طاقت کے قدموں پر گرنے کیلئے مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس پر بھی کوئی دور اندیش و دانش مند شخص یہودی لالچ کے اس کپٹ جال میں نہیں پھنستا۔ تو اسے طرح طرح خوفزدہ کرکے اسکی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ اور خواہ وہ کتنا بھی ہوشیار کیوں نہ رہے۔ کبھی نہ کبھی کوئی ایسی غلطی کر ہی بیٹھتا ہے جس سے اُن کا اُلو سیدھا ہو جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اسی طرح یہودی اُن ہی ٹریڈ یونینوں کے ذریعہ قوم کی حفاظت کر سکتی تھیں۔ آج اس کی اقتصادی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

مگر سیاسی نظام بھی متذکرہ بالا طریق عمل کے متوازی خطوط پر ہی آگے ترقی کر سکتا ہے۔ کیونکہ ٹریڈ یونین تحریک سے ہمدردی رکھتے ہوئے اس میں حصہ لینے اور عوام کو اس میں شامل ہونے کیلئے تیار کرنے میں ہی قوم و ملک کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ روپیہ پیدا کرنے کا بھی یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی مدد سے سیاسی مشینری خوب اچھی طرح کام کر سکتی ہے۔ اور یہ تحریک دوسری ہر ایک سیاسی تحریک کو بھی اپنے قابو میں رکھنے اور تیز کرنے کیلئے وہی کام دے سکتی ہے۔ جو لگام اور چابک گھوڑے کو قابو میں رکھنے اور اس کی چال کو تیز کرنے میں کام دیتے ہیں۔ لیکن بالآخر اُسے بھی روپیہ کمانے کے متعلق اپنی اس خواہش کو ایک دن سیاسی مطالبات کی تکمیل کے لئے قربان کر دینا پڑتا ہے۔ اور موزوں وقت پر ہڑتال کا بگل بجا دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بظاہر مختلف ہوتے ہوئے بھی بنیادی طور پر کسی طرح الگ نہیں سمجھے جا سکتے۔ یعنی اس سب اختلاف کے باوجود بھی اُن کا تعلق سیاسیات اور مزدور تحریک سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اُن میں سے مزدور تحریک کی اہمیت تو خاص طور پر قابل غور ہے۔ کیونکہ اپنی زبردست کشمکش اور جدوجہد سے ہی یہ مزدوروں کی طاقت بڑھاتی ہے۔ اور ہر طرح سے اُن کی حفاظت کرتی ہے۔ اضافہ مزدوری اور حقوق کے لالچ نیز غیر دور اندیشی اور بہ آسانی مورچہ لگانے کی طاقت سے ہی اس تحریک کو یہ ترقی نصیب ہوئی لیکن مزدور اپنے ان لیڈروں پر پورا پورا اعتماد کرنے سے گھبراتے ہیں۔ جو انکے حقوق کی حفاظت کرنے کے دعویدار ہیں۔ یا ایسے وقت میں جبکہ قوم باقاعدہ اور منظم طور پر اُن کے جائز مطالبات کی عملی حمایت کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی۔ وہ خود اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ آخر انہیں خود اپنے مفاد کی حفاظت کیلئے میدان عمل میں آنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ ادھر تو نام نہاد نیشنل بورجیوس پارٹی" تو اپنی دولت اور سرمایہ داری کے نشہ سے سرمست ہو کر مزدور تحریک کی ہر ممکن طریق پر مخالفت کر رہی ہے۔ اور مزدوروں کی طرف سے اپنے اوقات مزدوری میں کمی کرانے۔ کم عمر بچوں سے کام نہ لئے جانے۔ عورتوں کی عزت وعصمت اور صحت کی مناسب حفاظت کرانے کارخانوں کی فضا کو زیادہ صحت بخش بنانے اور مزدوروں نیز اُنکے بال بچوں کی رہائش کے لئے زیادہ روشن ہوا دار اور صاف ستھرے مکانات تیار کرانے کے متعلق جو بھی کوشش کی جاتی ہیں۔ ان سب میں ہی روڑا اٹکانے سے وہ باز نہیں آتی۔ اب آپ خود ہی یہ فیصلہ کر لیجئے۔ کہ ان خود غرض یہودیوں اور ان مطلب پرست کتوں میں کیا فرق ہے۔ جو ایک طرف چوروں سے یہ کہتے ہیں "کہ چوری کرو"۔ اور دوسری طرف سادھوں سے کہتے رہیں۔ "کہ جاگتے رہو"۔ غرضیکہ یہ بدمعاش ٹریڈ یونینوں کی لیڈری پر قابو پانے کے لئے جو بھی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا منشا و مدعا صرف یہ ہے۔ کہ جب عوام آنکھیں بند کر کے اُن پر اعتماد کرنے لگیں۔

کی دہائی مچاتے رہتے ہیں۔

اس طرح اگر ہم جرمن قوم کی تباہی کے بواعث پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ تو آخر ہمیں صاف طور پر یہ معلوم ہو جائے گا۔ کہ اس نسلی کشاکشی اور یہودی ہتھکنڈوں کی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھنے کا یہ سب کرشمہ تھا۔ ورنہ اگست ۱۹۱۹ء کی شکست کسی اور ہی صورت میں دکھائی دیتی۔ لیکن ہمارے گناہوں اور ہماری غلطیوں کی سزا تو ہمیں ضرور ملنی چاہیئے تھی۔ اگرچہ ان کی بدولت ہماری سلطنت کو کچھ بہت نقصان نہیں پہنچا۔ اور جتنا کچھ پہنچا۔ اسکا باعث ان طاقتوں کی زبردستی اور دھینگا دھینگی ہی تھی۔ جنہیں ہماری تباہی کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ مگر پھر بھی ان غلطیوں کی بدولت ہمارے وہ سب سیاسی و اخلاقی اوصاف مارے گئے۔ جو ہمیں اس گراوٹ سے بچا سکتے تھے۔ اور جنگی بربادی کے لئے یہ متذکرہ بالا دھوکے باز جماعت پچھلے کئی سال سے کوشاں تھی۔ کیونکہ گذشتہ حکومت نے ان چالبازیوں اور عیاریوں کا شکار ہو کر اس نسلی سوال کو بالکل ہی نظرانداز کر دیا تھا۔ جو اس دنیا میں ہماری سیاسی زندگی کا واحد سہارا بن سکتا تھا۔ کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کہ نسلی پاکیزگی میں کوئی خرابی پیدا ہو جانے سے خاندانی اہمیت و عظمت ہمیشہ کے لئے خاک میں مل جاتی ہے۔ اور جس خاندان سے یہ پاکیزگی غائب ہو جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ تباہی و بربادی کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ اور آخرکار اس خاندان کی آئندہ نسلوں کی کمزوری کے باعث اپنی خاندانی عظمت و اہمیت کی سب یاد بھی اسکے صفحۂ دل سے ہمیشہ کے لئے ایسی مٹ جاتی ہے۔ گویا کہ اسے موجودہ ذلت و پستی کے سوا اور کچھ کبھی نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔

اس طرح قومی اصلاح کے متعلق سبھی کوشش۔ باہمی امداد و ترقی کے لئے سبھی مجلسی سرگرمیاں اقتصادی بہتری و بہبودی کے بارے میں سبھی تمام تجاویز سائنٹفک نشوونما کی سبھی خواہشات یکے بعد دیگرے فضول و بے سود ثابت ہوتی گئیں۔ حالانکہ

اخبارات اور پریس کی مدد سے سیاسی اور مزدور تحریک دونوں کے لئے کم و بیش پڑھے لکھے لوگوں کے دلوں میں بھی ایک ایسی زبردست ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ وہ سب قومی و ملکی بہتری و بہبودی کے خیال پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام دونوں ہی نہایت مضبوط ہو جاتے ہیں لہٰذا ملک کی تمام طاقتیں بہت کچھ بڑھ جاتی ہیں۔

لیکن شیطان یہودی پریس اس بارے میں بھی اپنی مطلب پرستیوں سے مجبور ہے اور وہ ان سب زندگی بخش ذرائع پر کیچڑ اُچھال اُچھال کر اُن کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ وہ ان سبھی لوگوں کی مخالفت کرتا رہتا ہے۔ جو یہودیوں کے جبر و تشدد کی کچھ بھی پرواہ نہ کر کے انکے خلاف کام کرتے رہنے کا تہیہ کر لیتے ہیں۔ کیونکہ جو لوگ یہودیوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے یہودی اُنسے خود خوف کھانے لگتے ہیں۔ اور درحقیقت یہودیوں کی اس خصلت سے عوام کی لاعلمی اور اعلٰے طبقات سے تعلق رکھنے والے معاملہ فہم دوراندیش لوگوں کی ان معاملات میں ناتجربہ کاری ہی یہودیوں کو اُنکے تمام خودغرضانہ حملوں اور پُرفریب چالوں میں کامیاب کر رہی ہے۔

اعلٰے طبقات کے لوگوں کی طبعی بزدلی اور کمزوری کے باعث عوام کو یہودیوں کی دروغ بافی اور بے بنیاد مذمت پر بھی یقین کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس کے لئے عوام کو قصوروار بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی طبیعت میں ہمیشہ ہی بھولاپن پایا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر حکام بھی یا تو اپنا فرض منصبی ہی بھول جاتے ہیں۔ یا انہیں کچھ بھینٹ پوجا دے کر انکا منہ سی دیا جاتا ہے۔ اسکا نتیجہ لبا اوقات یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اتہام طراز یہودی مجرموں کو مناسب سزائیں دینے کی بجائے صریحاً بے انصافی سے بے قصور لوگوں پر ہی تزلہ گرانے لگتے ہیں۔ اور وہی بدمعاش حق ناشناس حکومت کے دفتروں میں بیٹھے اپنے طریق عمل کی حمایت میں امن عامہ اور انتظامات حکومت

جرمن ورکرز پارٹی کا عروج

(۱۲)

اس حصہ کے آخر میں اگر میں اپنی ترقی کن تحریک جرمن ورکرز پارٹی کے عروج کا کچھ ذکر کر کے ان واقعات کا بھی مختصر سا تذکرہ کر دوں۔ جن کا میرے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ تو شاید کچھ بیجا نہ ہوگا۔ مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس تحریک کے بنیادی مقاصد پر یہاں مفصل بحث کی جائے۔ کیونکہ وہ بحث اتنی اہم اور دلچسپ ہوگی۔ کہ وہ اس مختصر سی جگہ میں سما نہ سکے گی۔ اس لئے اُسے میں کسی دوسرے موقع کے لئے ملتوی رکھتا ہوں۔

یہاں میں اُس تحریک کا مختصر سا ذکر کرتا ہُوا یہ سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ کہ "قومی" لفظ کے اصلی معنی کیا ہیں۔ اس مضمون میں "ہم" کا لفظ میں ان سینکڑوں بلکہ ہزاروں محب وطن اشخاص کے لئے ہی استعمال کروں گا۔ جن کے دل حصول آزادی کے لئے بے قرار تھے۔ لیکن میرے پاس ان کے اس اضطراب اور بے چینی کو صحیح طور پر ظاہر کرنے کیلئے کافی الفاظ نہیں۔ اس تحریک میں سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ شروع سے ہی اس کا ایک ہی لیڈر رہا ہے۔ اور لاکھوں لوگوں نے اس کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ ان کا مقصد بھی وہی تھا۔ جس کے لئے قوم ہزاروں سال سے مضطرب ہے۔ ان کا لیڈر ہی اس عالمگیر عالم خواہش کا اعلان کرتا ہے۔ اور ان پرانے خیالات کو نئے سانچوں میں ڈھال کر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ور سب کے ساتھ

ان ہی سب باتوں پر کسی قوم کے نظام کی مضبوطی و پائداری کا انحصار ہوتا ہے لیکن یہاں بدقسمتی سے متذکرہ بالا وجوہات کی بدولت ترقی وعروج کی بجائے انحطاط نصیب ہوتا گیا۔ اور آخر اپنی ان اندرونی کمزوریوں کے باعث ہی سلطنت تباہ ہو گئی۔ یعنی کہ جوں جوں ریشٹ رجرمن پارلیمنٹ) کی طاقت بڑھ گئی۔ اسے بچانے کے متعلق سب کوششیں بھی بیکار ہوتی گئیں۔ کیونکہ ممبران پارلیمنٹ اور ارباب حکومت نے اپنی کوتہ نظری کے باعث فوری فوائد کو مدنظر رکھکر ان حقیقی اور بنیادی باتوں کی طرف کوئی خاص توجہ دینے کی ضرورت ہی کبھی محسوس نہیں کی۔

یہی وجہ تھی۔ کہ اگست ۱۹۱۴ء میں جرمن قوم کی کوئی بھی خواہش پوری نہ ہونے کے باوجود حکومت جنگ عظیم میں کود پڑی۔ اور یہ امر مجبوری تمام قوم کو اس کا ساتھ دینا پڑا۔ کیونکہ بظاہر یہ جنگ مارکس ازم اور نام نہاد امن پسندی کے طوفان عظیم کے مقابلہ میں اپنی ہستی کی حفاظت کے لئے چھیڑا گیا تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی۔ کہ کسی کو بھی اپنے ان بغلی گھونسلوں اور آستین کے سانپوں کا کچھ دھیان نہ تھا۔ جو ٹٹی کی اوٹ میں شکار کھیلنا چاہتے تھے۔ اس طرح اُن کے راستے میں جو بھی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ سبھی بے سود ثابت ہوئیں۔ اور آخر بدقسمتی نے جرمن قوم کے سر سے اس کی دیرینہ عظمت و بزرگی کا تاج اتار کر ایک مرتبہ اُسے ذلت و تباہی کے غار میں دھکیل ہی دیا۔ آہ!

عجب ناداں ہیں وہ جن کو عجب تاج سلطانی
فلک بال ہما کو دم میں بخشے ہے مگس رانی

ابھارنے ہی ہر طرف سے یہ کوشش شروع ہو جانیکا احتمال تھا۔ کہ اسے فوراً کچل ڈالا
جائے کیونکہ مناسب طور پر مضبوط و طاقت ور نہ ہونے دیا جائیگا۔ اس حماقت کے زیر اثر
جرمن قوم کا درمیانہ طبقہ اس سے پہلے بسمارک کی جاری کردہ اصلاحات کی مخالفت
کر کے انہیں بے سود ثابت کر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی انکی ۔۔۔۔ بزدلی اور بودے پن کا
خیال کر کے ہمیں ان کی مخالفت سے کچھ بہت زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر
کچھ ضرورت تھی۔ تو صرف یہ کہ ہم کسی طرف سے کوئی مخالفت شروع ہونے سے پہلے پہلے
ہی پوشیدہ طور پر سب سے پہلے اپنے پیر خوب اچھی طرح مضبوط کر لیتے۔ تاکہ آئندہ کوئی بھی
مخالف طاقت ہمارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتی کیونکہ بین الاقوامی ہمدردی پر بھروسہ رکھنے
والی ہماری مخالف جماعت اپنی دوسری خام خیالیوں میں ہی محو تھی۔ اور ہماری
طرف اس کی کچھ بھی نگاہ نہ تھی +

ہماری قدیم قومی خصلت کا اگرچہ وحشیانہ جبر و تشدد کی طرف کچھ بہت رجحان
نہیں تھا۔ مگر ہمارے یہودی لیڈر چونکہ طبعاً نہایت بے رحم اور حیوانی جذبات سے پُر تھے۔
اسلئے وہ ہماری جرمن قوم میں بھی تشدد پسندی کا عیب داخل کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا
یہ یقینی تھا۔ کہ جرمن قوم کو اپنے مکر و فریب کے جال میں تاقیامت پھنسائے رکھنے
کی خواہش مند جماعتوں اور فریقوں کے یہ خود غرض لیڈر اپنی قومی حفاظت کے متعلق
ہماری ہر ایک سرگرمی کو جب بھی وہ انہیں کچھ کامیاب ہوتی سی دکھائی دے گی تبھی
کچل ڈالنے کی سر توڑ کوشش کرینگے۔ مگر تاریخی نقطہ نظر سے یہ امید کرنا بھی محض ناممکن
سا تھا۔ کہ ہماری جرمن قوم اپنے مار آستین قومی دشمنوں سے جو ایک عرصے سے اُسے
اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔ کوئی نہایت ہی زبردست کشمکش کئے بغیر ہی پھر اپنی
آزادی حاصل کرنے اور اس بام ترقی پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکے گی۔ جہاں پہنچنے کی وہ
قدرتاً خواہشمند نظر آتی تھی +

ہی ساتھ فتح کے راستے پر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

لاکھوں دلوں کی بیقراری و اضطراب سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ عوام اپنی موجودہ حالات میں ایک زبردست تبدیلی چاہتے ہیں۔ جو لوگ انتخاب کے شیدائی ہیں۔ اور جو اس وقت حد درجہ تک بڑھی شیلنت کا خاتمہ دیکھنے کے لئے مضطرب ہیں۔ وہ اس حقیقت کے خاموش گواہ ہیں۔ اور نوجوانوں کی اس تحریک کو جلد سے جلد پھلتا پھولتا دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔

اپنی حفاظت کے لئے قومی خواہش کی یہ تکمیل ہماری قوم کی سیاسی طاقت کے سوال پر ہی تمام وکمال انحصار رکھتی ہے۔ کیونکہ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے۔ کہ کسی خارجہ پالیسی کا فیصلہ اور کسی غیر طاقت کے رسوخ کی پائداری اتنی سامان پر منحصر نہیں۔ جتنی کہ اپنی طاقت مقابلہ پر ہے۔ مثلاً ہر ایک عہد نامہ آدمی ہی کرتے ہیں۔ اسلحہ جات نہیں کرتے۔ جب آدمی ہی کمزور اور بے حوصلہ ہوں۔ تو سامان حرب کی فراوانی انہیں کیا سہارا دے سکتی ہے۔ اسی طرح برطانیہ کی دوستی بھی اسی وقت کچھ قدر وقیمت رکھتی ہے۔ جبکہ کوئی قوم اپنی جنگی مضبوطی اور فوجی دباؤ کیلئے انگریزوں کی رہنمائی اور ان کے تخیل سے فائدہ اٹھانے کی طاقت رکھتی ہو۔ جسکا نتیجہ اکثر فتح ہی ہوتی ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ برطانیہ کو دوسری قوموں کی مانند زیادہ فوج یا زیادہ سامان حرب کی کیوں ضرورت نہیں؟

جرمنی میں پھر آزاد اور قومی حکومت قائم کرنے کی غرض سے جدوجہد کی طاقت پیدا کرنے کے لئے یہ اشد ضروری تھا۔ کہ نوجوانوں کی یہ تحریک عوام میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے اور موجودہ ناقص فضا کی اصلاح میں اپنی پوری پوری کوششیں لگا دیتی۔ لیکن ہماری جرمن ورکرز پارٹی ابھی اتنی کمزور تھی۔ ملک میں قومی خیالات پیدا کرنے اور انہیں نشوونما دینے کی طاقت ابھی اتنی کم تھی۔ کہ اس کے ذرا بھی سر

۳- عوام کی حقیقی سپرٹ کو جاننے اور پہچاننے کے لئے یہ باشد ضروری ہے۔ کہ اپنے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ان کے لئے پوری پوری سیاسی رگڑ سے اپنے مخالفوں کو ہر پہلو سے کمزور، برباد اور بے حوصلہ کر دینے کی سرگرم کوشش کی جائے +

۴- قوم کے کسی فریق کو جو کسی وجہ سے علیحدہ ہو گیا ہو پھر قوم میں شامل کر کے اُسے قوم کا ایک حصہ مان لینے سے اعلےٰ جماعتوں کے مساوی حقوق میں کچھ تنزل نہیں ہوتا۔ صرف ادنےٰ جماعت آہستہ آہستہ ترقی کر کے عروج حاصل کرتی جاتی ہے۔ اسلئے ادنےٰ جماعتوں کو ترقی کے لئے یہ نہایت ضروری اور فائدہ مند ہے۔ کہ وُہ اعلےٰ جماعتوں کے برابر حقوق اور اُن سے مساوی درجہ حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ جدوجہد کرتے رہیں۔ انہیں یہ بھی ہرگز نہ بھولنا چاہیئے کہ موجودہ متوسط طبقہ بھی کسی اعلےٰ سرکاری افسر یا عہدیدار کی حمایت یا مدد سے اپنے اس درجہ کو نہیں پہنچا۔ بلکہ صرف اپنے لیڈروں اور رہنماؤں کی دور اندیشی و دانائی سے ہی پہنچا ہے +

کسی بھی کارکن کے عہدے یا درجہ تک پہنچنے کیلئے بہ حیثیت ایک فریق یا جماعت کے کوئی بھی خود غرضی یا بغض وحسد مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بین الاقوامی لیڈروں کا رُخ ہماری قوم اور وطن دونوں کی طرف نہایت خوفناک اور ہیبت انگیز تھا۔ اور قدم قدم پر ہماری ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کی جارہی تھی۔ یہی ٹریڈ یونین جماعتیں اگر ہماری آزادی اور سیاسیات کے متعلق جذبات قوم پرستی سے پُر ہوتیں۔ تو ان کے لاکھوں ممبر قوم و ملک کے لئے نہایت مفید اور سرگرم کارکن ثابت ہو سکتے تھے۔ اور اس کا انجام یہ ہوتا۔ کہ ہم بہت سی فضول اور فروعی اقتصادی پیچیدگیوں میں پھنسنے سے بچ جاتے جس سے ہمارے پیارے وطن کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی۔ اس طرح جو بھی تحریک جرمن عوام کو قومی خدمات میں مصروف کر کے بین الاقوامی پاگل پن سے محفوظ کر سکتی۔ اور جو خیالات آزاد قوم پرستی کے جذبات کے مخالف ہیں۔ نیز جو

غرضیکہ اسطرح جرمن قوم کے دلوں میں ان زبردست خیالات کو نہایت پختگی اور مضبوطی کیساتھ پیدا کئے بغیر جرمنی کی قومی آزادی کے متعلق کوئی بھی نمایاں کوشش ہر پہلو سے ناممکن نظر آتی تھی۔ اسلئے ۱۹۱۹ء میں یہی مناسب معلوم ہوا۔ کہ اس نئی تحریک کا واحد مقصد یہ رکھا جائے۔ کہ جرمن بوتی کے دلوں میں قومی آزادی کیلئے ایک نہایت ہی زبردست خواہش پیدا کر دی جائے اور اس مقصد میں کامیابی پانے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا۔ کہ :-

۱- فی الحال اس کے لئے کسی خاص قربانی کی کوئی ضرورت ظاہر نہ کیجائے۔ کیونکہ جس تحریک کا ابتدائی مقصد صرف یہ ہو کہ اس کے لئے مناسب طور پر سرگرم کارکن حاصل کئے جائیں۔ اُسے شروع میں ہی کسی بڑی مالی امداد کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اور نہ لوگوں میں قربانی کی پوری پوری سپرٹ پیدا ہوئے بغیر ان سے کسی قربانی کا مطالبہ کرنا ہی کچھ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ یہ مطالبہ صرف اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جبکہ لوگ اس مقصد کی تکمیل کو اپنی زندگی و موت کا سوال سمجھنے لگیں۔ اور انہیں خود بخود یہ محسوس ہونے لگے۔ کہ ہماری طرف سے کسی زبردست قربانی کے بغیر اس مقصد کے خطرے میں پڑ جانے اور ہمیشہ کے لئے ملیامیٹ ہو جانے کا سخت اندیشہ ہے +

۲- ادھورے اور ناممکن ذرائع نیز خود غرضی آمیز مقاصد کو پیش نظر رکھکر کسی بھی جماعت میں عملی طور پر قومیت کا کوئی خیال کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ صرف مضبوط و مکمل ذرائع اور بالکل بے غرضانہ مقاصد کی مدد سے ہی یہ ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ عوام میں تو گورو مانے جاکر عزت پانے اور عہدے حاصل کرنے کے بھوکے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے صرف ادھی لوگ کچھ ہمدردی و امداد پا سکتے ہیں۔ جوان کے اس دلی راز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ عوام کی کمزوری کی نہیں۔ بلکہ ان کی قوتِ ارادی کی پختگی و مضبوطی کی دلیل ہے۔

میں ایسے دشمن و غدار پیدا نہ ہو سکیں۔ جو اندر ہی اندر خفیہ طور پر اسے کمزور کرنا ہی اپنا فرض اولیں سمجھتے رہیں۔ بلکہ ہمیں جو شخص بھی داخل ہو۔ وُہ اس موجودہ فضا کو جو سراسر قوم پرستی اور حب الوطنی کے خلاف تھی۔ جلد سے جلد تباہ و برباد کرنا ہی اپنا سب سے پہلا اور سب سے مقدس فرض تصور کرلے۔ اسلئے یہ نہایت ہی ضروری تھا۔ کہ اس تحریک کو نہایت دانائی دوراندیشی اور معاملہ فہمی سے چلایا جائے۔ تاکہ اس کی جڑیں مضبوط ہو کر یہ پختہ بنیادوں پر قائم ہو سکے۔ لیکن اس کے لئے عوام میں اس تحریک کے اصولوں کا پرچار لازمی تھا۔ کیونکہ بغیر اس کے عوام کے دلوں میں۔ اس کا رسوخ و اثر پیدا ہونے کی کوئی اور صورت ہو ہی سکتی تھی۔ مگر یہ پرچار اپنے مضمون اور صورت کے لحاظ سے اس طرح ہونا لازمی تھا۔ جس سے قوم کے معمولی سے معمولی افراد تک بھی اسکی آواز پہنچ جاتی۔

قول و فعل میں پاکیزگی اور سادہ پن سے ہی عوام کے دلوں پر اس تحریک کی اہمیت و عظمت کا سکہ خاطر خواہ طور سے جمایا جا سکتا تھا۔ اور ایک عام جلسے میں اسی مقرر کو سب سے زیادہ موزوں اور سب سے بڑھکر لائق و قابل شخص سمجھا جاتا ہے۔ جو حاضرین کو عالم اور کم سمجھ خیال کرکے سیدھی سادی اور سچی باتوں کو اس طرح انہیں سمجھانے کی کوشش کرے۔ جس طرح کہ بھولے بھالے بچوں کو کوئی بات سمجھائی اور سکھائی جاتی ہے۔ سیاسی اصلاحات کے متعلق کسی تحریک کو صرف اسی طرح یقینی طور پر کامیاب بنایا جا سکتا ہے کہ من مانے طریقوں سے مخالف طاقتوں پر اپنا رعب و اثر ڈالنے کی کوشش کرنے کے بجائے سب سے پہلے اُن سیاسی طاقتوں کو مٹھی میں لانے کی کوشش کی جائے۔ جن پر مخالفوں کی تمام طاقت و قوت کا انحصار ہے۔ اور ان تمام طاقتوں میں سب سے بڑی سیاسی طاقت عوام میں ہر دلعزیزی اور ان کی خیر اندیشی کی طاقت ہے جس کے بغیر اگر باغی اصلاح پسند حکومت کے سب کل پرزوں پر بھی قبضہ حاصل کریں۔ تو بھی وہ اپنے مقصد میں کبھی کبھی پوری پوری اور مستقل کامیابی ما

لوگ بیکس اور بے بس محنتی مزدوروں پر کارخانہ داروں اور زمینداروں کے ہر ظلم و ستم کو روا و بجا خیال کرتے ہیں۔ انکی نہایت ہی زبردست مخالفت کرتی ۔ وہی تکالیف و مصائب کے طوفان عظیم سے ملک و قوم کا بیڑا پار کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔

کیونکہ عام باشندگان ملک کی بہتری و بہبودی کا کچھ بھی خیال نہ کرکے اور قوم کی مالی و اقتصادی مشکلات کی طرف کچھ بھی توجہ نہ دے کر ہی کارکنانِ حکومت عوام کی آزادیٔ خیالات کے خلاف ایک بہت بڑا گناہ کر بیٹھے ہیں۔ اور عوام کے اعتماد و اعتبار سے انہیں جو طاقت حاصل ہے۔ اس سے وُہ ایسا ہی غلط و ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی کارخانہ دار یا زمیندار عوام کی طاقتِ عمل کو ان ہی کی تباہی و بربادی کے لئے مختلف طریق پر استعمال کرکے ان کے ہی گاڑھے پسینوں کی کمائی سے انکی ہی جڑیں کھود کر کر سکتا ہے۔ اسلئے ہم نے اپنی اس نئی تحریک کی کامیابی کے لئے سب سے پہلے صادق نیک دل اور بے غرض کارکنوں کی ایک نہایت زبردست جماعت کی ضرورت محسوس کی۔ اور اپنا یہ فرض سمجھا۔ کہ جسطرح بھی ہو۔ سب سے پہلے لوگوں کو بین الاقوامی دیوانہ پن اور جہالت کے جال سے نجات دلانے کی کوشش کرکے قومی افلاس و ناداری کا خاتمہ کریں۔ اور انہیں ملک و قوم کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت سے آگاہ کرکے انکے دلوں میں یہ زبردست خواہش پیدا کردیں۔ کہ وُہ ہر ممکن طریق سے اس ناقابل برداشت حالت کو تبدیل کرنے کے لئے آمادہ و کمربستہ ہو جائیں۔ لیکن یہ تب ہی ممکن تھا۔ جبکہ اُن کا دل نہایت زبردست و مضبوط اور پختہ قومی جذبات و ترقی کُن خواہشات سے ایسا بھرپور ہو۔ کہ اس میں کسی اور مخالفانہ خیال کے سمانے کی ذرا بھی گنجائش باقی نہ رہے۔

درحقیقت ہمارا دلی مقصد یہ تھا۔ کہ کسی طرح بھی ہمارے اس قومی قلعہ بندی

قوموں میں پرچار کرکے اسپرٹ کو درآمد کرانے کی کوشش کرے۔ لیکن اس کا یہ منشاو مدعا ہرگز نہ تھا۔ کہ کسی قومیت کی ایک صورت کو بدلکر اسکی بجائے دوسری صورت قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ اسے ہی ان بنیادوں پہ قائم کیا جائے۔ جن کے بغیر کوئی مطلق العنان وخود مختار یا جمہور نواز آزاد حکومت زیادہ دیر تک قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ غرضیکہ یہ جرمنی میں کوئی شخص یا جمہوری حکومت پیدا اور قائم کرنے کی بجائے سب سے پہلے ایک ایسی مضبوط اور زبردست جرمن قوم کو جنم دینا چاہتی تھی جس کے سامنے ملک کے ہر شہری یا جمہوری حکمران کا سر تسلیم خم ہے۔ اور اسے یہ ہمت و جرات نہ ہو سکے۔ کہ وہ قوم کی متفقہ مرضی و منشا کے خلاف کوئی ایک قدم بھی ادھر یا ادھر اٹھا سکے

مگر کسی تحریک کے اندرونی نظام کا سوال کسی ایک اصول پر اتنا انحصار نہیں رکھتا۔ جتنا کہ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے اس کے مناسب استعمال پر منحصر ہے۔ اس لئے وہی نظام سب سے اچھا ہے۔ جو کم و بیش ہر وقت ہی اپنی ہستی کی اہمیت کو تمام لیڈروں اور انکے پیروؤں کو محسوس کرا سکتا ہو۔ کیونکہ اس نظام کا سب سے پہلا فرض یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک ایسے تصفیہ شدہ خیال کا عوام میں عالمگیر طور پر پرچار کرے۔ جو ہمیشہ کسی ایک ہی بیدار مغز مہاپرش کے روشن دماغ کی اختراع ہوا کرتا ہے۔ اور پھر اس کے مطابق ہی خود بھی عملی صورت اختیار کرتا ہوا دنیا میں نشوونما پاتا رہے۔ اور دوسروں کو بھی اس طریق پر چلاتا رہے۔ اسطرح جیسے جیسے اس کے پیروؤں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اسکی شاخیں بھی جگہ جگہ پھیلتی اور قائم ہوتی جاتی ہیں۔ اور وہ ہر جگہ وہاں کے مقامی باشندوں کو انکے اس آئندہ سیاسی نظام میں دل و جان سے شامل ہونیکے لئے آمادہ و کمربستہ کرتی جاتی ہیں +

ہماری اس تحریک کا اندرونی نظام ایسا رکھا گیا۔ کہ اس کی تمام سرگرمیوں کی نگرانی ایک ہی جگہ میونخ سے ہی ہوتی رہے۔ اس کے غیر مشکوک اور راسخ اعتقاد اور

حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ تو صرف تب ہی ہو سکتا ہے جبکہ عوام کے دل میں یہ پورا پورا اعتماد جم جائے۔ کہ ان کی نئی حکومت پرانی کی نسبت رعایا کے لئے زیادہ پر اطمینان و آرام بخش ہوگی۔ اور وہ قدم قدم پر یہ محسوس کرنے جائیں۔ کہ نئی حکومت اپنے ان وعدوں کو سچے دل سے پورا کرنے کی کوششوں میں مصروف بھی ہے۔ جو اس نے عنان حکومت ہاتھ میں آنے سے پہلے عوام کے ساتھ کئے تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے موسم سرما کی نوبح گسوٹ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس وقت کی جرمن حکومت کے متعلق یہ خیال ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

اس لئے جب سیاسی طاقت کا حصول ہی عملی طور پر سیاسی اصلاح پسندوں کے تکمیل مقاصد کا ابتدائی زینہ ہے۔ تو ایک اصلاحی تحریک کو اپنی قائی کے پہلے دن سے ہی اپنے آپ کو عام رعایا کی ایک عالمگیر تحریک سمجھ کر یہ ذہن نشین کرانے کی سچے دل سے کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ وہ ایسی جماعت ہرگز نہیں۔ جس میں چند پڑھے لکھے اشخاص کھانے کھیلنے اور موج اڑانے کے لئے شامل ہو گئے ہوں۔ بلکہ ایک ایسی جماعت ہے۔ جس میں رعایا کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی بغیر کسی تمیز و تخصیص کے شریک ہو کر دوسرے ممبروں کیساتھ ہر لحاظ سے برابری و مساوات کا دعویٰ رکھ سکتا ہے۔ صرف قابلیت و لیاقت بلکہ اس سے بھی زیادہ صداقت و بے غرضانہ خدمت کی یہ ہی ایک شرط ہے۔

اس طرح ہماری یہ نوجوان تحریک بھی اپنے روز پیدائش سے ہی موجودہ پارلیمنٹ اور اسکے طریق عمل کی مخالف تھی۔ جسکا بنیادی اصول کثرت رائے کے فیصلے کی اندھا دھند پیروی تھا۔ خلاف اس کے ہم اس اصول کے حامی اور مؤید تھے۔ کہ ایک خود اندیش اور بیدار مغز رہنما ہی عوام کے مقاصد کو پورا کر سکتا ہے۔ اور انکے تمام فیصلہ جات و احکامات کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ اور سب بڑے چھوٹے سیاسی امور میں عوام کو اسکی ہی ذمہ داریوں اور طاقتوں پر پورا پورا بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ ہماری اس تحریک کے نہایت اہم فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی تھا۔ کہ وہ اس مندکرہ بالا اصول کا دنیا بھر کی تمام

ضروری ہے۔ کہ وُہ اپنے قومی دشمنوں کے اظہار نفرت اور موجودہ حکومت کے طریق عمل
سے بالکل ہی خوفزدہ نہ ہوں لیکن پھر بھی انہیں ان دونوں سے بہت ہوشیار اور چوکنا رہنا
پڑیگا۔ اور سمجھنا ہوگا۔ کہ جو شخص بھی یہودی پریس کی گالیوں اور انکے حملوں سے بچا ہُوا ہے
وہ سچا جرمن نیشنل سوشلسٹ نہیں +

ہماری اس تحریک کو شخصیتوں کا ہر طرح احترام کرنا واجب ہے۔ کیونکہ ہر ایک
شخصیت اپنی انسانیت کو حقیقی قدر وقیمت کا اظہار کرنے والی ہوتی ہے۔ اور ہر شخص کے
خیالات اور اس کے کام کی تکمیل اس شخص کی اپنی ہمت و جرأت اور قوت عملی کا نتیجہ ہوتا
ہے۔ اس لئے اُسکی عظمت واہمیت کا جتنا بھی اعتراف کیا جاتا ہے۔ وُہ اسکی فداکارانہ
محنتوں اور سرگرمیوں کیلئے اسکا شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اُس کے
ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں کا جو اسطرح اپنے قابل کارکنوں کی عزت افزائی کرتے ہیں
اپنا اندرونی نظام بھی مضبوط و طاقتور ہوتا جاتا ہے +

ہمیں شک نہیں کہ اپنے لیڈروں کی گمنام شخصیتوں اور ان کے اثر ورسوخ
کی کمی کے باعث سے ہی شروع شروع میں ہماری تحریک کو بہت سی مشکلات درپیش
آئیں اور انکی بدولت ہی ہماری کامیابی اسوقت مشکوک سی نظر آنے لگی۔ کیونکہ درحقیقت
ہم میں سے کسی کے متعلق بھی عوام کچھ نہ جانتے تھے۔ اور میونچ میں تو ہماری تحریک کا
نام تک بھی کسی نے کبھی نہ سُنا تھا۔ اسلئے اسوقت اس چھوٹی سی تحریک کو بڑی
شکل وصورت دیکر اس کے نام کو ہر شخص کی زبان و دل کے لئے عزیز بنانا اور اُسکے
ممبروں کی تعداد کو ترقی دیکر ان کے دلوں میں اس کے لئے سچا پریم اور حقیقی عزت پیدا
کرنا ہی ہم لوگوں کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا مقصد تھا۔ اور یہی باتیں اس کے لئے
سب سے زیادہ مفید بھی ہو سکتی تھیں +

ان سب باتوں کو پیش نظر رکھ کر ہم نے پہلے اپنے اجلاس۔ ہماری شروع

قابل اعتماد ممبروں کو ایک خاص صیغہ کے ماتحت انکے قومی فرائض کے متعلق تعلیم دیجائے اور آیندہ ان خیالات کے پرچار کے لئے ایک تعلیم گاہ جاری کی جائے۔ پھر اسکی کامیابی پر بھی ایک مرکز کی طاقت بڑھانے کی غرض سے اس کے اختیارات میں ضروری اضافہ حاصل کیا جائے۔ اور دوسری مقامی شاخیں اسوقت تک نہ جاری کی جائیں جبتک کہ میونچ کی مرکزی طاقت کا پورا پورا اثر و رسوخ قائم نہ ہو جائے +

لیڈری کے لئے صرف قوت ارادی کی مضبوطی کی ہی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس قابلیت کی بھی ضرورت پڑتی ہے جس سے اپنی خالص لیاقت کی بدولت عوام کو قابو میں رکھنے کی طاقت بھی حاصل ہو سکے۔ ان سب اوصاف کی یکجائیت ہی سب سے زیادہ قابلِ ترجیح سمجھی جانی چاہیئے۔ کیونکہ ہر ایک کی کامیابی کا انحصار عوام کی دلی عقیدت پر ہے۔ اس کیساتھ ہی رواداری و برداشت بھی نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اس تحریک کے حامی اپنے مخالفوں کی مخالفت کی کچھ بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے برابر اپنے منزل مقصود کی طرف بڑھے چلیں۔ اور کسی کے بھڑکانے یا جوش دلانے سے بھی اپنے سیدھے راستے سے ایک قدم ادھر اُدھر نہ ہوں +

علاوہ اس کے یہ سوچنا بھی ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ کہ ایک تحریک کسی دوسری کیساتھ مل کر طاقتور ہو سکتی ہے۔ خواہ ان دونو کا مقصد ایک ہی کیوں نہ ہو؟ کیونکہ ہر ایک تحریک کی کامیابی کا راز اس کے پیروؤں کی عقیدتمندی اور انکے اس جوش و خروش میں ہی مضمر ہے۔ جس سے متاثر ہو کر وہ اپنے مخالفوں پر حملہ کرتے ہیں۔ یا انکے حملوں کا جواب دیتے ہیں۔ جب کوئی خیال خود صحیح ہونے کے علاوہ مختلف ہتھیاروں سے مسلح ہو کر دوسرے پر حملہ کرنیکی ہمت وجرات کا بھی اظہار کرے۔ تب ہی اسے ناقابلِ فتح سمجھا جاسکتا ہے۔ اور اسکی ہر ایک مخالفت بھی اسکی اندرونی قوت کو بڑھانے اور اسے ظاہر کرنیوالی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہماری تحریک کے پیروؤں کے لئے بھی یہ نہایت

لیڈر میں ہونے چاہئیں۔ ان کی انہیں بہت کمی تھی کیونکہ وہ ایک فصیح نقارہ نہ تھے۔ اگرچہ ان کا روزانہ کام نہایت غور و خوض اور سوچ وچار کا تھا۔ مگر پھر بھی اس وصف کی کمی سے انہیں ایک منظم جماعت کی رہنمائی کی طاقت مفقود تھی۔ ہماری شاخ میونچ کے صدر ہیر ڈیکسلر اگرچہ اچھے قابل کارکن تھے۔ مگر بول وہ بھی اچھی طرح نہ سکتے تھے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ ان میں وہ سپاہیانہ خو بھی نہ تھی۔ کیونکہ انہوں نے ابھی تک میدان جنگ کی شکل تک بھی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اسلئے وہ خصوصاً مذبذب اور کمزور طبیعت کے انسان تھے۔ نہ انہوں نے وہ تعلیم کہیں پائی تھی۔ جس سے ایک انسان اپنے طریق عمل میں پورا پورا یقین نہ رکھنے اور "نرم دلی" کی بیماریوں سے آزردہ رہ سکتا ہے اسلئے ان دونوں لیڈروں میں سے کوئی بھی اپنی سرگرمیوں میں فاتح اور کامیاب ہو سکنے کی امید نہ کرسکتا تھا۔ اور میں اسوقت تک ایک نوآموز سپاہی تھا۔

مگر زیادہ تر جرمن باشندے مارکس ازم کے دھوکے باز پیروؤں کی اس تحریک سے متنفر ہو چکے تھے جس کا مقصد عوام کو اپنے قابو میں لاکر اس بین الاقوامی "مارکسٹ پارٹی" کے اشارہ پر نچانا تھا۔ جو یورپ بھر کے سٹاک ایکسچنج (مختلف کارخانوں اور بنکوں وغیرہ کے حصص کی سٹہ بازی) پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھی لیکن ہماری جرمن مزدور پارٹی" کسی غیر کے اشارے پر چلنا بالکل ہی پسند نہ کرتی اور اپنی قومی بہتری اور بہبودی کیلئے خود ہی سوچنا اور کام کرنا چاہتی تھی۔ اسلئے اس نوجوان تحریک کو کامیابی کے راستے پر چلاتے ہوئے عوام کا اعتقاد واعتماد و ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاسمیں مستقل ومضبوط کرنیکے لئے ۱۹۱۹-۲۰ء کے موسم سرما میں ہم نے ایک مورچہ جما دیا جسکا مقصد صرف یہ تھا۔ کہ عوام کے دلوں میں ہماری تحریک کے لئے ایک ایسا جذبہ عقیدت پیدا ہو جائے۔ جو زمانہ مستقبل میں پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دینے والا ثابت ہو۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے۔ کہ علاقہ ڈیچیوہ سٹریس کے مقام "ڈیوٹشش ریچ"

کئے اور بعد میں انہیں پندرہ روزہ کر دیا۔ ان اجلاسوں کے دعوتی کارڈ کچھ چھپے ہوئے ہوتے تھے۔ اور کچھ فوراً اسی وقت دستی لکھ لئے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم نے ایسے اسّی ٹکٹ دُکانوں میں تقسیم کئے۔ اور شام کو دیر تک ہم لوگوں کی آمد آمد کی آس لگائے بیٹھے رہے امداً فرساتآدمیوں کی حاضری رہی غنیمت سمجھ کر ہمیں اپنا کام شروع کرنا پڑا۔ کیونکہ خوش قسمتی سے جلسے کے ارکان ہم سے پہلے ہی سات کا کورم مقرر کر چکے تھے۔ ورنہ شاید وہ جلسہ بھی اس روز ملتوی کرنا پڑتا۔

ہم لوگ اپنے افلاس و ناداری کے باعث چندہ بھی بہت کم دینے کیلئے مجبور تھے مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ اور چند روز بعد ہی میونخ کے ویچر نامی ایک کھلے اور آزاد مقام پر ایک کمرہ لے کر ہم نے اس میں جلسہ منعقد کئے جانیکا اعلان کر دیا۔ جس میں ہمیں بعید از قیاس کامیابی ہوئی کیونکہ اس روز شام کے سات بجے جب جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ تو حاضرین کی تعداد ایک سو گیارہ تک پہنچ چکی تھی۔ میونخ کالج کے ایک پروفیسر صاحب اس روز کے خاص لیکچرار تھے۔ اور مجھے بھی ان کے بعد وقت دیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے کوئی تیس منٹ تک تقریر کی۔ مگر اس محدود سے عرصہ میں ہی اپنے مقصد کو اچھی طرح صاف کر کے اپنے دعوے کو قابلِ اطمینان طور پر ثابت کر دیا۔ اگر پہلے مجھے بیقین بالکل نہ تھا۔ کہ میں ایسی اچھی طرح بول سکونگا۔ مگر میری اس تیس منٹی تقریر سے ہی حاضرین میں ایک نئی سی جان پڑ گئی۔ اور اسکا اتنا اثر پڑا کہ حاضرین نے ہماری تحریک کو پورے جوش و خروش سے چلانے کیلئے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی تین سو مارکس کے قریب چندہ دیدیا۔ جس سے ہمارا ایک بہت بڑا فکر دور ہو کر ہماری حوصلہ افزائی ہوئی۔

اس زمانے میں ہماری تحریک کے صدر ہیر ہیرر ہے تھے۔ جو ایک پیشہ ور اخبار نویس تھے۔ انہوں نے اگرچہ اپنے پیشے کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ لیکن جو وصاف ایک پارٹی

خاموش رہنا گوارہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وُہ ایسا کرتا ہے۔ تو وُہ ضرور کمزور دل اور اپنے فرض سے ناواقفیت یا لاپرواہی کہا جائے گا! وہ کسی بھی کام کی کامیابی کے لئے اس پر کبھی بھروسہ نہ کیا جا سکے گا۔ ایسے شخص صرف ڈرپوک اور نالائق ہی نہیں ہوتے بلکہ دھوکے باز اور مکار بھی ہوتے ہیں۔ وُہ ہمیشہ اپنی بہانہ سازیوں سے اور دن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر انکی جانبازیوں اور قربانیوں سے خود فائدہ اٹھانے کے لئے ہی میدانِ سیاست میں داخل ہُوا کرتے ہیں۔ لیکن کبھی آگے بڑھنے کی ہمت وجرات نہیں کر سکتے وُہ درحقیقت دوسروں کے سرانجام دیئے ہوئے کاموں سے ہمیشہ دل ہی دل میں نفرت کرتے ہیں۔ مگر کھُلم کھُلا اس نفرت کے اظہار کی بھی ہمت نہیں رکھتے۔ لیکن ہر تحریک میں مردانہ وار حصہ لینے اور کسی بھی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرکے بیخوفی سے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ عمل میں ڈٹ جانے والے شیر مرد اپنے دلی خیالات کا اظہار کرتے ہُوئے کبھی نہ جھجکتے۔ اور اُن کی حفاظت و پرچار میں سب طرح کی سختیاں سہنے اور قربانیاں کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وُہ چند ایک ہی ہزاروں چوری چھپے اور چکچے چپکے کام کرنیوالوں سے بہت زیادہ با اثر اور قابلِ اعتبار ثابت ہوتے ہیں +

چنانچہ میں نے سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ تجویز پیش کی۔ کہ عوام کی ایک نہایت عظیم الشان کانفرنس منعقد کی جائے۔ ہیر ہیرر نے جو اسوقت پارٹی کے لیڈر تھے۔ میری اس تجویز کی مخالفت کی اور آخر با عزت طور پر پارٹی کی لیڈری کے بار سے سبکدوش ہوگئے۔ اور ہر انٹین ڈریکسلر نے انکا عہدہ سنبھالا۔ اس تحریک کے پرچار کا کام خود میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور بغیر کسی پس وپیش کے میں اس میں مصروف ہوگیا۔ آخر اس کانفرنس کے لئے ۲۴ فروری کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اور اس کے تمام انتظامات کا بار بھی رفتہ رفتہ میرے سر پر پڑ گیا۔ مگر میں نے بھی اسکی کچھ پرواہ کی۔ اور شب وروز کام میں مصروف رہنے لگا +

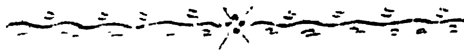
کے ایک جلسہ کی شاندار کامیابی نے میرے عقائد کی صداقت اور پختگی کو میرے لوحِ دل پر اور بھی اچھی طرح نقش کر دیا تھا۔ کیونکہ اس جلسہ میں دو سو سے زیادہ حاضری تھی اور ہمیں عوام کو کشش کرنے اور ان سے مالی امداد حاصل کرنے۔ غرضیکہ دونوں پہلوؤں میں ہمیں روز بروز خاطر کامیابی حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس سے اگلے ہی مہینے میں ہمارے جلسے کی حاضری چار سو تک پہنچ گئی۔ مگر ابھی تک کسی طرح بھی یہ نہ کہا جا سکتا تھا۔ کہ ہماری اس تحریک کا کوئی ایسا فیصلہ شدہ پروگرام تھا جس سے جلدی ہی اسے پوری پوری ہر دلعزیزی حاصل ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس کمی کے باعث ہم اپنی تحریک اور اس کے محدود سے مقصد کو عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے اُسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا کوئی بھی ایک خاص راستہ لوگوں کو نہ دکھا سکتے تھے۔ اور نہ اس پر چلنے کے فائدہ ہی ان کے ذہن نشین کرا سکتے تھے +

اسکی وجہ یہ تھی۔ کہ کوئی خاص طریق عمل طے ہوئے بغیر کسی خیال کا اصل پہلو پر بیان کر دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر اسکی تشریح و توضیح میں طرح طرح کا اختلاف رائے ہو کر بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اسطرح مختلف اور متضاد تشریحات کرتے رہنے سے آخر اس تحریک کیساتھ ہی ساتھ قوم و ملک کو بھی بے حد نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ لوگ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ انہیں کس شخص کی بات ماننی چاہیئے اور کس کی نہیں۔ اور اسطرح تذبذب میں پھنس کر سب کو ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں +

میں اپنی اس نوجوان تحریک کو ایسے "بے زبان کارکنوں" کے جال میں پھنسنے سے بچانے کیلئے جو ہمیشہ پس پردہ رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں کسی خاص فہمائش کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ایسے کارکن صرف بزدل ہی نہیں۔ بلکہ اکثر کاہل اور نا قابل بھی پائے جاتے ہیں۔ ورنہ کوئی شخص جو کسی سوال کے متعلق کچھ جانتا ہے چند آنیوالی مصیبتوں کو سر پہ آتا دیکھ بھی رہا ہے۔ اور ان کی روک تھام کے طریقے سے کچھ کچھ واقف ہے۔ کب

گمشدہ آزادی اور برباد شدہ قدیم عظمت و شوکت کو پھر حاصل کرنے کے لئے میدانِ عروج واقبال میں مردانہ وار قدم بڑھائے گی +

آئندہ باب میں میں ان اصولوں کی زیادہ تفصیل کے ساتھ تشریح و توضیح کرونگا۔ جنہوں نے مستقبل کے لیے ہمیں اپنے پروگرام کا فیصلہ کرنے میں مدد دی ہے۔ حالانکہ اپنے آپ کو ہم سے ہر پہلو میں افضل و برتر سمجھنے والے اور دنیا کی نظروں میں بھی ممتاز و ذی مرتبہ مانے جانے والے لوگوں نے ہمارا مذاق اڑانے اور ہم پر بڑے سے بُرے آوازے کسنے میں بھی اپنی طرف سے کچھ کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن ہمارے طریق عمل کی کامیابی نے آخر یہ ثابت کر دیا۔ کہ ہمارے خیالات زمانے اور عوام کی خواہشات کے بالکل مطابق تھے۔ اور ہمارے مخالف ہر طرح غلطی پر تھے +



ہمارے قومی جھنڈے کا رنگ سُرخ تھا۔ اس لئے وُہ ایک خاص کشش رکھتا تھا۔ اور مخالفوں کو جلانے اور بھڑکانے کے لئے بھی اُسمیں ایک خاص طاقت تھی۔ اس سے انکے دل اور دماغ پر بھی ہمارا اچھا اثر پڑا +

ہماری کانفرنس کے اجلاس کی تاریخ انعقاد آپہنچی۔ اور میں اسمیں شریک ہونے کیلئے صبح سات بجے ہاؤس فیسٹ ہال کی طرف روانہ ہوا۔ جو پلاٹز میونخ میں واقع تھا اسوقت میرا دل مسرت سے پُر تھا۔ وہاں پہنچ کر جب میں نے اُس وسیع ہال کو دو ہزار مردوں اور عورتوں سے ٹھسا ٹھس بھرا دیکھا۔ تو میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی +

پہلے مقرر کی تقریر کے بعد میری باری آئی۔ ابھی مجھے تقریر کرتے ہوئے کچھ بہت دیر نہ ہوئی تھی۔ کہ میرے اوپر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اور ہال میں ایک عجیب جوش و خروش پھیل گیا۔ بڑی مشکل سے ہمارے چند قابل اعتماد ساتھیوں اور میدانِ جنگ کے رفیقوں نیز انکے دوستوں نے اس جوش کو قدرے ٹھنڈا کر کے جلسے میں امن وامان پیدا کیا۔ اور میں آگے تقریر جاری کر سکا۔ مگر اس آدھ گھنٹے میں ہی نہ جانے وُہ سب جوش و خروش کہاں غائب ہو گیا؟ اور پچیس منٹ تک میری تقریر سننے کے بعد ہی ہزارہا مرد و زن جن سے وُہ ہال پُر تھا۔ سب دم سادھے خاموش سانس روکے، چپ چاپ میری تقریر کو اسطرح بغور سنتے ہوئے دکھائی دیئے۔ گویا کہ سب میرے لفظ لفظ سے متفق تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میرے کس نامعلوم خیال اور کن نادانستہ الفاظ نے ان کے دل و دماغ پر اتنا اثر ڈال کر ان کے تمام جذبات و خواہشات میں یہ حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دکھائی تھی؟ +

بس پھر کیا تھا؟ شہر میں انقلاب کی ایک آگ سی بھڑک اٹھی جس کے نور میں تلواروں کی چمک دمک بھی ممکن نظر آنے لگی۔ اور میرے دل میں ایک بار پھر یہ امید پیدا ہو گئی۔ کہ جلد ہی خواب غفلت میں بے سدھ پڑی ہوئی جرمن قوم اپنی

میری جدوجہد

دوسرا حصّہ

مُصنّفہ

ہرہٹلر ڈکٹیٹر جرمنی

مترجمہ

شانتی نارائن

عالمگیر قومی اصول اور ہماری پارٹی

۱

یہ صاف ظاہر تھا۔ کہ ہماری یہ نئی تحریک عوام پر کوئی خاص اثر ڈالنے کے لئے اس وقت تک پوری پوری طاقت حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ جب تک شروع سے ہی اس کے پیروؤں کے دلوں میں یہ پکا اعتماد نہ جم جاتا۔ کہ یہ سب سرگرمیاں اور شوروغل محض آئندہ انتخابات پارلیمنٹ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں۔ بلکہ نئے عالمگیر اصولوں کی بنیاد پر جرمنی میں ایک نئی مجلسی زندگی کی روح پھونکنے کے لئے عمل میں آرہی ہیں۔ مگر پھر بھی اس پر ان سب پارٹی بازی کے چھل بٹھوں کا اثر لازمی طور پر پڑتا تھا۔ جو اس وقت نت نئے روپ میں کام کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک تو جو سب سے اہم اور نمایاں تھا۔ وہ آئندہ انتخابات کے نتائج کا خوف" تھا۔ جس کے زیر اثر ہر ایک پارٹی ہمیشہ ہی اپنی کامیابی کے لئے طرح طرح کی چالبازیوں سے کام لیا کرتی ہے۔ اور آئے دن عجیب سے عجیب خیالات کو نئے سے نئے طریق پر لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتی ہے۔ لیکن انتخاب کے بعد پورے پانچ سال تک کامیاب ممبروں کے

اور کاہلی کو بالائے طاق رکھ کر اس سے بھی زیادہ سرگرمی کا اظہار کرنے لگ جاتی ہیں۔ اس طرح عملی نقطہ خیال سے "ہردلعزیز" یا "مقبول عام" الفاظ کی قدر وقیمت بھی کچھ فرضی اور قیاسی سی رہ جاتی ہے۔ اور لفظ "دہرم" کی مانندان کی تشریح وتوضیح بھی مختلف ومتضاد طور پر ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ ان کی بنیاد قوم کی خوش اعتقادی کے سوا اور کسی بھی چیز پر نہیں۔

سچ تو یہ ہے۔ کہ کوئی بھی دنیاوی اصول خود ہزار بار بھی بے نقص اور نوع انسان کے لئے فائدہ بخش کیوں نہ ثابت ہو۔ وہ کسی گری ہوئی قوم میں اس وقت تک نئی زندگی پیدا نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ اس میں جدوجہد اور کشمکش کی طاقت موجود نہ ہو۔ اور ایک سربکف جماعت اس کی حمایت میں کھڑی ہو کر اپنی بیغرضانہ قربانیوں سے اپنے طریق عمل کو تمام قوم وملک کے لئے منفعت بخش ثابت نہ کردے۔ چنانچہ موجودہ سیاسی مسائل کے متعلق بھی ہمارے خیالات ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ کہ وہ سبھی عوام کے لئے یکساں فائدہ مند ہوں۔ اور کسی خاص جماعت فرقہ یا نسل کے آدمیوں سے ان کا کوئی تعلق نظر نہ آئے۔ بلکہ ان سے صاف طور پر ملک وقوم کی اقتصادی ضروریات سے پیدا شدہ مختلف پہلوؤں میں کام کرنے والی سیاسی طاقتوں کے نمایاں نتائج ظاہر ہوں۔

تہذیب واخلاق کے نقطہ خیال سے مختلف نسلوں کی قابلیت میں کوئی فرق محسوس نہ کرنا بھی ایک بڑی بھاری غلطی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ پھر مختلف فرقوں اور مختلف اشخاص کو بھی ایک جیسا مہذب۔ خوش اخلاق اور قابل ماننا پڑیگا جو کہ صریحاً ناممکن ہے۔ اس طرح بین الاقوامی مارکس ازم بھی دنیا کو ایسے ہی ایک عام صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ یہودی کارل مارکس کے زمانے سے اب تک اسی طرح چلا آیا ہے۔ اگر

لئے ایوان پارلیمنٹ میں جاکر حاضری دے آنے کے سوا اور کچھ بھی کام نہ رہ جاتا تھا۔ اور پھر ملک و قوم کی کوئی فکر کبھی نہ ستاتی تھی۔

اب بھی قوم کی اس شاندار خدمت کا یہ خیال ہی انہیں پارلیمنٹری جنٹرل اور کاغذوں پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا کرتا ہے۔ جس کے معاوضے میں انہیں ملک میں ہر طرح کی عزت و شہرت نصیب ہوا کرتی ہے۔ اس لئے پارلیمنٹ اور اس کی ممبری کے نام پر ہونے والی ان تمام دہوکے بازیوں کا خیال عوام کے لئے اور سب باتوں سے بہت زیادہ تکلیف دہ ثابت ہونے لگا تھا۔ مگر ہمارے عوام کی یہ دماغی حالت بھی ان کے دلوں میں مارکس ازم کی منظم طاقت کے خلاف کوئی زبردست جوش و خروش پیدا نہیں ہونے دیتی تھی۔ اور نہ پارلیمنٹ کے آنریبل ممبر ہی اس طرف کچھ توجہ دینے کی کوئی ضرورت کبھی محسوس کرتے تھے۔ اسی لئے متوسط طبقہ کی سبھی پارٹیوں کے دلی رجحان کو دیکھ کر عام رعایا کے دل میں اکثر یہ خیال پیدا ہوتا تھا۔ پارلیمنٹ میں سوائے لڑائی جھگڑوں کے اور ہوتا ہی کیا ہے؟ اور اس آپا دھاپی میں اصل اصولوں کی پرواہی کون کرتا ہے؟

یہی وجہ تھی۔ کہ ان پارٹیوں میں سے کسی میں بھی وہ زبردست طاقت عمل نظر نہ آتی تھی۔ جو عوام کے خیالات پر کچھ اثر ڈال کر ان کے دلوں میں کسی پارٹی کے لئے پورا پورا اعتقاد و اعتماد پیدا کر سکتی۔ لیکن ایسی حالت میں جبکہ ایک فریق ہزار بار ناکامیاب اور قصوروار ثابت ہونے کے بعد بھی ہر طرح کے تشدد آمیز ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر کسی مستقل طور پر قائم شدہ اصول یا رواج پر حملہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تو مخالف جماعتوں میں بھی ایک نیا جوش و خروش ..... پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب ہی اپنی تمام سستی

جانے کا باعث خود ہی بن جاتا ہے۔

ہم سب یہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے۔ جبکہ بنی نوع انسان کے سامنے چند ایسے مسائل ہوں گے۔ جن کا حل معمولی انسانوں کی طاقت سے باہر ہو گا۔ اور اس وقت کسی نہایت ہی شریف نسل کے انسانوں کو دنیا اپنی رہنمائی کے لئے دعوت دے گی۔ اور وہی تمام کرۂ زمین کی مجموعی طاقتوں کی امداد سے ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوں گے

ہر زمانے میں تمام دنیا کے لئے کسی ایک طریق عمل کا تصفیہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جبکہ اس کے الفاظ نہایت صاف اور غیر مبہم ہوں۔ اس لئے ہماری سیاسی پارٹی کے اصول بھی ایسے ہی بنائے گئے۔ جیسے کہ کسی مذہب کے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی ضروری تھا۔ کہ اس کے ہاتھ میں کچھ ایسی طاقت اور کوئی ایسا ہتھیار بھی ہوتا۔ جو بوقتِ ضرورت اسی طرح اس کی حفاظت کر سکتا۔ جس طرح کہ آج کل مارکس ازم کا نظام بین الاقوامیت کے خیال کی حفاظت کر رہا ہے۔ اور اس کے لئے راستہ کھولتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اسی مقصد و مدعا کو پیش نظر رکھ کر ہماری نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔

اس وقت مجھے محسوس ہوا۔ کہ تمام دنیا سے تعلق رکھنے والے مختلف مسائل پر جو مختلف اصول حاوی ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک خاص اور بنیادی اصولوں کو اخذ کر کے انہیں کم و بیش مذہبی عقائد کی سی شکل میں عوام کے سامنے پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ وہ آسانی سے سمجھ کر بسہولیت عملی جامہ پہنا سکیں اور اس طرح ان کی بدولت ان سب میں ایک عملی اتحاد و یک جہتی پیدا ہو جائے۔ یعنے دوسرے

اس کی بنیاد اس یا ایسے ہی کسی دوسرے زہریلے اصول پر نہ ہوتی۔ تو اس
کے عقائد و مسائل کو اتنی کامیابی ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔ جتنی کہ ہوئی
ہے۔ کارل مارکس درحقیقت ان بیشمار آدمیوں میں سے ایک تھا۔ جو اس
بگڑی ہوئی دنیا کے بیرونی طور پر مندمل شدہ زخموں کے اندر اس زہر
کی موجودگی کو پہچان گیا تھا۔ اور اپنے طلسمی فن کی مدد سے اس نے باہر نکال
لایا تھا۔ تاکہ اس کی مدد سے وہ دنیا بھر کی آزاد قوموں کو تباہ و برباد کر کے
اپنے یہودی بھائیوں کی کچھ بہتری و بہبودی کر سکے۔ جن کا اپنا نہ کوئی
ملک تھا۔ اور نہ کوئی متحد قوم۔ اس طرح آج کل جو متفرق خیالات دنیا میں عام
طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مارکس ازم کے اصول ان سب کا ہی ایک نہایت
دانشمندانہ لب لباب ہیں۔ اور اسی لئے ان سبھی خیالات کے پیروؤں میں وہ
مقبول عام ہو رہے ہیں۔ لیکن دنیا کے اس حصے یعنی جرمنی میں انسانی تہذیب
اخلاق کے اندر آرین عنصر کچھ ایسے عجیب طریقے پر ملا ہوا ہے۔ کہ وہ اس سے
کسی طرح بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ عنصر کسی طرح خارج ہو گیا۔ یا اندر
جذب ہو کر غائب ہو گیا۔ تو کرۂ زمین پر ایک مرتبہ پھر بدتہذیبی و بداخلاقی کا
تاریک پردہ چھا جائے گا۔ اس لئے جو شخص بھی دنیا پر قوم پرستی کی نظروں
سے نگاہ ڈالے گا۔ اسی پر یہ صاف طور سے ظاہر ہو جائے گا۔ کہ انسانی تہذیب
کی ہستی میں جو بھی کتر بیونت کی جاتی۔ اس کا اثر اس نسل و قوم پر ضرور ہی
تباہ کن پڑتا ہے۔ جو اس تہذیب کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔
اور اس لئے قومی نقطہ خیال سے یہ ایک ایسا جرم ہے۔ جس کے لئے جتنی
بھی لعنت ملامت کی جائے۔ کم ہے۔ کیونکہ وہ شخص بھی بھگوان کی شان
میں سخت گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ اپنے سورگ سے نکالے

(۲)

حکومت اور اس کے فرائض

مگر ۲۰-۱۹۱۹ء میں ہی بوسیدہ اور بے اثر درمیانے طبقے کی طرف سے جو بین الاقوامی اصولوں کا پجاری تھا۔ ہماری نوجوان تحریک کے خلاف یہ الزام لگایا جانے لگا۔ کہ یہ حکومت وقت کے خلاف ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ اس زمانے کی تمام سیاسی پارٹیوں کے مدبر ہم نوجوانوں کو ہر طرح کچلنا اور تباہ کرنا اپنا حق سمجھنے لگے۔

ہمارا قصور صرف یہ تھا۔ کہ ہم ایک ایسا نیا عالمگیر مسئلہ عوام کے سامنے پیش کرنے کی ہمت کر رہے تھے جو انہیں پسند نہ تھا۔ اور اپنے اس جوش میں یہاں تک بھول گئے تھے۔ کہ خود ان کا یہ "متوسط سرمایہ دار طبقہ" بھی چند روز پہلے ہی کھلم کھلا یہ شکایت کرتا رہا ہے۔ کہ حکومت اب یکساں طور پر تمام قوم کی نمائندہ نہیں رہی۔ اس لئے اگرچہ اب اس کی نمائندہ حیثیت کی مناسب و معقول تعریف نہیں کیجا سکتی۔ مگر پھر بھی ہمارے سرکاری سکولوں میں جو استاد لڑکوں کو سرکاری قوانین کی تعلیم دیتے ہیں انہیں حکومت کی ہستی کو حق بجانب ثابت کر کے اسکی تعریف کے راگ کم و بیش گانے ہی پڑتے ہیں کیونکہ حکومت ان کی "مائی باپ" ہے۔ اور وہ اس سے ہی تنخواہ پاتے

الفاظ میں نیشنل سوشلسٹ جرمن پارٹی ایک عالمگیر قومی مسئلہ کے متعلق تمام ضروری اصولوں کو منظور کرنا اپنا فرض خیال کرے۔ اور اس بارے میں تمام عملی امکانات۔ ضروریاتِ زمانہ۔ انسانی طاقتوں اور کمزوریوں کو مدِنظر رکھ کر اپنا ایک ایسا سیاسی عقیدہ تیار کرے۔ جو ہر آئندہ زمانہ میں اس کی عالمگیر قومی مسئلہ کی آخری فتح کی ابتدائی شرط قرار دیا جا سکے۔ اور جب یہ نیا عقیدہ تیار ہو کر اس کی تکمیل و تعمیل کے لئے مناسب ذرائع کا فیصلہ ہو جائے۔ تو اس کی مطابقت میں عوام کی ایک نہایت زبردست اور وسیع اور عالمگیر سنگھٹا کو جنم دیکر اس کی طاقت کو ناقابلِ شکست بنا دے۔

لیکن اس فریق کے لوگ بھی آزادی ؂ کے متعلق اکثر ایک غلط نظریہ قائم کر لیتے ہیں
کیونکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ صرف کسی حکومت کی ہستی ہی اسے پاکیزہ و مقدس
نہیں بنا دیتی بلکہ اسے اپنی معقولیت و پاکیزگی کے متعلق ہر امتحان میں
کامیاب بھی ثابت ہونا چاہئے۔ ہمارے معمولی درمیانہ طبقہ کے جرمن ہموطنوں
میں بالخصوص آزاد خیال جمہور پسندوں (لبرل ڈیموکریٹس) میں اسی
خیال کے لوگ اکثر پائے جاتے ہیں۔

تیسرا فریق جو اپنے تعداد کے خیال سے سب سے زیادہ کمزور ہے۔
اس کا خیال یہ ہے۔ کہ حکومت ایسی طاقت ہے۔ جس کی بدولت ہم ایک
زبان بولنے والی ایک متحدہ قوم کے متعلق چند خیالی و قیاسی پالیسیوں کو
(جن کا ابھی تک کوئی پورا پورا فیصلہ بھی نہیں ہو سکا ہے) عملی جامہ پہنا سکتے ہیں
اور اس طرح اس کی مدد سے قوم کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔"

مجھے درحقیقت یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا تھا۔ کہ جن لوگوں کے نیک نیتی
کے ساتھ یہ خیال تھے۔ ان میں سے بھی اکثر گذشتہ ایک سو سال کے
عرصہ میں "جرمن پن" کے لفظ کے ساتھ مذاق کرتے رہے ہیں۔ اور انہوں
نے کبھی حقیقی طور پر اسکا مطلب سمجھنے اور اس کی اہمیت و عظمت سے
فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے۔ کہ میرے
ابتدائے شباب کے زمانے میں بھی کس طرح لوگ اس لفظ کی بدولت
حیرت خیز غلطیوں میں پھنس جاتے تھے۔ یعنی اسوقت بھی پان جرمن (جرمنوں
کے عالمگیر اتحاد کے حامی) حلقوں میں یہ آواز سنی جاتی تھی۔ کہ حکومت کی
مدد سے ہی آسٹریا اور سالون (Solvenes) علاقہ جات کے باشندوں
کو جرمن قوم میں کامیابی کیساتھ شامل کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ یہ کبھی خیال

ہیں۔ اس لئے کسی ملک کا آئین حکومت جتنا بھی خراب ہوتا ہے۔ اور جتنے بھی زیادہ احمق و نااہل کسی حکومت کے کارکن ہوتے ہیں۔ اتنی ہی ان کی زیادہ تعریف کی جاتی ہے۔ اور انکی ہستی کو ملک کے لئے زیادہ ضروری ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شاہی کالج کا کوئی بھی پروفیسر کسی ایسے ملک میں جہاں کی حکومت اس بیسویں صدی میں بدترین مصیبت خیال کی جاتی ہو۔ حکومت کے اصلی اصولوں کے متعلق نہ کبھی کچھ لکھ ہی سکتا ہے۔ اور نہ ہی پڑھا سکتا ہے۔ اور اس کے لئے بلاشک و شبہ یہ کام نہایت ہی مشکل ثابت ہوتا ہے۔

اگرچہ ایسے لوگوں کو بھی تین فریقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو ملک کو ایسے لوگوں کا ایک مجموعہ سمجھتے ہیں۔ جو کم و بیش رضا کارانہ طور پر ایک آئینِ حکومت کے ماتحت رہنا منظور کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی نگاہوں میں حکومت کی ہستی ہی اسکے اس دعوے کا کافی ثبوت ہے کہ اس کی پاکیزگی میں کسی طرح بھی کوئی خلل پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ انسانی دماغ کے اس احمقانہ خیال کی عملی تعمیل میں "نام نہاد حکومت کے احکام" کی ایسی ہی فرمانبرداری ضروری سمجھتے ہیں۔ جیسی کہ ایک اپنے مالک کے حکم کی کرتا ہے۔ اس طرح وہ صرف اپنی انگلی کے ایک اشارے سے ہی۔ ایک ذریعہ کو آخری مقصد بنا ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ان کی رائے میں حکومت رعایا کی خدمت کے لئے نہیں۔ بلکہ رعایا حکومت کی خدمت اور پرستش کے لئے ہوتی ہے۔ اور یہی ایک طرح سے اس حکومت کے ہر افسر کی سپرٹ ہو جاتی ہے۔

دوسرا فریق یہ سمجھتا ہے۔ کہ حکومت کا فرض صرف حکم چلانا ہی نہیں بلکہ اسے اپنی رعایا کی بہتری و بہبودی کا بھی خیال ضرور رکھنا چاہیئے

ہوں۔ لیکن اگر آرین تہذیب کے نام لیوا اور اس کے محافظ دنیا سے مٹ گئے تو پھر صفحہ عالم پر کوئی دوسری ایسی تہذیب باقی نہ رہ جائیگی۔ جو اپنی دماغی عظمت کے لحاظ سے زمانہ حال کی اعلےٰ ترین قوموں کے ہم پلہ ہونے کا دعوےٰ کر سکے۔ بلکہ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر یہ کہوں گا۔ کہ چونکہ انسان ہی حکومتیں اور ریاستیں قائم کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ اگر بالفرض اس اعلےٰ دماغی قابلیت و عظمت کے محافظوں کی کمی یا غلطی کے باعث ان کی وہ اعلےٰ تہذیب مفقود بھی ہو جائے تو ان کی وہ نسل بھی ان کے ساتھ ہی ساتھ غائب ہو جائے گی اس لئے یہ کہنا پڑے گا۔ کہ "کوئی حکومت یا ریاست بھی کوئی خاص تہذیبی معیار پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ صرف اس نسل کو اپنے اندر شامل کر سکتی ہے۔ جو تہذیب و اخلاق کا فیصلہ کرنے والی ہوتی ہے "

سب قومیں (بلکہ اگر نسلیں کہا جائے تو اور بہتر ہوگا) یہ مفید تہذیبی قابلیت اور تخلیقی طاقت اپنے اندر خفیہ طور پر پوشیدہ رکھتی ہیں۔ خواہ ظاہر حالات ..... کیسے بھی ان کے خلاف کیوں نہ ہوں۔ اور ان سے مجبور ہو کر وہ خود ہی ان کی نشو و نما کی ممانعت بھی کیوں نہ کر دیں؟ اس لئے یہ ظلم شدید ہوگا۔ اگر جرمن لوگوں کو زمانہ مسیح سے پہلے کے وحشی و بے تہذیب جنگلی لوگوں کی نسل سے کہا جائے۔ جن سے کہ ان کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ کیونکہ ان وحشیوں کے قدیم شمالی مسکن کی موسمی سختیوں اور شدتوں نے تو انہیں کبھی اس امر کی اجازت ہی نہیں دی۔ کہ وہ اپنی اس تخلیقی قوت کو کسی زمانے میں بھی مناسب طور پر نشو و نما دے سکتے۔ لیکن ہاں اگر اس وقت قدیم یونانی رومن تہذیب دنیا میں موجود نہ ہوتی۔ اور وہ لوگ زیادہ معتدل و موافق

میں بھی نہیں آسکتا۔ کہ کسی طرح کبھی کسی حبشی یا چینی کو محض اس لئے جرمن "
کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس نے جرمن زبان سیکھ لی ہے۔ نیز وہ عمر بھر اسے بولتے
رہنے کے لئے تیار ہے۔ اور جرمنی کی کسی سیاسی پارٹی کے حق میں رائے
دینے کے لئے بھی آمادہ ہے۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری نسل
میں دوغلاپن شروع ہو جائیگا۔ اور ہمارے اوپر اس کا یہ اثر پڑیگا۔ کہ وہ تو
جرمن کیا ہونگے۔ ہم میں ہی جرمن پن کا جو عنصر باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی تباہ و
برباد ہو جاویگا۔ کیونکہ قوم و نسل کا تعلق زبان کے ساتھ بالکل نہیں بلکہ خون کیساتھ
ہے۔ اور کسی غیر جرمن کو جرمن بنانے کی کوشش صرف اسی صورت میں کامیاب
ہو سکتی ہے۔ جبکہ اس کا خون بھی کسی طرح بدلا جا سکتا ہو۔ ورنہ اس کا انجام
یہی ہوگا۔ کہ اعلےٰ نسل کے خون کے ساتھ ملکر اپنی سب عظمت و اہمیت کھو
بیٹھے گا۔ اس کے ثبوت میں تاریخ بھی یہ شہادت دے رہی ہے۔ کہ جس
ملک کو ہمارے بزرگوں نے بزور شمشیر فتح کر کے وہاں جرمن کاشتکاروں کو آباد
کر دیا وہی ہمارا ہوا ہے لیکن جب انہوں نے ہماری قوم کے خون میں کسی غیر
خون کو داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تب ہی ہماری اپنی قومی خصوصیتوں پر
اس کا ناپسندیدہ اثر پڑا ہے۔ اور وہ زائل ہونے لگ گئی ہیں۔ اس لئے
سب سے بڑا اصول جسے ہمیں مدِنظر رکھنا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ حکومت
یا ریاست ہی ہماری منزلِ مقصود تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ ہے
اور ایک ایسی بنیاد ہے۔ جس پر ..... قومی تہذیب کی ایک عظیم الشان
عمارت قائم کی جا سکتی ہے۔ جو اس تہذیب کی برکتوں سے پہلے مالا مال ہو کر
اپنے اندر یہ قابلیت پیدا کر چکی ہے "
غرضیکہ دنیا میں حکومت و ریاست کے ہزار ہا نمونے کیوں نہ موجود

سے صرف اس صداقت پر قائم رہنا چاہیئے جسے کہ ہم تسلیم کر چکے ہیں ۔ اور جبکی پاکیزگی اہمیت اور عظمت پر ہم ایمان لا چکے ہیں ۔ تبھی ہم یہ یقین کر سکتے ہیں ۔ کہ ہماری آئندہ نسلوں کا زیادہ صاف و روشن تخیل نہ صرف ہمارے موجودہ طریق عمل کو اچھی طرح سمجھ ہی سکیگا ۔ بلکہ یہ بھی تسلیم کرے گا ۔ کہ ہم صداقت پر تھے ۔ اور اس لئے وہ ہماری اور ہمارے کاموں کی بھی عزت کرے گا ۔

ایک حکومت کے اعلیٰ مشن کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں یہ بھی ہر گز نہ بھولنا چاہیئے ۔ کہ اس اعلیٰ مشن کا جائے مقام لازمی و لابدی طور پر قوم کا دل ہے اس لئے حکومت کا فرض صرف اس حد تک محدود ہے ۔ کہ وہ قوم کی آزادانہ نشوونما کو ترقی دینے کے لئے اپنی طاقت تنظیم سے پورا پورا کام لیتی رہے اور اس میں کسی طرح سے بھی کوئی کمی رونما نہ ہونے دے ۔ لیکن اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ ہم کیسی جرمن حکومت چاہتے ہیں ؟ تو سب سے پہلے ہمیں صریحی طور پر یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ ہم حکومت کے ذریعے کیسے انسان پیدا کرنا چاہتے ہیں ؟ اور ان انسانوں کی مدد سے کس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ہمیں مطلوب ہے ۔

لیکن بدقسمتی تو یہ ہے ۔ کہ ہماری جرمن قوم کے درمیانی طبقے میں اب نسلی یگانگت و یکسانیت بھی قائم نہیں رہی ۔ اور نہ اس کے مختلف حقیقی اجزا کو یکجان بنانے کا عمل ہی اتنی نشوونما حاصل کر سکا ہے ۔ جس کی بنا پر ہم یہ دعوے کر سکیں کہ ہم ایک نئی نسل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ۔ بلکہ برعکس اس کے وہ جنگ سی سالہ کے بعد سے ہمارے قومی و نسلی جسم میں جس زہریلے خون کی ملاوٹ جاری ہے ۔ اس سے نہ صرف

آب وہوا والی جنوبی سرزمینوں میں آپہنچتے۔ اور انہیں اپنی ترقی ونشو ونما کے لئے وہ ابتدائی سہولتیں نصیب ہوجائیں۔ جو اوروں کو ملتی رہی ہیں۔ یعنی کہ کہ ان کا بھی واسطہ اپنے سے ادنےٰ نسلوں کے ساتھ پڑتا جن سے کہ وہ اپنی تہذیبی نشوونما میں مدد لے سکتے تو یقیناً وہ بھی اپنی پوشیدہ تخلیقی طاقتوں کی امداد سے ایک ویسی ہی شاندار تہذیب کی بنیاد رکھنے میں ضرور کامیاب ہوجاتے جیسی کہ یونانی تہذیب تھی مگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایسا ہوا نہیں۔ اور نہ اب ہی ہونا ممکن ہے۔

اس لئے ہر ایک حکومت کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اپنی تہذیب واخلاق کی اشاعت سے اپنے ان قدیم نسلوں کے عناصر کی حفاظت کرتی رہے۔ لہٰذا ہمیں بھی آرین نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی حیثیت سے اپنے قومی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہوئے صرف ایک ایسی قومیت کی زندہ تنظیم کو ہی اپنے آدرش کے طور پر نظروں کے سامنے رکھنا چاہیئے۔ جو نہ صرف ہماری قومی ہستی کو ہی برقرار رکھے بلکہ اس کی دماغی تخیلی اور تخلیقی طاقتوں کو بھی نشوونما دیتا ہوا اسے آزادی کے بلند ترین مدارج تک پہنچانے میں کامیاب ہوسکے۔ لیکن بایں ہمہ حکومت کی طرف سے ہم پر جو دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ وہ ایک شدید ترین غلطی کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے جس کا انجام ہمارے لئے نہایت مصیبت خیز اور تباہی بخش ہوسکتا ہے۔ ہم نیشنل سوشلسٹ اس حقیقت سے بھی ناواقف نہیں۔ کہ دنیا ہمیں بدترین انقلاب پسند کہتی ہے۔ اور اس لئے ہمارے خیالات کی مذمت کرتی ہے۔ لیکن ہمارے خیالات وافعال پر ہماری اپنی یا کسی اور کی کسی منظوری یا مذمت کا کچھ بھی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ بلکہ ہمیں نہایت ہمت واستقلال

کے درجہ تک پہنچانا چاہیئے۔ لیکن یہ بھی تو بالکل قدرتی ہے۔ کہ جو حکام آج ہماری حکومت اور ہماری قسمت کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی موجودہ حالت میں ہی بیحد خوش و خرم ہوں۔ جبکہ انہیں حکومت کی گاڑی کو رسمی طور پہ چلتے رکھنے کیلئے کوئی خاص جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ ماسوائے کسی ایسی حالت کے جس میں کہ انہیں نئی سے نئی چیزوں کے حاصل کرنے کیلئے خاص کشمکش کرنیکی اشد ضرورت پڑیگی۔ اس وقت وہ حکومت کو ایک ایسی مشین کے طور پہ قائم رکھنے کی سہولیت کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ جس کا مقصد صرف انہیں زندہ رکھنے کا ہے۔ کیونکہ ان کی زندگیاں بھی تو جیسا کہ وہ نہایت زور سے دعوے کئے کرتے ہیں " حکومت کی ہی ملکیت ہیں " اس لئے ان کے خیال میں انہیں محفوظ رکھنا ہی حکومت کا فرض اولین ہے۔

لیکن جب ہم اپنے نئے خیالات کی حفاظت میں جنگ و جدل کرتے ہیں جو حقیقی صورت حالات کے عین مطابق ہیں۔ تو ہمیں ان لوگوں میں سے بہت ہی کم ساتھی ملتے ہیں۔ جو کہ جسمانی طور پہ نہ صرف کمزور بلکہ کثیر التعداد حالات میں دماغی طور پر بھی بالکل ہی بے کار اور مردہ ہو چکے ہیں۔ اگرچہ عین ممکن ہے کہ صرف "استثنٰی" کے طور پر کہیں کہیں ہمیں ایسے بوڑھے بزرگ بھی چند ایک ملجائیں جن کے کہ دل و جان و دماغ تروتازہ ہوں۔ لیکن وہ لوگ تو کسی صورت میں بھی ہمارے کسی کام نہیں آسکتے۔ جو یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے۔ کہ وہ موجودہ صورت حال میں کسی طرح کی بھی کوئی تبدیلی نہ ہونے دیں۔ اور اسے جیون کی بیتوں بنائے رکھیں۔

لہٰذا ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر ہمیں تمام قوم میں سے اعلیٰ درجہ کی قابلیت اور طاقت و قوت کی ایک خاص قلیل فیصدی بھی ایسی حاصل

ہمارے خون میں ہی خرابی پیدا کر دی ہے۔ بلکہ ہماری روح بھی متاثر ہونے لگی ہے۔ کیونکہ ہمارے آبائی وطن کی کھلی حدود اور ان کے نواحات میں غیر جرمن قوموں کی موجودگی۔ پھر سب سے بڑھ چڑھ کر ہماری ریش (قومی پارلیمنٹ) کے اندروں ترین حصوں میں اُس غیر خون کا مسلسل داخلہ۔ ہمیں اسے مکمل طور پر جذب کرنے کا موقعہ و مہلت بھی تو نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ بہاؤ بغیر کسی روک ٹوک کے برابر جاری ہے۔

مزید برآں اب جرمنوں میں وہ جتھا بندی کا قدرتی احساس بھی باقی نہیں جو ایک ہی خون اور ایک ہی نسل کی قوموں میں ہوا کرتا ہے۔ اور ان کی حفاظت کیا کرتا ہے خصوصاً اس وقت جب کہ انہیں غیر قوموں کی طرف سے تباہی و بربادی کا کوئی خطرۂ عظیم درپیش ہو۔ اور اسکی احساس کی عدم موجودگی نے ہمیں ناقابل بیان نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ اس نے بہت سے چھوٹے چھوٹے حکمران پیدا کر دئے ہیں جن کے اپنے اپنے پایہ تخت جدا جدا ہیں لیکن اس نے جرمن قوم کو اس کے اس حق حکومت سے محروم کر دیا ہے۔ جو اسے کبھی حقیقی شان کا مستحق بنا سکتا ہے۔ اس لئے اب ہمیں اس مردہ مشین کی بجائے جو صرف اپنی بیکار ہستی کے لئے قائم رہنے کا دعوٰے کر رہی ہے۔ کوئی ایسی زندہ مشین قائم کرنی چاہئے۔ جس کا واحد مقصد کسی اعلٰے تخیل کی نشوونما اور اس کی خدمتگذاری ہو۔

جرمن ریش کو ایک آلہ حکومت کی حیثیت سے۔ تمام جرمنوں کو اپنے سایہ عاطفت میں جگہ دینی چاہئے۔ اور انہیں اپنے گردوپیش جمع کرنا چاہئے اسے نہ صرف جرمن قوم کے بہترین حقیقی نسلی عناصر کو منتخب کر کے ان کی حفاظت کا فرض سرانجام دینا چاہئے بلکہ انہیں مناسب نشو و نما دیکر عظمت و اہمیت

کیلئے شادی کی رسم کو ایک دائمی بے عزتی اور تنزل کا باعث ہرگز نہ بننے دے
بلکہ اسے اس حالت سے اٹھا کر ایک ایسی سنستھا (انسٹی ٹیوشن) کے طور پر
پاکیزہ و مقدس بناتی چلی جائے۔ جس کا مقصد ایسے انسان پیدا کرنا ہو۔ جو بھگوان
کی مورتی (LORD IMAGE) کہلا سکیں نہ کہ ایک ایسی خوفناک ہستی ہوں
جو نصف انسان اور نصف بندر کا مرکب مانا جائے۔

انسانی حقوق کی بنا پر اس خیال کے خلاف اظہار ناراضگی کسی طرح بھی
موزوں و مناسب نہیں خصوصاً آج کل کے زمانہ میں جبکہ ہر ایک گرے سے
گرے انسان کو بھی یہ آزادی حاصل ہے۔ کہ اپنی حیوانی خواہشات کا غلام
ہو کر اپنے ہی جیسی ناکارہ آوارہ من مانی اولاد پیدا کرتا چلا جائے۔ کیونکہ
اس طرح جہاں وہ ایک طرف اپنے قوم و ملک پر ایک نازیبا بوجھ لاد کر اس
کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں ناگفتہ بہ اضافہ کرتا ہے۔ وہاں دوسری طرف
اپنی اولاد کو بھی ناگفتہ۔ بہ آفتوں اور مصیبتوں کا شکار بناتا ہے۔ بالمقابل
اس کے ہر ایک دوا فروش کی دوکان پر بلکہ ہر ایک بازاری اور پھیری لگانیوالے
نام نہاد ڈاکٹر اور حکیم کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ تندرست سے تندرست
اور مضبوط سے مضبوط مردوں اور عورتوں کے ہاتھ مانع حمل ادویات فروخت
کر کے انہیں اولاد پیدا کرنے اور اس کی پرورش کرنے کی پاک ذمہ داریوں
کو اپنی نفس پرستیوں پر قربان کرتے رہنے کی ترغیب دیتے رہیں۔ مگر آئندہ
آنیوالی "باضابطہ حکومت" میں قوم پرست درمیانہ طبقات کے بہادر شہریوں
کے لئے صرف اسی صورت میں اولاد پیدا کرنا جرم قرار دیا جائے گا۔ جبکہ
والدین۔ آتشک۔ سوزاک۔ تپ دق یا اور کسی ایسے ہی پشتینی وراثتی
امراض کا شکار ہوں۔ جن سے کہ دائم المریض بچے پیدا ہونیکا احتمال ہو

ہو جائے جو ایک واحد مقصد کے لئے متحد و متفق ہو۔ اور ہیجان و بے حس عوام سے وہ نمایاں طور پر الگ نظر آئے۔ تو یہ قلیل فیصدی بھی قدرتی طور پر باقی تمام اکثریت پر حاوی آکر ان کی مالک و مختار بن بیٹھے گی۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ ان اقلیتوں کی ہی بنائی ہوئی ہے۔ جو بعد میں قوم کی قوت ارادی اور استقلال و حوصلہ کے ایک بڑے حصے کو اپنے ساتھ شامل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

اس سے یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ جو صورت پہلے اکثر لوگوں کو کمزور اور وقت سے پُر معلوم ہوتی ہے۔ وہی حقیقت میں فتح کی ایک لابدی و لازمی صورت ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی کام کی اہمیت عظمت اور مشکلات کو دیکھ کر ہی اکثر بہترین جنگ آزما خود بخود اسکی حمایت و حفاظت کے لئے میدان جنگ میں آڈٹتے ہیں۔ اس لئے کامیابی کا راز ہمیشہ ایک مقصد کے بہترین انتخاب میں مضمر رہتا ہے۔

ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہر ایک نسلی دوغلے پن کا نتیجہ جلد یا بدیر مخلوط اولاد کے تنزل میں رونما ہوا کرتا ہے۔ جب تک کہ اعلٰے عنصر اس اختلاط میں غالب رہتا ہے۔ تب تک اسکی ہستی قایم رہتی ہے۔ جب وہ رفتہ رفتہ مغلوب ہو جاتا ہے۔ تبھی اس کے خاتمے کی ابتدا شروع ہو جاتی ہے۔ جس کی انتہا انجام کار فنا و بربادی ہے۔ لیکن ایسی حالت میں نسل برقرار رکھنے کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ نئی قوت تولید و طاقت زندگی حاصل کرنیکی غرض سے پھر اسی قدرتی عمل کو شروع کیا جائے۔ خواہ اسکی رفتار کتنی بھی سست کیوں نہ ہو؟ جس سے آہستہ آہستہ وہ ادنے قسم کا زہریلا خون خارج ہو جائے۔ اس طرح نسلی پاکیزگی پھر بڑھتی جائیگی۔ اور وہ دوغلے پن کا عمل آہستہ آہستہ بالکل رک جائے گا۔

اس لئے ایک حکومت کا یہ پہلا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ نسل کی بہتری

احتیاط سے یہ دیکھنا چاہیئے کہ بچے نہ صرف تندرست اور مضبوط ہی پیدا ہوں بلکہ انکی پرورش بھی مناسب آرام و آسائش اور غور و پرداخت سے ہوتی رہے" جو شخص بھی وراثتی بیماریوں یا شخصی ناقابلیتوں کا شکار ہوں۔ ان کے لئے بچے پیدا کرنا سخت باعثِ شرم سمجھا جائے اور وہ اولاد پیدا نہ کرنے میں ہی اپنی عزت وحرمت خیال کریں۔ اس کے برخلاف قوم کو تندرست وصحت مند بچوں سے محروم رکھنا باعث ندامت خیال کیا جائے۔ حکومت کو بہترین و جدید ترین طبی ذرائع سے ان متذکرہ بالا مسلمہ صداقتوں کی حمایت وعلی خدمت کرنی چاہیئے۔ اور جو لوگ صریحی طور پر ناگفتہ بہ بیماریوں یا دیگر ناقابلیتوں کا شکار ہوں۔ انہیں اولاد پیدا کرنے کے قابل قرار دے کر ان افعال تولید کو قابلِ سزا قرار دینا چاہیئے۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اس ملعون وہم پرستی کے زمانہ میں جب کہ بچے پیدا کرنا والدین کے لئے باعث لعنت سمجھا جارہا ہے۔ کسی بھی اولاد پیدا کرنے کے قابل تندرست عورت کی طاقت تولید ماری نہ جائے۔

حکومت ہر شخص کو مناسب تعلیم و تربیت دیکر یہ حقیقت اس کے ذہن نشین کرادے کہ بیمار اور کمزور باعثِ شرم ہی نہیں بلکہ ایک قابلِ افسوس بدقسمتی ہے۔ جو شخص بھی اپنی خودغرضی سے اپنی اس بدقسمتی کا بوجھ کسی دوسری معصوم ہستی کی گردن پر لادتا ہے۔ وہ ایک سخت مجرمانہ اور شرمناک فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور جب ایک بیمار مگر بے قصور شخص اپنی کوئی ذاتی اولاد پیدا کرنے کا خیال بالکل ہی چھوڑ دیتا ہے اور اسکی بجائے اپنی پدرانہ الفت ومحبت کسی دوسرے کے بچے کی طرف منتقل کر دیتا ہے جس کی صحت وتندرستی یہ امید دلاتی ہو۔ کہ وہ بڑا ہو کر ملک وقوم کا ایک تنومند اور

اور آجکل کے طریق عمل کے بالکل خلاف لاکھوں تندرست توانا بہترین صحت مند مردوں اور عورتوں کا محض اپنی نفس پرستیوں کے لئے پیدا کرنے کی ذمہ واریوں سے پہلو بچانا۔ قوم و ملک بلکہ اخلاق و تہذیب کیخلاف ایک زبردست جرم سمجھا جائیگا۔ کیونکہ یہ موجودہ صورت حال تو کوتہ اندیشی اور تخیل کی بے عملی کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہی جا سکتی اور جب یہ حالت نہ رہیگی۔ تبھی لوگوں اور ان نمائندہ حکومت کو اپنے دل و دماغ پر پورا پورا زور ڈال کر وہ ذرائع تلاش کرنے پڑیں گے۔ جن سے کہ قوم کے ان تندرست و صحت مند نمائندوں (یعنی بچوں) کی مناسب طور پر پرورش و حفاظت ہو سکے تاکہ وہ بھی اپنے وقت پر اپنی آئندہ نسلوں کے مفاد کی ایسی ہی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ خوبی و خوش اسلوبی سے حفاظت و خدمت کر سکیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ہماری موجودہ حکومت میں اپنی عزت و عظمت کے خیال اور آدرشوں کی کتنی خوفناک کمی ہے ؟ اور کوئی شخص بھی اس کمی کو محسوس کر کے ان خوبیوں کو پیدا کرنا اور نشو و نما دینا نہیں چاہتا۔ جو کہ آئندہ نسلوں کے لئے بہترین طور پر فائدہ مند ثابت ہو سکیں۔ بلکہ جیسے بھی برے بھلے آج کل گذارہ ہو رہا ہے۔ اسے ہی سب برابر جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک قومی حکومت کا ہی یہ فرض ہے۔ کہ اس وقت ہر پہلو سے ملک و قوم کو جو نقصان ہو رہا ہے۔ اُسے پورا کرنے کے لئے ہر طرح کی کوشش کرے۔ قوم کی عام زندگی میں نسل کے خیال کو مرکزی اہمیت دیکر اسے سب کے سامنے مناسب طریق پر حل کرے۔ اور ہمیشہ اس بارے میں محتاط رہے کہ اس کی پاکیزگی میں کبھی کوئی خلل واقع نہ ہو۔ نیز یہ اعلان کر دے۔ کہ بچے قوم کا نہایت ہی بیش بہا اور گراں قیمت سرمایہ ہیں۔ اس لئے اسے نہایت

سا بن گیا ہے۔ کہ اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی تباہی و بربادی میں شک و شبہ ہی کیا رہ سکتا ہے؟ ہم سب کو آئندہ اس مکر و فریب کا شکار ہونے سے صاف انکار کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارا درمیانہ طبقہ اپنی خرابیوں کے لحاظ سے اب اپنی آخری حد تک پہنچ چکا ہے۔ اور اس میں انسانیت کی بہتری و بہبودی کے لئے کوئی زبردست جدوجہد کرنے تک کی طاقت بھی بالکل نہیں رہی۔ یہ حالت بیحد بُری ہے۔ اور میری رائے میں اس کا باعث کوئی دیدہ دانستہ عیب نہیں... بلکہ صرف بے ہمتی اور سستی ہے جس سے بیشمار خرابیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک عرصہ دراز سے بورجوس پارٹیوں کے نام سے بہت سی سیاسی کلبیں قائم ہیں۔ لیکن انہوں نے کیا کیا ہے؟ سوائے اس کے کہ وہ مختلف جماعتوں اور پیشوں کی نمائندگی کر کے ان کے خود غرضانہ مفادات کی حتے الوسع حفاظت کرتی رہی ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ درمیانہ طبقے کے مدبروں کی ایک جماعت جیسی کہ ہماری یہ پارٹی بھی ہے۔ مردانہ وار جدوجہد کے سوا اور سب ہی کچھ کر سکتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اس کے فریق مخالف میں۔ صرف محتاط دوکاندار ہی شامل نہ ہوں۔ بلکہ عام جمہور بھی ہوں۔ جو کہ بیدار ہو کر پورے جوش و خروش اور مستقل مزاجی کے ساتھ ہر طرح کی جدوجہد اور کشمکش میں حصہ لینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

ایسی حالت میں حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ قوم کے نوجوان عنصر کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں آہستہ آہستہ قوم کو مضبوط اور طاقتور بنانے اور اس کے ترقی و بہبودی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک موزوں و قابل آلہ کار کے طور پر ہر طرح استعمال کرتی رہے۔ اسے اپنے اس مقصد

مضبوط فروبنے گا۔ تو وہ درحقیقت ایک نہایت شریفانہ اور قابل تعریف کام کرتا ہے۔ اس کام سے بھی حکومت عوام کی سرگرمیوں کو ان کی دماغی اور ذہنی خوبیوں سے بھی آراستہ و پیراستہ کرتی چلی جائیگی۔ مگر اپنے اس فرض کو سرانجام دیتے ہوئے حکومت کو اپنے دلمیں اس امر کا کچھ بھی خیال کبھی نہ لانا چاہیئے۔ کہ عوام اسکے اس کام کی اہمیت و عظمت کو ٹھیک طور پر سمجھتے ہیں یا نہیں اور اسے ان میں ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے یا غیر ہر دلعزیزی۔ کیونکہ ہر ایک نیکی بذات خود اپنا معاوضہ ہے۔ اور آخر اسکا انجام بخیر ہوتا ہے۔

شادی کے متعلق قوم کی ذہنیت میں یہ زبردست تبدیلی پیدا کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ کیونکہ حالات موجودہ میں جبکہ انسان اپنے گھوڑوں۔ کتوں بلیوں وغیرہ پالتو جانوروں کی نسل کو بہتر بنانے کی فکر میں شب و روز مبتلا رہتے ہیں۔ تو کتنے افسوس و شرم کی بات ہے کہ انہیں اپنی نسل کو اچھا اعلےٰ اور مضبوط بنانیکا کچھ بھی خیال نہیں ہوتا جہاں ایک آدمی تو سب کچھ جانتا اور سمجھتا ہوا بھی کمال خاموشی سے اس غلط تیاگ اور ویراگ میں مست رہتا ہے وہاں دوسرا ہر طرح کی رنگ رلیاں کرتا ہوا موج اڑاتا رہتا ہے۔ شادی کے متعلق متذکرہ بالا تبدیلی اس دنیا میں کسی طرح بھی ناممکن نہیں سمجھنی چاہئے۔ جہانکہ سینکڑوں اور ہزاروں شخص صرف دھرم اور مذہب کے نام پر برہمچریہ اور مجرد کی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی قوم اپنی ایسی کمزوریوں کے باعث نقصان برداشت کرتی ہے۔ جن سے وہ اچھی طرح آگاہ ہے۔ اور جن خرابیوں کو وہ تسلیم بھی کرتی ہے۔ (جیسی کہ آج کل ہمارے درمیانے طبقے کی حالت ہے۔ اور جو نہایت ہلکے پن سے یہ کہہ دینے کا کچھ عادی

حکومت کی ہستی ہی صرف اس کی حمایت و حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ اور حکمرانوں کی کسی ملک و قوم کو ضرورت ہی کیا ہے؟ لہٰذا ہر ایک قومی حکومت کو اپنی تعلیمی کام کو اس طرح تقسیم کرنا چاہیئے کہ بچوں کے جسم اپنے بچپن کے نہایت ابتدائی زمانے سے ہی آئندہ زندگی کی سختیوں کو برداشت کرنے اور جھیلنے کے قابل بنائے جا سکیں۔ اور اس امر کی خاص احتیاط رکھنی چاہیئے کہ کہیں ڈرپوک اور آرام طلب "گھر گھسوؤں" کی نسل پیدا نہ ہو جائے۔

ایک قومی حکومت میں یہ بھی نہایت ضروری ہے۔ کہ سکولوں میں جسمانی ورزش کے لئے خاص اوقات مخصوص ہوں۔ اور کوئی ایک دن بھی ایسا نہ گذرنے پائے جس میں بچوں کو کم از کم ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام جسمانی ورزش نہ کرائی جائے۔ خواہ وہ کھیل کود کی صورت میں ہو یا جمناسٹک دقواعد کی خصوصاً ایک کھیل تو ایسا ہے جسے کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ بہت سے قوم پرست حضرات اسے ہی حقارت بھری نظروں سے دیکھ کر "گنواروں اور اجڈوں کا سا کھیل" یا کرتے ہیں۔ وہ کھیل کیا ہے؟ "باکسنگ یعنی مکہ بازی" اس کے متعلق عام تعلیم یافتہ لوگوں میں عموماً جو غلط خیالات پھیل رہے ہیں۔ وہ ناقابل یقین ہیں۔ کیونکہ وہ ایک نوجوان کے لئے یہ تو قدرتی ضروری اور باعث عزت سمجھتے ہیں۔ کہ اسے لڑنا آتا ہو۔ اور لڑنا بھی "ڈویل" جو دو آدمی بغیر کسی اور کی مدد کے تلواروں، پستولوں اور دیگر خطرناک ہتھیاروں سے لڑا کرتے ہیں لیکن "مکہ بازی کو وہ "گنوار" اور "اجڈ پن" خیال کرتے ہیں حالانکہ مقابلہ اور لڑائی کا کوئی دوسرا کھیل ایسا نہیں جو مکہ بازی کی مانند حملہ آوری کی سپرٹ کو نشو و نما دیتا ہو۔ اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہو۔ اس میں بجلی کی سرعت کے ساتھ فیصلہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور جسم میں مضبوطی

کو پیش نظر رکھ کر سب سے پہلے ان کی تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ لیکن اس تعلیم کا مقصد زیادہ تر یہ نہ ہو کہ ان کے دماغوں میں مختلف علوم ٹھونس ٹھونس کر بھر دیئے جائیں۔ بلکہ یہ ہو۔ کہ ان کے جسموں کو فولاد جیسے مضبوط اور ہر پہلو سے تندرست اور ہر بیماری سے پاک بنایا جائے۔ اس کے بعد ان کی دماغی قابلیتوں کو بڑھانے کا سوال پیدا ہوگا۔ پھر اس میں بھی چال چلن کی پختگی اور پاکیزگی کا درجہ سب سے افضل و برتر سمجھنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ ان کی قوت ارادی اور جرات و استقلال کو بڑھانے کی طرف خاص توجہ دی جائے اور اس پہلو میں ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جائے نیز اہم ذمہ واریاں اپنے سر پر لینے اور انہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے سے جو خوشی و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی عظمت و اہمیت انہیں اچھی طرح سکھلائی جائے۔ تب کہیں خالص کتابی علوم و فنون کی تعلیم کا نمبر آنا چاہیئے۔

اس لئے ایک قومی حکومت کو ہمیشہ اس اصول کو مدنظر رکھ کر کام کرنا ہوگا۔ کہ ایک معمولی سا تعلیمیافتہ۔ لیکن مضبوط اور تندرست جسم نیز پختہ و پاکیزہ چال چلن والا نوجوان جو پُر مسرت۔ خود اعتمادی اور قوت ارادی سے بھرپور ہو۔ قوم و ملک کے لئے بدرجہا زیادہ بہتر اور کار آمد ہے بہ نسبت ایک کمزور اور دائم المریض شخص کے خواہ اس کے پاس یونیورسٹی کی اعلےٰ ڈگریاں کیوں نہ ہوں اس لئے ایک قومی حکومت کے زیر سایہ جسمانی نشوونما اور تربیت کا کام پرائیویٹ اشخاص کے سپرد نہیں ہونا چاہیئے۔ اور نہ اسے قومی ضروریات میں دوسرا یا تیسرا درجہ دے کر بچوں اور نوجوانوں کے والدین کے لئے ہی چھوڑ دینا چاہیئے بلکہ اسے نسل کی برقراری و مضبوطی کے لئے سب سے زیادہ ضروری سمجھ کر سب سے اول درجہ دیا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر پورے پورے غور و خوض سے دیکھا جائے۔ تو

کہ وہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو دنیا میں سب سے افضل و برتر ہے۔ ساتھ ہی اس کے اپنی جسمانی اور دماغی قابلیت کی بدولت نوجوانوں کے دلوں میں یہ پختہ اعتماد پیدا ہو جائے۔ کہ ان کی قوم دنیا میں ناقابل فتح ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی جس طاقت وقوت سے ایک زمانہ میں جرمن فوجوں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ وہ یہ خوداعتمادی کی ہی طاقت تھی جن سے ان کے ہر ایک سپاہی کا دل بھرپور تھا۔ اور جسے ان کا ہر ایک افسر و رہنما ہر وقت محسوس کرتا تھا۔ اسی عقیدے کی بدولت ہم ایک مرتبہ پھر بھی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ عقیدہ صرف لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کے مشترکہ و متفقہ اعتقاد و اعتماد سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے کسی کو بھی اس بارے میں کوئی غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ہماری قوم کی آزادی و خودمختاری کی تباہی کا خاتمہ جتنا عظیم و وسیع ہوا ہے۔ اتنی ہی عظیم و وسیع کوشش بھی ہونی چاہیئے۔ جو اس آزادی و خودمختاری کو پھر بحال کرنے کے لئے کی جائے۔ اور اس کے لئے صرف ضرورت ہے۔ ایک نہایت ہی زبردست قومی قوت ارادی کی۔ ایک نہایت مضطرب کن پیاس کی۔ اور ایک تڑپا دینے والی پر از جذبات جان نثاری کی۔ تب ہی ہمیں وہ چیز بحال کرنے میں کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔ جس کی کہ ہم اس وقت سب سے زیادہ ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔

ایک قومی حکومت کا یہ بھی فرض ہے۔ کہ وہ صرف سرکاری سکولوں میں ہی جسمانی طاقت و قابلیت کو نشوونما دینے پر زور نہ دے۔ بلکہ جب نوجوانوں کے سکول جانے اور تعلیم پانے کے دن ختم ہو جائیں۔ تب بھی وہ اس بات کا پورا پورا خیال رکھے۔ کہ جب تک کوئی نوجوان اپنی جسمانی نشوونما کو جاری رکھ سکے۔ تب ہی تک وہ اس کے لئے بنر رکھے گی —

چستی و چالاکی آتی ہے۔ وہ نوجوانوں کے لئے تلواروں وغیرہ کے ذریعہ اپنی باہمی لڑائی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کی نسبت مکوں سے ہی فیصلہ کرلینا میری رائے میں کسی طرح بھی گنوار پن اجڈپن اور وحشی پن نہیں کہلا سکتا۔

اگر ہماری دماغی تربیت یافتہ جماعت کو صرف اعلےٰ درجے کے نفاست پسندانہ طور وطریق کی ہی تعلیم نہ دی جاتی۔ بلکہ اس کی بجائے یا اس کے ساتھ ہی اسے مکہ بازی کی بھی پوری پوری تعلیم ملی ہوتی۔ تو وہ دلدوز و سینہ سوز نظارے ہرگز دیکھنے میں نہ آتے۔ جو خواہ مخواہ اکڑفوں دکھلانے والے اینٹھے خانوں اور میدان جنگ سے جان بچا کر بھاگنے والوں اور ایسے ہی دیگر ناکارہ لوگوں کی بدولت جرمن انقلاب کے دنوں میں ہمیں دیکھنے نصیب ہوئے ہیں یہ صرف اسی نئے ممکن تھے کہ ہمارے ہائی سکولوں نے جوانمرد سپاہی پیدا نہیں کئے۔ بلکہ ان کی بجائے صرف افسر۔ انجنیر ماہر قانون وکیل اور ماہر علم ادب ادبا اور ان سب کو دماغی طور پر زندہ رکھنے والے پروفیسر ہی پیدا کئے۔ اسی لئے ہمارے دماغی رہنما اپنے امتحانات کے شاندار نتائج تو ہمیشہ دکھلاتے رہے۔ لیکن ان سے ہماری قوت ارادی کو اتنی نشوونما کبھی حاصل نہیں ہوئی کہ وہ مخالفانہ نکتہ چینی بھی مردانہ طور پر برداشت کر سکتی۔

ہماری جرمن قوم اس وقت ایسی افسوسناک حالت کو پہنچ گئی تھی۔ کہ جو بھی چاہتا تھا وہی اسے ٹھوکریں لگا دیتا تھا۔ اس لئے ضرورت یہ تھی۔ کہ اس کے دل میں ایک ایسی حوصلہ افزا طاقت پھونکی جائے۔ جس سے اس میں خود اعتمادی پیدا ہو سکے نیز قوم کی آئندہ نسلوں میں ان کے لڑکپن کی ابتدا سے ہی خود اعتمادی کو نشوونما دینے کی کوشش کی جائے۔ ان کی تمام تعلیم و تربیت میں یہ مقصد پیش نظر رہے۔ کہ ان کے دل پر یہ خیال نقش ہو جائے

کے اور کسی طرح نہیں!

جب اس کی فوجی ملازمت کا زمانہ ختم ہو جائے۔ تو اسے دو طرح کے کاغذات پیش کرنے کے قابل ہونا چاہیئے۔ ایک تو اس کے قانونی کاغذات۔ جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ حکومتِ ملک کا ایک باضابطہ شہری ہے۔ اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ تمام پبلک معاملات میں حصہ لے سکے۔ اور دوسرے اپنی صحت کے متعلق سارٹیفکیٹ جو یہ تصدیق کرے کہ وہ پوری طرح صحت مند اور ہر طرح شادی ہونے کے قابل ہے۔

اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم میں بھی ان کی جسمانی تربیت پر پورا پورا زور دیا جانا چاہیئے اس کے بعد چال چلن کی نشو و نما پر۔ اور سب سے پیچھے دماغی لیاقت و قابلیت پر لیکن لڑکیوں کی تعلیم کا مقصد انہیں زمانہ مستقبل میں اچھی مائیں بنانا ہو۔

زمانہ جنگ میں بارہا یہ شکایت سنی گئی ہے۔ کہ ہمارے سپاہی اپنی زبان پر قابو رکھنے کے بالکل ناقابل تھے۔ اس لئے یہ نہایت ہی مشکل تھا۔ کہ ہم اپنے بیش بہا سے بیش بہا راز بھی۔ دشمنوں کی راز جوئی سے محفوظ رکھ سکتے۔ لہذا ہمیں یہ سوچنا چاہیئے۔ کہ کیا جنگ سے پہلے کبھی ہمارے صیغہ تعلیم نے اس طرف کوئی توجہ دی ہے۔ کہ نوجوانوں کے لوح دل پر یہ بھی نقش کیا جائے۔ کہ خاموشی بھی مردانہ اوصاف میں سے ایک قابل قدر وصف ہے۔ جیسا کسی شاعر نے کہا ہے۔ کہ

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمے آید

نہیں! کبھی نہیں! اب بھی ہمارے سکولوں کی اس طرف کوئی توجہ نہیں اور وہ اسے ایک بالکل معمولی اور ہیچ سی بات سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ معمولی اور ہیچ سی بات ہی حکومت کے لاکھوں اور کروڑوں روپیہ قانونی اخراجات میں صرف

عظمت و برکت کا باعث ثابت ہوتی رہے۔ کیونکہ یہ خیال کرنا ایک بہت بڑی حماقت اور بیوقوفی ہوگا۔ کہ جب کوئی نوجوان اپنی تعلیم ختم کر دے۔ تب ہی حکومت بھی یکایک اسکی نگرانی کے حق سے سبکدوش ہو جاتی ہے اور وہ صرف اسی وقت پھر اس طرف توجہ دے سکتی ہے۔ جب کوئی نوجوان فوجی ملازمت میں داخل ہو۔ کیونکہ ملک و قوم کے نوجوانوں کی جسمانی تربیت اور نشوونما کی نگرانی حکومت کا حق نہیں۔ بلکہ ایک ایسا فرض منصبی ہے۔ جو ہمیشہ اور ہر حالت میں یکساں طور پر جاری رہتا ہے۔ اور کبھی ختم ہو ہی نہیں سکتا۔

صیغہ فوج کا بھی صرف یہی فرض نہیں۔ کہ وہ ایک انسان کو یہ سکھا دے کہ "مارچ" (چلنے کا طریقہ) کس طرح کیا کرتے ہیں؟ اور "اے ٹن شن" (توجہ سے کھڑا ہونا) کس طرح ہوا کرتے ہیں؟ بلکہ اسے اپنے سب نوجوان رنگروٹوں کو ہتھیاروں کا استعمال بھی ضرور سکھانا چاہیئے۔ اور ساتھ ہی اس کے انہیں اپنی آئندہ زندگی میں تعلیم کو بھی جاری رکھنا چاہیئے۔ اور اس سکول میں ہر ایک لڑکے کی کایا پلٹ ہو کر اسے ایک ایسا آدمی بننا چاہیئے۔ جو صرف فرمانبرداری ہی نہ سیکھتا رہے۔ بلکہ زمانہ مستقبل میں فرمان جاری کرنے اور حکم دینے کی قابلیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ وہ نہ صرف اس وقت ہی خاموش رہنا سیکھے۔ جب کہ اس پر فائز و منصفانہ طور پر کوئی الزام لگایا جائے۔ بلکہ اگر ضرورت آپڑے تو بے انصافی کو بھی خاموشی کے ساتھ۔ بغیر کسی چون وچرا کے بخوشی برداشت کر سکے اور اس پر بیقرار ہو کر تلملا نہ جائے۔ اس طرح اپنی ذاتی طاقت و قوت سے مضبوط نیز باہمی رفاقت اور میل جول کی سپرٹ سے بھرپور ہو کر ہی (جو اسے اپنے دوسرے ساتھیوں کی مانند ہر وقت محسوس ہوتی رہنی چاہیئے) ایک نوجوان لڑکا اپنی قوم کے ناقابل فتح ہونے پر ایک سچا اعتماد و اعتقاد حاصل کر سکتا ہے۔ بغیر اس

دینا چاہیئے۔اس قسم کی مسلسل تعلیم سے بہت سے اخلاقی نقائص (جو اس وقت ہمارے قومی جسم میں وراثتی سے معلوم ہوتے ہیں اور اس لیئے جن کا دور کیا جانا ناممکن دکھائی دیتا ہے) اگر بالکل ہی دور نہ ہو سکیں گے۔ تو کم از کم ایک بہت بڑی حد تک کم تو ضرور ہو جائیں گے۔

اکثر لوگوں نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ ۱۹۱۸ء کے ماہ نومبر اور دسمبر میں ہماری فوجوں کو ہر ایک محاذ پر سخت ناکامیابی رہی ہے۔اور شہنشاہ سے لے کر ادنے ڈویژنل کمانڈر تک کوئی بھی اتنی ہمت و جرات کا اظہار نہیں کر سکا کہ کسی وقت بھی آزادانہ طور پر کوئی ایسا فیصلہ کر سکتا۔جس سے کہ صورت حال کچھ تو بدل جاتی۔یہ ہیبت ناک حقیقت بھی ہمارے طریق تعلیم کی ہی لعنت کا اظہار کرتی ہے۔کیونکہ اس عظیم الشان مصیبت کے وقت ہماری وہ کمزوری نمایاں طور پر ظاہر ہو گئی۔جو دوسری حالتوں اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں ہمیشہ نامعلوم طور پر ہمارے ساتھ رہی ہے۔سامان جنگ کی کسی کمی نے نہیں بلکہ قوت ارادی کی اس کمی نے ہی آج ہمیں اس حالت کو پہنچا دیا۔کہ ہم کہیں بھی مضبوطی اور مستقل مزاجی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکے یہ کمزوری ہماری قوم میں بہت گہرائی تک اثر کر چکی ہے۔اور یہی ہمیں کسی خطرے کے وقت کوئی زبردست فیصلہ کرنے سے روکے رکھتی ہے اور طرح طرح کے اندیشے ہمارے دلوں میں پیدا کرتی رہتی ہے۔شائد ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں۔کہ کسی اہم اور عظیم الشان کام کی سرانجام دہی۔ایسا ہی ایک آسان کھیل ہے۔کہ اس میں کبھی کسی خوف و خطر کا سامنا ہی نہیں کرنا پڑتا۔ہماری طاقت فیصلہ کی اس افسوسناک کمی کے متعلق ہمارا ایک جرمن جرنیل کسی طرح محض اتفاقیہ اور نادانستہ

کرا دیتی ہے کیونکہ ہتک عزت کے جتنے بھی مقدمات عدالت میں آتے ہیں۔ ان میں
ننانویں فیصدی زبان پر قابو نہ رکھنے کے باعث ہی دایر ہوتے ہیں۔ حالانکہ لڑائی
سے کہی ہوئی باتوں کا جواب بھی ویسی ہی لاپروائی سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ اور اس
صورت میں کبھی بھی لڑائی نہیں بڑھ سکتی۔ ہماری قومی تجارت کو بھی اس سے
بہت نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ کارخانہ داروں کے راز لاپروائی سے افشا کر دیئے
جاتے ہیں۔ پھر ملک کی حفاظت کے لئے پوشیدہ طور پر خاموشی کے ساتھ
جو تیاریاں کی جاتی ہیں۔ وہ بھی بات کا بتنگڑ بن کر پھیل جاتی ہیں۔ کیونکہ زبان پر
قابو رکھنا تو لوگوں نے سیکھا ہی نہیں۔ اس لئے وہ ہر وقت بک بک ہی کرتے
رہتے ہیں۔ ایام جنگ میں اس بک بک کی بیماری سے ہی فتح شکست میں
تبدیل ہو کر جنگ کے شرمناک نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ
محسوس کرنا چاہیئے۔ کہ لڑکپن میں جس نیک عادت کو نہ سیکھا جائے۔ بڑے
ہو کر بھی وہ نہیں سیکھی جا سکتی۔

آج کل تو ہمارے سکولوں میں اعلےٰ صفات کو نشوونما دینے کی غرض سے
ارادتاً کوئی کوشش کی ہی نہیں جاتی۔ لیکن اس بارے میں ایک بالکل
ہی نیا طریق اختیار کیا جانا چاہیئے۔

غرضیکہ قابل اعتماد ہونا ہر طرح کی قربانیوں کے لئے آمادہ کمربستہ رہنا
اور اپنی زبان پر قابو رکھنا یہ ایسی صفات ہیں۔ جن کی ہر ایک بڑی قوم کو ہر وقت
ضرورت رہتی ہے اس لئے ہمارے سکولوں میں ان کی تعلیم و تربیت بھی بدرجہا
زیادہ ضروری ہے۔ بہ نسبت دیگر بیشمار فضولیات کے جن سے ہمارے سکولوں
کا نصاب بھرا پڑا ہے اسی طرح ہر قومی لیڈر کو اپنے تعلیمی پروگرام میں کیرکٹر
کے بنانے اور جسم کو نشوونما دینے پر پہلو بہ پہلو مساوی اور پورا پورا زور

عمر کے ۲۶ ویں یا ۲۰ وین سال میں کسی جمنیشیم" (دن کے سرکاری سکول) یا" اولی رئیل سکول" (جدید سکول) سے تعلیم پاکر نکلتا ہے۔ اسے وہاں جو کچھ سکھایا جاتا ہے۔ اس میں سے کیا کیا اس کے کام آتا ہے؟ گذشتہ صفحات میں سرسری طور پر ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہمارے نوجوان طلبا کی ایک تعداد کثیر کے لئے تو وہی نصاب تعلیم بہت کافی ہے۔ جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ بعد میں کسی خاص زبان یا شعبہ علم و ہنر کے مطالعہ کی ضرورت اگر محسوس ہو تو وہ آزادانہ طور پر صرف اسی مضمون کی تعلیم آخری ممکن حد تک حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سب لڑکوں کو جسمانی تربیت اور دیگر مضامین و اوصاف کے متعلق جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہت کافی وقت مل سکیگا۔

تواریخ کی تعلیم کے طریقے میں مضامین کی بھی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اسوقت اس مضمون کی جو بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ ۹۹ فیصدی قابل افسوس ہوتا ہے صرف چند بڑے بڑے آدمیوں یا واقعات کے نام اور ان کی پیدائش وغیرہ کی تاریخوں کے سوا۔ اسمیں سے عموماً اور کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ مختلف واقعات سے بڑے بڑے اہم نتائج اخذ کرنے کا طریقہ تو آج کل بالکل ہی مفقود ہے۔ اور یہی وہ اشد ضروری باتیں ہیں۔ جو کہ نوجوانوں کو سکھلائی جانی چاہئیں۔ مگر آج کل نہیں سکھائی جاتیں بلکہ انہیں قابل طلبا کی اپنی لیاقت و قابلیت کے رحم پر محض اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کہ وہ تاریخوں کے اس جنگل اور واقعات کے اس سیلاب میں سے خود ہی انہیں اخذ کرتے رہیں۔ جو کہ ان میں سے نوے فیصدی کبھی بھی نہیں کر سکتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ علم تاریخ سے حاصل ہونے والے اصلی فوائد سے ہمیشہ محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تواریخ پڑھانے میں ہمیشہ اختصار ہی مد نظر نہ رکھنا

طور پر ایک قدیم یونانی فارمولا معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے یہ کہا ہے کہ میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا۔ جس میں مجھے اکیاون فیصدی کی امید نہ ہو۔ میری رائے میں۔ بس یہ "اکیاون فیصدی" ہی جرمنوں کی المناک اور تباہ کن شکست کی سب سے بڑھ کر ذمہ دار ہے۔

آج کل ہر طرح کی ذمہ داریوں کے نام سے ہمیں جو خوف آتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ اور اس کی تمام ذمہ داری اس تعلیم پر ہے۔ جو ہمارے نوجوانوں کو دی جاتی ہے اور جو ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے میں ایک پرانی بیماری کے طور پر گھر کر گئی ہے اور سب سے بڑھ چڑھ کر ہماری پارلیمنٹری حکومت میں نمایاں ہے۔ اس لئے جیسے کہ ایک قومی حکومت کو قوم کے ہر فرد وبشر کے دل میں ارادے اور فیصلے کی طاقت پیدا کر کے اسے نشوونما دینا چاہیئے۔ بالکل ویسے ہی اسے بچپن کے ابتدائی زمانے سے نوجوانوں کے دلوں میں پورے پورے جوش و مسرت کے ساتھ ذمہ داریوں کا بار اپنے سر پر لینے نیز اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا کھلے دل سے اعتراف کرنے کی ہمت و جرات بھی پیدا کرنی چاہیئے۔

سائینس وغیرہ کی تعلیم۔ جو کہ آج کل سرکاری نصاب کا سب سے بڑا مقصد دکھائی دیتا ہے۔ قومی حکومت کی طرف سے چند تبدیلیوں کے ساتھ بعد میں دی جا سکتی ہے۔ ان تبدیلیوں میں سے سب سے اہم اور سب سے پہلی تبدیلی تو یہ ہے۔ کہ نوجوانوں کے دماغوں پر بہت سے ایسے مضامین کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ جن میں سے نوے فیصدی کی انہیں آئندہ زندگی میں کبھی کوئی ضرورت نہیں پڑتی۔ مثلاً ذرا دیکھئے کہ ایک معمولی سرکاری ملازم جو اپنی

اعلےٰ ترین آدرشوں پر قائم ہو کیونکہ ان کا مطلب یہ ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ کہ ان سے صرف ذاتی طور پر مادی و مالی منفعت حاصل کی جائے۔ بلکہ یہ ہو کہ ہمارے نوجوانوں میں قربانی و ایثار نفسی کی طاقت پیدا ہو کر اس سے خوشی و مسرت حاصل کر سکنے کی قابلیت بھی انہیں حاصل ہو جائے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک تخیل کے طور لفظ "حکومت یا ریاست" (سٹیٹ) کی اس وقت تک کوئی بھی صاف تعریف ہمارے سامنے موجود نہیں آج کل حکومت کے زیر سایہ مقامی حب الوطنی کے سوا اور سبھی کچھ لوگوں کو سکھایا جاتا ہے جرمنی میں تو اس تعلیم کا مطلب کچھ ایسا ہی معلوم دیتا ہے۔ کہ اس سے ان چھوٹے چھوٹے والیان ریاست کی دھندلی سی شان کو چار چاند لگائے جائیں۔ جن کی کثیر التعداد ہی آج ہماری قومی عظمت اور اہمیت کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بن رہی ہے اسی لئے اور محض اسی لئے ہمارے ہموطنوں کو بحیثیت مجموعی جرمن تاریخ کا جو علم ہے وہ نہایت نامکمل و ناقص ہے اور ان حالات میں کسی شخص کے دل میں بھی ملکی و قومی معاملات کے لئے کوئی حقیقی دلچسپی اور سرگرمی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کوئی بھی یہ نہیں جانتا۔ کہ آج کل کے طالبعلموں کے سامنے اپنی قوم کے اصلی مہاں پرشوں کو کس طرح شاندار ویروں کی صورت میں پیش کیا جائے۔ تاکہ دنیا بھر کی توجہ ان پر مرکوز ہو سکے اور ان کی پاک ہستی عوام کے دلوں میں کوئی ٹھوس جذبہ پیدا کر سکے۔

جب سے جرمنی میں انقلاب رونما ہوا ہے۔ شاہ پرستی کا تو بس خاتمہ ہی سمجھیئے اب تو صرف واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے ہی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور موجودہ حکومت کو قوم پرستانہ سرگرمیوں میں کوئی بھی خوبی نظر نہیں آتی۔ اور جو کچھ وہ پسند کرتی ہے۔ وہ یہاں تاقیامت بھی ہوتا ہوا دکھائی نہیں

چاہیئے۔ کیونکہ تاریخ محض واقعات کی واقفیت کے لئے ہی نہیں پڑھائی جاتی بلکہ اس لئے پڑھائی جاتی ہے۔ کہ ان واقعات سے ہم اپنی موجودہ اور آئندہ قومی زندگی کے لئے مناسب سبق بھی حاصل کرسکیں۔ اس لئے زمانہ قدیم کے حالات سے بھی ہمیں پوری پوری واقفیت ہونی چاہیئے۔ اور اس سے بالکل ہی قطع تعلق کسی صورت میں بھی فائدہ مند نہیں ہوگا۔ صحیح طور پر اور مناسب آزاد خیالی کے ساتھ رومن تاریخ کی تعلیم صرف آج کل کے زمانے میں ہی نہیں۔ بلکہ آئندہ بھی ہر زمانے میں ہمارے لئے بہترین تعلیم ہوسکتی ہے۔ اس لئے قومی حکومت کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اس طریق پر "تاریخ عالم" تیار کرائے۔ جس میں نسل کے مسئلہ کو ایک خاص اور نمایاں اہمیت حاصل ہو۔

آج کل ہمارے سکولوں اور خصوصاً مڈل و ہائی سکولوں میں پیشہ ورانہ قابلیت کی طرف جو توجہ دیجاتی ہے۔ وہ اس امر حقیقت سے ہی صاف ظاہر ہے۔ کہ تین طرح کے مختلف سکولوں میں تعلیم پاکر بھی لڑکے ایک ہی پیشے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے شروع میں صرف عام تعلیم پر ہی زیادہ زور دیا جانا چاہیئے اور جنہیں خاص مضامین یا پیشوں میں تعلیم پانے کی ضرورت ہو۔ ان کے لئے بھی آج کل کی مانند معمولی ثانوی سکولوں میں کوئی انتظام کیا جائے۔ ہماری قومی حکومت کو ان خرابیوں کے فوراً دور کرنے میں کوئی پس و پیش ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔

دوسری اہم تبدیلی جس کی ہمارے سکولوں میں سخت ضرورت ہے۔ یہ ہے کہ خاص پیشہ ورانہ یعنی ٹیکنیکل تعلیم کو عام تعلیم سے بالکل ہی جدا کر دیا جائے کیونکہ اس سے تعلیم کا اتنا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ جتنا کہ زر پرستی کا۔ اس لئے ہمیں یہ اصول کبھی نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ صنعتی و حرفتی تعلیم و تجارت بھی اسی وقت پھل پھول کر ملک و قوم کو کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ جبکہ ان کی بنیاد

حب الوطنی اور قوم پرستی سے پرجوش نہ سرگرمیوں میں ہی ان کی تمام طاقت و قوت پوشیدہ ہوگی اور کوئی کسی دوسری قسم کے ہتھیار یا قلعے اس کی حفاظت ہرگز نہ کر سکیں گے۔

اس سلسلے میں تیسری تبدیلی جس کی کہ میں سفارش کرتا ہوں وہ سائنٹفک تعلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ قومی حکومت سائنس کو اپنی قومی عزت و عظمت کی روزافزوں ترقی کا ایک زبردست ذریعہ خیال کریگی۔ اس لئے صرف "تاریخ عالم" ہی نہیں۔ بلکہ "موجودہ تہذیب کی تاریخ" کی تعلیم بھی ہمیں اسی نقطہ خیال سے دینی پڑے گی۔ ہماری نظروں میں ایک موجد صرف اس لئے ہی بڑا اور قابل عزت نہیں ہوگا۔ کہ وہ ایک موجد ہے۔ بلکہ اس کی مقدس ذات پر ہمیں اس وجہ سے اور بھی زیادہ ناز و فخر ہوگا۔ کہ وہ ہمارا ہموطن اور ہم قوم ہے۔ اس لئے ہم تاریخ جرمنی میں سے بزرگ ترین عظیم الشان شخصیتوں کو تلاش کر کر کے انہیں اپنے نوجوانوں کے سامنے قومی مہاپرشوں کی حیثیت سے پیش کرینگے اور انہیں ان کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا سکھلائینگے اور اس طرح ان کے دلوں کو قوم پرستی و حب الوطنی کے پاک جذبات سے اتنا لبریز کر دیں گے۔ کہ وہ ناقابل تسخیر ہو جائیں۔

محض کسی خاص فرقہ و جماعت کا خیال رکھتے ہوئے قوم پرستی جیسی کوئی چیز کسی صورت میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک شخص صرف اسی حالت میں اپنی قومیت پر فخر کر سکتا ہے۔ جب کہ اسے کوئی ایسی جماعت نظر ہی نہ آتی ہو۔ جس پر کہ اسے کسی طرح کی شرمندگی کا احساس پیدا ہو سکے کیونکہ ایک ایسی قوم جس میں سے نصف افراد مصیبت۔ طرح طرح کے تفکرات اور عیوب کا شکار ہوں۔ کب کسی شخص کیلئے باعث فخر ہو سکتی ہے؟ حقیقتاً جب کوئی قوم اپنے جسم و روح وغیرہ کے ہر حصہ و ہر پہلو میں خوب مضبوط و منظم ہو۔ تب ہی اسے دیکھ کر ہمارا دل خوشی

دیتا۔ کیونکہ اس زمانے میں جب کہ دنیا میں قوم پرستی کے اصولوں کا رواج ہے اور جمہوریت کے لئے کچھ زیادہ جوش وخروش دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے لئے یہ امید کرنا کہ کوئی مخالف طاقت اس امر کا زیادہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے گی بالکل بعید از قیاس ہے۔ کیونکہ اس بارے میں کوئی بھی شک وشبہ نہیں ہو سکتا کہ اگر جرمن قوم کا نعرہ جنگ "جمہوری حکومت" ہوتا تو وہ ان ساڑھے چار سال تک ہرگز یوں صبر وتحمل سے کام نہ لیتے اور کبھی کی اپنی جمہوری حکومت قائم کر لیتے۔ یہ جمہوری حکومت باقی دنیا میں بھی اسی لئے ہر دلعزیز ہو سکی ہے۔ کہ ایک کمزور آدمی کو وہی لوگ پسند کیا کرتے ہیں۔ جنہیں کہ اس سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ اس کی بجائے کسی طاقت ور اور مضبوط آدمی کو پسند نہیں کر سکتے۔ اور جمہوری طریق حکومت سے ہمارے دشمنوں کو جو رغبت وہمدردی ہے۔ وہ بھی اس کے خلاف نہایت زبردست نکتہ چینی کا باعث ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہمارے دشمن جرمن جمہوریت کو صرف اس لئے پسند کرتے ہیں اور اس کے جاری رہنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ کہ ہمیں غلام بنانے اور تباہ کرنے کے کام کو درجہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انہیں اس سے بہتر معاون اور کوئی بھی نہیں مل سکتا۔

ورنہ قومی حکومت کے لئے تو یہ لازمی ہوگا۔ کہ وہ اپنی زندگی کے لئے مناسب طور پر جدوجہد کرے۔ کیونکہ موڈر کی تجاویز[۱] اسے اس حفاظتی جدوجہد میں پوری پوری مدد نہ دے سکینگی۔ اس لئے اسے ان تجاویز کو لازمی طور پر نظر انداز کر دینا پڑے گا۔ اسی لئے یہ قومی حکومت اپنی صورت شکل اور طریق واطوار میں جتنی بھی زیادہ مکمل اور مضبوط ہوگی۔ اتنا ہی زیادہ اس کے مخالف اسے ناپسند کریں گے اس صورت میں اس کے شہری ہی اس کے بہترین محافظ ثابت ہونگے اور ان تندرست مردوں اور عورتوں کی جیتی جاگتی قلعہ بندی سے بڑھ کر جن کی

تعلیم میں کسی معمولی شہری کے بچے سے بہتر ثابت نہ ہو سکتا ہو کیونکہ محض گھوٹا بازی سے جو علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ کبھی کسی میں طاقت ایجاد پیدا نہیں کر سکتا اس کا تعلق تو اندرونی ذہانت و قابلیت سے ہوتا ہے۔ مگر آج جرمنی میں اس کی کچھ بھی قدر و قیمت نہیں۔ اس لئے اس پہلو میں بھی سخت احتیاط اور جدوجہد سے کام لینا ہوگا۔ اور اس کی نہایت زبردست ضرورت ثابت کرنی پڑے گی۔

قومی حکومت کے لئے ایک اور بھی اہم تعلیمی کام ہے۔ وہ یہ کہ مختلف ملکی و قومی سوالات کے متعلق فیصلے کا کام عوام کی موجودہ پارٹیوں کے رسوخ اور سرگرمیوں تک محدود نہ رہے۔ بلکہ ملک کے تمام باشندوں میں سے بہترین اور سب سے زیادہ سمجھدار صاحب دماغ لوگوں کو اس طرف کشش کرنے میں پوری پوری کامیابی حاصل کیجائے۔ ہر ایک حکومت کا یہی فرض ہے جسے پورا کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا یہی فرض نہیں۔ کہ وہ ہر معمولی سمجھ بوجھ والے بچے کو قومی سکولوں میں متذکرہ بالا خاص قسم کی تعلیم دے بلکہ اس کا یہ فرض بھی ہے۔ کہ وہ ان کے سامنے اپنی اس تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے مواقع بھی کافی تعداد میں پیش کرے۔ اور اسے اپنا یہ ایک ضروری فرض خیال کرنا چاہیئے۔ کہ ہر جماعت و طبقہ کے بچوں کو ان کی دماغی قابلیت کے مطابق اور کسی تمیز و تخصیص کے بغیر اعلیٰ سرکاری تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے کے لئے پورے پورے موقعے دیئے جائیں۔ اور ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ جرمنی میں دماغی کام کاج کرنے والا طبقہ دیگر عوام سے اتنا الگ ہو گیا ہے۔ کہ بظاہر ان دونوں میں کوئی بھی یگانگت و اتحاد کا رستہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے وہ طبقہ عوام کے جذبات و تخیلات کو بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لئے ہمارے موجودہ مدبر جتنے بھی زیادہ صاحب دماغ ہیں۔ اتنے ہی وہ کوئی

و مسرت سے ناچتا ہوا۔ اسکی ہستی پر اپنے ناز و فخر کا بجا طور سے اظہار کر سکتا ہے۔ ورنہ اس کے حال زار پر افسوس ہی کرنا پڑے گا۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اب سوال صرف یہ ہے۔ کہ ان انقلابات عظیم کا نتیجہ آریہ نسل کی قوموں کے لئے اچھا ہوگا یا یہودیوں کو ہمیشہ کے لئے مالامال کر دے گا۔ اس لئے ایک قومی حکومت کا یہ بھی فرض ہوگا۔ کہ وہ اپنی نسل کو محفوظ رکھتی ہوئی۔ اپنے نوجوانوں کو مناسب تعلیم دے کر اسے ہر پہلو سے اس قابل بنائی جائے۔ کہ وہ اس کرۂ زمین کی مختلف قوموں کے ہر بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم فیصلے کی مناسب طور پر تکمیل کر سکیں۔ اور اس بارے میں جو بھی قوم میدانِ عمل میں سب سے پہلے اپنی قابلیت کا اظہار کریگی۔ فتح کا سہرا بھی اسی کے سر پر بندھے گا۔ اس لئے جسطرح کہ عام تعلیم فوجی ملازمت کے لئے قابلیت کا ایک مناسب معیار سمجھی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح فوجی ملازمت بھی نسلی نقطۂ خیال سے تعلیم کی تکمیل کا واحد معیار تصور کیجانی چاہیئے۔

اگرچہ قومی حکومت میں جسمانی نشو و نما اور دلی و دماغی قابلیت کو بہت اہمیت حاصل ہوگی۔ مگر پھر بھی ان میں سے بہترین و قابل ترین اشخاص کا انتخاب نہایت ہی ضروری ہے لیکن آج اس طرف کچھ بھی توجہ نہیں دیجاتی۔ اور عموماً ان بچوں کو اعلےٰ تعلیم کے لئے موزوں خیال کیا جاتا ہے۔ جو اعلےٰ طبقات کے خوشحال والدین کی اولاد ہوں اور جنہوں نے فارغ البالی سے پرورش پائی ہو۔ حقیقی لیاقت و قابلیت کو اس کے مقابلے میں بالکل ہی ادنےٰ درجہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کا اندازہ بالکل نسبتی طور پر کیا جانا چاہیئے مثلاً ایک معمولی کسان کا لڑکا ایک عالی خاندان صاحبزادے کی نسبت بہت زیادہ لائق و قابل ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر موخرالذکر بر خوردار اپنی تمام وراثتی و پیدائشی سہولیتوں کے باوجود بھی عام

کہ دماغی کام کرنے والے طبقے میں نچلے طبقے سے بھی ہمیشہ نئے سے نئے آدمی داخل ہوتے رہیں۔ اور وہ اس پہلو میں جو انتخاب کرے وہ نہایت دانشمندانہ ہو تاکہ تمام قوم کی انسانی آبادی میں سے بہترین دل و دماغ سرکاری ملازمت میں حصہ لے سکیں۔ اور محض سفارشی ٹٹوؤں کی وراثتی اجارہ داری قائم نہ ہو جائے۔ مگر ہماری موجودہ حالت میں ایسا ہونا ناممکن سے بھی بڑھ کر نظر آتا ہے۔

دنیا میں ہر کام کی قدر و قیمت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک مادی۔ اور دوسری روحانی یعنی اصلی آدرش سے تعلق رکھنے والی۔ مالی قیمت کا اندازہ اس کام کی حقیقی اہمیت اور ضرورت سے لگایا جاتا ہے۔ اور روحانی قیمت کا اس کے تاثرات سے۔ یعنی آدرش کے طور پر تو تمام انسان یکساں ہیں۔ لیکن جب ہر شخص اپنے اپنے حلقہ کار میں اپنے اپنے کام کو حتے الوسع بہترین طریق پر سرانجام دینے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اسی وقت ان میں مساوات پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہر انسان کی قدر و قیمت کا انحصار اس لگن اور سرگرمی پر ہے۔ جس سے کہ وہ اس فرض کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ جو کہ اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ کیونکہ کوشش اور محنت ہی انسانی زندگی کا مقصد نہیں۔ بلکہ یہ تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے ذریعے ہیں۔ اس لئے اپنے آپ کو بہ حیثیت ایک انسان کے زیادہ شریف بناتے رہنے کی کوشش میں ہمیں مصروف رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ممکن ہے۔ جبکہ اس تہذیب میں جس کے ساتھ کہ ہمارا تعلق ہے اس کی پوری پوری گنجائش ہو اور یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ بنیادی طور پر تہذیب میں یہ گنجائش پیدا کرتی رہے۔

لیکن آج کل جس طریق پر کام ہو رہا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ عوام کو عام رائے دہی کا حق دیا جا رہا ہے مساوی حقوق کی باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ لیکن اس کے لئے کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی جاتی۔ ان کی

عملی کام کرنے میں زیادہ کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا جنگ کے متعلق ہماری تیاریوں اور اعلےٰ درجے کے سائنٹفک اسلحہ جات کی بہم رسانی میں کمی کی یہ وجہ نہیں تھی کہ جو دماغ ہماری قوم پر حکومت کر رہے تھے۔ وہ کم تعلیم یافتہ تھے۔ بلکہ اس کا حقیقی باعث یہ تھا کہ وہ اتنے زیادہ پڑھ لکھ گئے تھے کہ وہ عملی کام کرنے کے لئے کافی ہمت اور سرگرمی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ ہمیں اپنی قومی زندگی کے لئے ایک ایسے شخص کی ماتحتی میں جنگ کرنا پڑا۔ جو کہ ایک کمزوردل فلاسفر تھا۔ اگر بیتھ مین ہال وگ (BETH MANN HOLLWIG) کی بجائے کوئی اور مضبوط دل گردے والا انسان ہمارا رہنما ہوتا تو پرائیویٹ (PRIVATE) گرینے ڈیر کی بہادرانہ اور جانبازانہ قربانی ہرگز اس طرح اکارت نہ جاتی۔ ماسوائے اس کے جن لوگوں میں سے ہمارے فوجی افسر منتخب کئے جاتے تھے۔ ان کی جھوٹی ڈیفنی اور فوں فاں نے ہی ان بدمعاشوں کے لئے جنہوں نے ماہ نومبر میں انقلاب کی آگ بھڑکائی تھی۔ بہترین معاون و مددگار پیدا کر دیئے انہوں نے ہی نہایت شرمناک طریق پر قومی بہتری و بہبودی کے اس کام کا گلا گھونٹ دیا۔ جو کہ ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ اور ایسے حالات پیدا کر دیئے۔ جن سے ہمارے دشمنوں کی فتح یقینی ہو گئی۔

اس پہلو میں رومن کیتھولک چرچ نے ایک ایسی نظیر قائم کی ہے۔ جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے پادریوں کو مجرد بر ہمچریہ کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان پادریوں کی کوئی اولاد نہ ہونے کے باعث اس کے آئندہ پرچارک عوام میں سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اور یہی اس فرقہ کی زبردست کامیابی کا بنیادی باعث ہے۔ جس سے کہ اکثر اصحاب ناواقف ہیں۔ اس لئے ایک قومی حکومت کا ضروری فرض ہوگا۔

کے اپنی زندگی باعزت طور پہ اور امن وامان سے بسر کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

یہ کہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ یہ متذکرہ بالا آدرش محض خیالی و قیاسی ہے۔ جو عملی طور پر کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ ہم بھی اتنے بیوقوف نہیں۔ جو یہ سمجھ بیٹھے ہوں۔ کہ ایک کامل طور پر بے عیب زمانہ کبھی پوری پوری کامیابی کے ساتھ رونما ہو سکتا ہے۔

لیکن اس سے ہماری یہ ذمہ داری کسی طرح بھی ٹل نہیں سکتی۔ کہ اپنے اعلےٰ آدرش کو حاصل کرنے کے لئے ہم اپنی موجودہ کمزوریوں کو دور کرنے کی جدوجہد میں شب وروز مصروف رہیں۔ اور کبھی ہمت نہ ہاریں۔ اس لئے ہر شخص کو اپنے اس آخری مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے رہنا چاہیئے اور ناکامیابیوں سے گھبرا کر ہرگز اپنے مقصد سے منہ نہ موڑ لینا چاہیئے۔ نہ کسی شخص کو کسی پہلو سے ایک اعلےٰ آدرش کی طاقت کو کم خیال کرنے کی غلطی کا مرتکب ہونا چاہیئے۔ ورنہ اسکے لئے دنیا میں ترقی اور بہبودی کی کوئی امید باقی نہ رہ جائیگی۔ اور مایوسی ہمیشہ کیلئے اسے آدبائیگی۔

نظروں میں مالی معاوضہ ہی ایک انسان کی اصلی قیمت کے اظہار کا واحد ذریعہ ہے۔ اور
اس طرح وہ شریفانہ ترین مساوات کی۔ جو کہ ممکن ہو سکتی ہے۔ بنیادوں کو ہی کھوکھلا
کرتے جاتے ہیں۔ کیونکہ مساوات کی بنیاد کسی انسان کی قابلیت پر نہ کبھی قائم ہوئی
ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس کا حاصل ہونا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ
ہر شخص اپنے خاص فرائض منصبی کو پوری تن دہی اور دیانتداری سے سر انجام
دینے لگے۔ اسی اور صرف اسی وقت قدرت کے ان موقعوں کو نظر انداز کیا جا سکتا
ہے جنہیں ایک شخص کی قدر و قیمت کا اندازہ لگتا ہے۔ اور ہر شخص اپنی وقعت خود
پیدا کرتا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے۔ کہ آج کل کے زمانے میں سونا ہی زندگی کی ایک نہایت
زبردست طاقت بن گیا ہو۔ لیکن وہ دن بھی آنے والا ہے۔ جبکہ انسانوں کو
اس سے بھی زیادہ زبردست اور بلند پایہ دیوتاؤں کے سامنے اپنا سر عقیدت
کے ساتھ جھکانا پڑے گا۔ آج کل جو کچھ بھی موجود ہے۔ اس میں سے اکثریت کی
ہستی کا انحصار دولت اور جائداد کی خواہش پر ہے۔ لیکن اس میں وہ اقلیت بھی
ضرور شامل ہے۔ جس کی عدم موجودگی انسانیت کو اتنا ہی مفلس اور کمزور بنا
دے گی۔ اس لئے ہماری تحریک کا ایک کام یہ بھی ہے۔ کہ عوام کے دلوں میں
اس زمانہ کی آمد آمد کا یقین پیدا کیا جائے۔ جبکہ ہر شخص کو اس کی زندگی کی
تمام ضروریات حاصل ہونگی۔ لیکن ساتھ ہی اس کے اس اصول کو بھی قائم
رکھا جائے۔ کہ انسان صرف مادی خوشیوں اور مسرتوں کے لئے ہی زندہ
نہیں رہتا۔ اور اس کا اظہار مختلف انسانوں کی کمائیوں کی دانشمند اور درجہ
درجہ بندی سے ہی ممکن ہوگا۔ جس کی بدولت ہر ایک ایماندار کارکن کو یہ
یقین ہو سکیگا۔ کہ کبھی دن وہ بھی بہ حیثیت ایک انسان اور ایک شہری

ہی کمزور سی کوشش شروع ہو گئی ہے۔ اس سے میرا مطلب ہماری موجودہ "جرمن جمہوریت" سے ہرگز نہیں جو اپنے آپ کو ایک "نمونے کی حکومت" ظاہر کرتی کبھی نہیں تھکتی بلکہ امریکہ کی "ریاستہائے متحدہ" سے ہے۔ جہاں کہ وہ بہرحال اس بارے میں کسی قدر معمولی سمجھ بوجھ سے کام لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یعنی اب وہ کسی ایسے عنصر کو ملک میں داخل ہونے سے روک دیتے ہیں۔ جو صحت اور تندرستی کے نقطۂ خیال سے پسندیدہ نہ سمجھا جاتا ہو۔ اور چند خاص نسلوں کے لوگوں کو وطنیت کے حقوق دینے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ غرضیکہ اس طرح انہوں نے اس پہلو میں ایک نہایت ہی ہلکی سی ابتدا کر دی ہے۔ جو کسی قومی ریاست یا حکومت کے تخیل سے کسی طرح بھی غیر متشابہ نہیں ہو سکتی۔

کیونکہ ہر قومی ریاست کو اپنے باشندوں کو تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہیئے ریاستی شہری۔ ریاستی رعیت اور پردیسی۔ اصولی طور پر پیدائش کسی بچے کو صرف "ریاستی رعیت" ہونے کا حق عطا کر سکتی ہے نہ کہ یہ حق بھی کہ وہ ایک سرکاری افسر کے طور پر حکومت میں بھی حصہ لے سکے۔ یا انتخابات میں اپنی رائے کا اظہار کر کے سرگرم سیاسیات میں بھی شریک ہو سکے۔ ہر ایک ریاستی رعیت کے لئے "شہری" بننے سے پہلے اپنی نسل و قوم کا بھی ثبوت پیش کرنا ضروری ہے ہر ایک "رعیت" اس بارے میں آزاد ہے کہ جب وہ چاہے رعیت نہ رہے اور جس ملک کی قومیت کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ وہاں جا کر وہاں کا شہری بن جائے۔ اس طرح ایک "پردیسی" اور "رعیت" میں صرف یہ فرق ہے۔ کہ "پردیسی" کسی غیر ملک یا ریاست کی "رعیت" ہوتا ہے۔ اور اس ملک میں اس کا قیام محض عارضی سمجھا جاتا ہے۔

جرمن قوم کی ایک نوجوان "رعیت" کے لئے یہ ضروری ہو گا۔ کہ وہ سکول

۲

شہری اور رعایا

آج جس سنستھا کو غلطی سے حکومت یا ریاست (STATE) کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ صرف دو طرح کے آدمیوں کو جانتی ہے۔ ایک "شہری یا دیسی" اور دوسرے "پردیسی" شہری یا دیسی وہ لوگ ہیں جو اپنی پیدائش یا وطنیت کے لحاظ سے اس ملک کی شہریت کے حقوق سے بہرہ اندوز ہیں اور پردیسی وہ لوگ جنہیں کسی دیسی ہی دوسری حکومت کے ماتحت وہی حقوق حاصل ہیں۔ آج کل یہ حقوق سب سے پہلے تو اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔ کہ کوئی بچہ اس حکومت یا ریاست کی حدود میں پیدا ہو جائے۔ پھر اس کی نسل یا قومیت کا کوئی بھی سوال نہ اٹھیگا۔ اس طرح ایک حبشی کا بچہ بھی جو کبھی جرمنی کے کسی علاقہ محروسہ میں رہ چکا ہو۔ اور آج کل جرمنی میں اپنی بود و باش رکھتا ہو۔ خود بخود جرمن حکومت کا ایک شہری بن جاتا ہے۔ غرضیکہ یہ شہریت کا حق حاصل کرنے کا طریق عمل اس سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ جو مثلاً موٹر بازوں کی ایک کلب کا ممبر بننے میں اختیار کیا جاتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ناظرین کے لئے یہ ایک ناپسندیدہ سی بات ہو گی۔ لیکن تو وشنو چنے تو سہی کہ کیا اس سے بڑھ کر بیہودہ اور زیادہ بے سمجھی کی بات کیا کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ہمارا موجودہ قانون شہریت ہے۔ لیکن کم از کم ایک ریاست ایسی ہے۔ جس میں اس پہلو میں کچھ بہتر انتظام کئے جانے کی نہائیت

(۴) ایک قومی ریاست کا تخیل اور شخصیت

یہ ایک سخت حماقت ہو گی اگر ہم یہ امید رکھیں۔ کہ ایک شخص کی قابلیت کا اندازہ اس کی نسل کی بنا پر لگا کر ساتھ ہی اس کے "مارکس ازم" کے اس اصول کے ساتھ جنگ کا اعلان بھی کر دیا جائے۔ کہ "ایک انسان ویسا ہی اچھا ہے جیسا کہ کوئی دوسرا۔ تاوقتیکہ ہم اس جنگ کے آخری نتائج بھی برداشت کرنے کے لئے پوری طرح تیار نہ ہو جائیں۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ قوم پرست سوشلسٹ حکومت اپنی اقتصادی زندگی کی بہتر تعمیر اور خالص مشینی ذرائع سے دوسری حکومتوں کی نسبت کچھ بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ یعنی امیروں اور غریبوں کے درمیان کسی قدر بہتر سمجھوتہ کرا سکتی ہے۔ یا ملک کے اقتصادی ذرائع پر وسیع قومی نگرانی قائم کر کے مزدوروں کو ان کی خدمت کا زیادہ مناسب و منصفانہ معاوضہ دلا سکتی ہے یعنی مزدوروں منتظموں اور مالکوں کے حق الخدمت کی شرح میں اس وقت جو زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسے بہت کچھ کم کر سکتی ہے اسے دنیا کے موجودہ نقطہ خیال کا کچھ بھی علم یا اندازہ نہیں۔ وہ جلد ہی اپنے آپ کو ایک عجیب پریشان کن اور گومگو کی سی حالت میں پائے گا۔ کیونکہ متذکرہ بالا طریق ہائے کار کے متعلق یہ امید کبھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ مستقل ثابت ہوں گے۔ یا آئندہ کے لئے کچھ زیادہ امید افزا رہ سکیں گے۔ جو قوم ایسی سطحی اصلاحات پر بھروسہ رکھتی ہے۔ وہ مختلف اقوام کی کسی

میں وہی تعلیم حاصل کرے جو ایک جرمن نوجوان کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ بعد ازاں اسے وہی جسمانی تربیت بھی حاصل کرنی پڑے گی۔ اور بالآخر فوج میں بھی داخل ہونا ہوگا۔ کیونکہ فوجی تعلیم ضروری ہے۔ فوجی تعلیم ختم ہو جانے کے بعد وہ تندرست نوجوان اگر اس کا اعمالنامہ (ریکارڈ) بالکل صاف ہوا۔ تو باضابطہ طور پر شہریت کے حقوق حاصل کرسکتا ہے۔ اور اس صفحۂ زمین پہ اس کی زندگی کے لئے یہ ایک سب سے زیادہ ضروری اور بیش قیمت سند ہوگی۔ چنانچہ اگر کوئی سڑک صاف کرنے والا معمولی مہتر بھی ہماری "ریش" کی "شہریت کا حق" حاصل کر چکا ہے۔ تو اس کی عزت ہماری نظروں میں ایک "پردیسی" بادشاہ سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے اسی طرح ایک کنواری جرمن لڑکی کی بھی "ریاستی رعیت" ہے۔ مگر شادی ہوتے ہی وہ "شہری" ہو جائے گی۔ لیکن اگر ایک جرمن خاتون کوئی کاروبار کرنے لگے۔ تو اسے کنواری رہتے ہوئے بھی شہریت کے حقوق مل سکیں گے۔

(۴)

ایک قومی ریاست کا تخیل اور شخصیت

یہ ایک سخت حماقت ہوگی اگر ہم یہ امید رکھیں۔ کہ ایک شخص کی قابلیت کا اندازہ اس کی نسل کی بنا پر لگا کر ساتھ ہی اس کے "مارکس ازم" کے اس اصول کے ساتھ جنگ کا اعلان بھی کر دیا جائے۔ کہ ایک انسان ویسا ہی اچھا ہے جیسا کہ کوئی دوسرا۔ تاوقتیکہ ہم اس جنگ کے آخری نتائج بھی برداشت کرنے کے لئے پوری طرح تیار نہ ہو جائیں۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ قوم پرست سوشلسٹ حکومت اپنی اقتصادی زندگی کی بہتر تعمیر اور خالص مشینی ذرائع سے دوسری حکومتوں کی نسبت کچھ بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ یعنی امیروں اور غریبوں کے درمیان کسی قدر بہتر سمجھوتہ کرا سکتی ہے۔ یا ملک کے اقتصادی ذرائع پر وسیع قومی نگرانی قائم کر کے مزدوروں کو ان کی خدمت کا زیادہ مناسب و منصفانہ معاوضہ دلا سکتی ہے یعنی مزدوروں منتظموں اور مالکوں کے حق الخدمت کی شرح میں اس وقت جو زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسے بہت کچھ کم کر سکتی ہے اسے دنیا کے موجودہ نقطۂ خیال کا کچھ بھی علم یا اندازہ نہیں۔ وہ جلد ہی اپنے آپ کو ایک عجیب پریشان کن اور گومگو کی سی حالت میں پائے گا۔ کیونکہ مندرجہ بالا طریق ہائے کار کے متعلق یہ امید کبھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ مستقل ثابت ہوں گے۔ یا آئندہ کے لئے کچھ زیادہ امید افزا رہ سکیں گے۔ جو قوم ایسی سطحی اصلاحات پر بھروسہ رکھتی ہے۔ وہ مختلف اقوام کی کسی

میں وہی تعلیم حاصل کرے جو ایک جرمن نوجوان کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ بعد ازاں اسے وہی جسمانی تربیت بھی حاصل کرنی پڑے گی۔ اور بالآخر فوج میں بھی داخل ہونا ہوگا۔ کیونکہ فوجی تعلیم ضروری ہے۔ فوجی تعلیم ختم ہو جانے کے بعد وہ تندرست نوجوان اگر اس کا اعمالنامہ (ریکارڈ) بالکل صاف ہؤا۔ تو باضابطہ طور پر شہریت کے حقوق حاصل کرسکتا ہے۔ اور اس صفحۂ زمین پر اس کی زندگی کے لئے یہ ایک سب سے زیادہ ضروری اور بیش قیمت سند ہوگی۔ چنانچہ اگر کوئی سڑک صاف کرنے والا معمولی مہتر بھی ہماری "ریش" کی "شہریت کا حق" حاصل کرچکا ہے۔ تو اس کی عزت ہماری نظروں میں ایک "پردیسی" بادشاہ سے بھی زیادہ ہونی چاہیئے اسی طرح ایک کنواری جرمن لڑکی کی بھی "ریاستی رعیت" ہے۔ مگر شادی ہوتے ہی وہ "شہری" ہو جائے گی۔ لیکن اگر ایک جرمن خاتون کوئی کاروبار کرنے لگے۔ تو اسے کنواری رہتے ہوئے بھی شہریت کے حقوق مل سکیں گے۔

پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور صرف " انسانی عقل و دماغ کا کرشمہ " ہی کہلا سکتی ہیں ان کی بدولت ہی اس انسان میں جس نے اپنی ان طاقتوں کو نشو و نما دیگر۔ ان کا مناسب طور پر اظہار کیا۔ اپنے دوسرے ساتھیوں سے اوپر ہی اوپر اٹھنے کی طاقت پیدا ہوتی چلی گئی ہے۔

اسی طرح صرف اصول (تھیوری) قائم کر کے اسے اتنی نشو و نما دینا بھی انسانی شخصیت کا ہی کام ہے۔ جس کا صحیح صحیح اندازہ لگانا طاقت تخیل کی دسترس سے بھی باہر ہے۔ کیونکہ بعد میں ان اصولوں کی مدد سے انسان کی تعمیری طاقتیں مضبوط ہو کر مختلف ایجادات کرسکنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ عوام میں سے ایک تعداد کثیر نہ تو ایجادات ہی کرسکتی ہے۔ اور نہ سوچ ہی سکتی ہے۔ کہ اکثریت کو کس طرح تنظیم دے کر ان سے کام لیا جائے؟ یہ سب کام خاص خاص انسانوں کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر ان میں بھی ہمیشہ ایک خاص شخصیت ہی سب سے افضل و برتر ثابت ہو کر سب کی رہنمائی کا بار اپنے سر پر لے لیتی ہے۔

اس طرح ایک انسانی جماعت صرف اسی حالت میں " اچھی تنظیم یافتہ " کہلا سکتی ہے۔ جبکہ وہ ان تعمیری طاقتوں کے کام کو ہر پہلو سے سوسائٹی کے لئے مفید و منفعت بخش بنا سکے۔ اور انہیں فضول ہی ضائع نہ ہوتے رہنے دے۔ غرضیکہ ہر ایک تنظیم ان کوششوں کا مجسمہ و مظہر ہونی چاہیئے۔ جن سے قوم کے دماغوں کو عوام کا رہنما و رہبر بنایا جا رہا ہے۔ اور اکثریت کو ان دانشمند دماغوں کی پیروی فرمانبرداری سکھلائی جا رہی ہے یہ تنظیم عوام میں سے عالی دماغ اشخاص کے نمایاں ظہور میں نہ صرف کوئی رکاوٹ ہی نہیں ڈالتی۔ بلکہ اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی کر کے انہیں ہر ایک سہولت بہم پہنچاتی ہے۔ جس سے قوم کی طاقت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور پھر زندگی کی روز افزوں جدوجہد خود بخود ہی ان دماغوں کو آئے دن اپنی اپنی

عام کشاکشی" میں کبھی کوئی شاندار فتح حاصل کرنے کا دعوےٰ نہیں کرسکتی۔ جس تحریک کی بنیاد ہی سمجھوتوں پر ہو وہ کب کوئی ایسی عظیم الشان اصلاح کرنے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ جس کے نتائج دور رس اور انقلاب انگیز ہوں کیونکہ اس کی کوئی بھی کوشش بالائی سطح سے نیچے بہت گہرے حصوں کو متاثر نہیں کرسکتی۔

پہلا قدم جو انسانوں کو حیوانات کی دنیا سے نمایاں طور پر الگ کرتا ہے ' وہی ہے جو انسانوں کو ایجادات کی طرف لے جاتا ہے۔ کیونکہ اس تمام جدوجہد میں اس عام عقل وفہم کا پہلا اظہار بلاشک وشبہ اس صورت میں ہوتا ہے۔ کہ وہ ان مخلوقات کی خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا مناسب انتظام کرسکے جن میں اس کے لئے کام کرنے کی کوئی خاص قابلیت موجود ہو۔ اس حالت میں صرف وہی شخصیت کچھ نمایاں عظمت واہمیت حاصل کرسکے گی۔ جس کی کامیابیاں اور فیصلے کسی پہلو میں دوسرے لوگوں کے لئے قابل تسلیم ثابت ہوسکیں گے۔ اپنی طاقت وقوت کے متعلق ایک آدمی کا اپنا اندازہ درحقیقت اس کے دماغی استقلال پر منحصر ہوتا ہے۔ پھر ہزار سال کے بعد عام دنیا اسے محض ایک قدرتی فعل یا عمل سمجھنے لگتی ہے اور میں اسے ہی تمام جنگی مصلحتوں اور فوجی چالوں کی بنیاد خیال کرتا ہوں۔

اس پہلی تحقیقات کے بعد دوسری اہم تحقیقات انسان نے یہ کی ہے کہ اور بہت سی باتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ بھی جان لیا۔ کہ زندگی کی اس جدوجہد میں مصروف رہتے ہوئے بھی خوشی اور اطمینان سے زندگی کیسے بسر کی جانی چاہیئے؟ وہ اس طرح اس نے اپنی طاقت ایجاد اور ان مختلف سرگرمیوں کا اظہار کیا ہے! جو آج دنیا میں چاروں طرف

انقلابات صرف ایک تحریک کے ذریعے ہی رونما ہوتے رہے ہیں۔ اور آئندہ بھی صرف اسی طرح ہو سکتے ہیں۔ جس کی بنیاد ایک ایسے زبردست تخیل کی سپرٹ پر ہو۔ جو آئندہ حکومت کا جنم داتا کہلا سکے۔

اس لئے نیشنل سوشلسٹ تحریک کو بھی آج اپنے آپ کو اس تخیل کا علم بردار ثابت کرنا چاہیئے۔ اور اپنی موجودہ تنظیم کی مدد سے اسے دنیا کے سامنے عملی صورت میں پیش کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ حکومت کو صرف صحیح راستے پر ہی نہ چلا سکے بلکہ اگر ضرورت ہو تو اس حکومت کی بجائے ایک دوسری بہتر و مکمل حکومت قائم کرنے کے بھی ہر وقت قابل ہو سکے۔

جائیں۔ جو کہ کسی قدیم زمانے میں تھے۔ ایک قومی حکومت کو ہرگز بھی یہ برداشت نہ کرنا چاہیئے۔ کہ جن لوگوں نے نہ تو کوئی خاص تعلیم ہی حاصل کی ہے۔ اور نہ جنہیں کوئی پیشہ ورانہ تجربہ ہی حاصل ہے انہیں ایسے امور کا فیصلہ کرنے کے لئے جج بننے کی دعوت دیجائے۔ جن کا تعلق خاص علوم و فنون مثلاً اقتصادیات وغیرہ سے ہو۔ اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ وہ اپنی نمائندہ جماعت کو خواہ وہ مختلف پیشوں اور تجارتوں کے نمائندوں کی بھی ہو۔ نیز ان دونوں سے مفید مطلب تعاون حاصل کرنے کے لئے ایک مستقل و منتخب سینٹ قائم کیا جائے لیکن اس سینٹ یا چیمبر کو فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہ ہو۔ وہ صرف فیصلہ شدہ تجاویز پر عملدرآمد کرانے کے لئے ہی بنایا جائے۔ نہ کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لئے۔ یہ اختیار تو صرف اس زمانے کے صدر حکومت کو ہی حاصل ہو۔ اور اس کے سوا کسی کو نہیں۔

اس علم کو عملی جامہ پہنانے کے امکان کے متعلق بھی میں ناظرین کو صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ کہ پارلیمنٹ طریق کی مطابقت میں بھی اکثریت کے فیصلے نے ہمیشہ ہی نوع انسان کی رہنمائی نہیں کی۔ بلکہ برعکس اسکے کہ انسانی تواریخ کے بہت ہی محدود سے قلیل زمانوں میں یہ اکثریت اور اس کے فیصلے نمودار ہوئے ہیں اور وہ بھی ہمیشہ اس وقت جبکہ قومیں اپنی عظمت و رفعت کے درجے سے گر کر زوال کو پہنچ گئیں۔

بہرحال کسی شخص کو بھی یہ ہرگز نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسے انقلابات صرف ان اصولی مسائل سے ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ جن کا فیصلہ کوئی طاقت بالادست کرے۔ کیونکہ منطقی طور پر یہ اصولی مسائل کسی حکومت کے آئین پر ہی اثر انداز ہو کر ختم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ تمام قوانین اور اس سے بھی بڑھ کر شہریوں کی زندگیوں پر بھی اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ کیونکہ ایسے

اس کے زیر اثر ہے اس کے لئے سوائے اس کے کوئی بھی چارہ نہیں رہتا کہ وہ صرف یہودی مفاد کی حفاظت کی غرض سے جنگ کرے۔ اور آرین اقوام کی خصوصیات سے کوئی بھی مشترکہ تعلق نہ رکھے۔

اس لئے اگر قومی حکومت قائم کرنے کے آدرش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے درحقیقت کوئی کوشش کرنی ہی ہے۔ تو ہمیں ان تمام طاقتوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا پڑے گا۔ جو اس وقت پبلک زندگی پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اور ان کے مقابلے کے لئے ایسی دوسری طاقتوں کو تلاش کرنا ہو گا۔ جو اس آدرش کو حاصل کرنے کے لئے مصمم ارادہ کر چکی ہوں اور ہر طرح کی جدوجہد سے اپنے اس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ کیونکہ ہمارے سامنے ایک نہایت زبردست کشمکش آنے والی ہے۔ اور درحقیقت ہمارا پہلا کام حکومت و ریاست کے متعلق کسی نئے تخیل کو پیدا کرنا نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ سب سے پہلے پرانے یہودی تخیل کو مٹا کر آئندہ۔ نئے تخیل کے لئے میدان صاف کیا جائے اور اس نئے تخیل کے پرچار کے لئے۔ جو نہایت زبردست اور مضبوط نئے اصولوں پر قائم ہو پہلا ہتھیار جو ہمیں استعمال کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ پرانے تخیل پر نہایت سخت و زبردست نکتہ چینیوں کی بوچھاڑ جاری رکھی جائے۔ خواہ لوگ اس بوچھاڑ کو کتنا بھی ناپسند کیوں نہ کریں۔

کیونکہ مارکس ازم کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہودیوں کی اس تعمیری اولوالعزمی سے پوری طرح واقف بھی ہے۔ خواہ ابھی یہ صرف اس خواہش تک ہی کیوں نہ محدود ہو۔ کہ یہودیوں کے عالمگیر سرمایہ کی بنیاد پر ایک مطلق العنان طاقت قائم کیجائے۔ لیکن بایں ہمہ وہ پورے سات سال تک نہایت ہی سخت اور تباہ کن نکتہ چینیوں کا مقابلہ کرتا

(۵)

عالمگیر اصول اور تنظیم

ایک ایسی قومی حکومت۔ جس کا خاکہ میں نے اوراق گذشتہ میں ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی کچھ کوشش کی ہے۔ صرف یہ جاننے سے ہی معرض ہستی میں نہ آسکے گی کہ اس کے لئے کیا کیا باتیں اشد ضروری ہیں؟ اور نہ صرف یہ جاننا ہی اس کے لئے کافی ہوگا۔ کہ ایسی قومی حکومت کی شکل وصورت کیسی ہونی چاہیئے؟ بلکہ اس کی پیدائش کا سوال ان سب باتوں سے بہت زیادہ ضروری ہے۔ ہم اس کے لئے اس وقت تک انتظار نہیں کرسکتے جبتک کہ وہ تمام موجودہ پارٹیاں۔ جو اس وقت حکومت سے۔ جیسی کہ وہ بری بھلی ہے۔ فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ از خود رضاکارانہ طور پر اپنے طور وطریق میں مناسب تبدیلی نہ کریں۔ یہ تو صریحاً وقطعی غیر ممکن ہے۔ کیونکہ ان سب پارٹیوں کے اصلی رہنما تو یہودی ہی یہودی ہیں اور ہر ایک یہودی ان لاکھوں بلکہ کروڑوں جرمن سرمایہ داروں اور عوام کے ساتھ جن کا ان کے ساتھ تعلق ہے۔ اور جو محض اپنی سستی۔ حماقت اور بزدلی کے باعث تباہ ہو رہے ہیں۔ اپنے ہر فعل وعمل میں ہمیشہ اپنے ہی مقصد کو اٹل طور پر پیش نظر رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے ہر پہلو سے پورا پورا واقف ہے۔ اس طرح جو پارٹی

میں عالمگیر اصول کی کوئی نہ کوئی رمق موجود ہوتی ہے۔ جو انہیں اس طرح اکساتی اور ابھارتی رہتی ہے۔ لیکن ان کے پروگرام کی کمزوری ان کی تمام بہادری اور ہمت و حوصلے کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ حالانکہ اس جرات۔ ہمت اور حوصلے کی ہی ایک عالمگیر پروگرام کی تکمیل کے لئے نہایت سخت ضرورت ہوتی ہے۔ مگر سمجھوتے کے لئے ہمیشہ تیار رہنے کے باعث کمزور اور بے ہمت اشخاص ان پارٹیوں کی طرف کھچ کر ان کے اردگرد جمع ہوتے جاتے ہیں۔ جن کے بل بوتے پر کبھی کوئی زبردست کام نہیں ہو سکتا۔ اس طرح وہ پارٹیاں ہمیشہ اپنی تاریخ پیدائش سے ہی افسوسناک کمزوری اور بیگیانہ کس مپرسی کی حالت میں وہاں کی وہاں رہ جاتی ہیں اور کبھی کوئی نمایاں ترقی نہیں کر سکتیں۔

مگر ایک عالمگیر تھیوری (THEORY) اپنے تمام زبردست تخیل کے باوجود بھی اس وقت تک فتحمند نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ وہ اپنے پیروؤں میں زمانہ نیز قوم و ملک کے بہادر ترین اور مضبوط ترین عناصر کو جمع کر کے انہیں ایک نہایت ہی زبردست اور ٹھوس جنگ آزما جتھے کے طور پر تنظیم نہ دے سکے۔ لہذا اس کے لئے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ واقعات عالم کی عام تصویر میں سے چند خاص تخیلات کو اخذ کر کے انہیں ایک ایسی پسندیدہ اور عجیب و غریب و دلکش صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا جائے کہ وہ انسانوں کی اس نئی جماعت کے دل پسند عقاید کے طور پر ہر دلعزیزی حاصل کر سکیں لیکن برعکس اس کے ایک ایسی پارٹی کا پروگرام جو کہ محض سیاسی ہے۔ صرف وقتی ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد آئندہ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر عالمگیر اصول دنیا بھر کی موجودہ صورت حالات یعنی عوام کے تسلیم کردہ تخیل زندگی کے خلاف ایک ایسا زبردست

رہا ہے۔ اور آخر اس نے پہلو بچا کر اپنے نام نہاد "تعمیری کام" کو شروع کر دیا ہے۔ اس کا یہ کام بالکل صحیح۔ قدرتی اور منطق پر مبنی رہا ہے۔ کیونکہ ایک عالمگیر اصول لازمی طور پر غیر متحمل ہوتا ہے۔ اور یہ کبھی گوارہ نہیں کر سکتا کہ اسے بھی بہت سی پارٹیوں میں سے ایک پارٹی سمجھ لیا جائے۔ وہ تو ہمیشہ اس امر پر اصرار کرتا ہے۔ کہ باقی سب پارٹیاں اس کی اہمیت اور عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کر کے میدان مقابلہ سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اور دنیا اس نئے اصول کے سانچے میں ہی اپنی پبلک زندگی کو ڈھال لے۔ اس لئے وہ ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ کسی صورت میں بھی کوئی ایسی طاقت قائم رہے۔ جو پرانے خیال کی کسی طرح نمائندگی کرتی ہو۔

مذہب کی دنیا میں بھی بالکل ایسی ہی حالت ہے۔ جیسی کہ سیاسیات میں! مثلاً عیسائیت صرف اپنا ہی منبر تیار کرنے پر مطمئن نہیں رہی۔ بلکہ اس نے اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے تمام پیشتروؤں کا فروں (بیدین) کے منبروں کو بھی تباہ و برباد کر ڈالا۔ اور اس مجنونانہ ورم تحمل کی بدولت ہی اس کی بنیادیں ایسی مضبوط اور عقاید ایسے پختہ ہو گئے۔ اور یہی اس کی ہستی کے لئے ایک لازمی اور نہایت ضروری شرط تھی۔

مختلف سیاسی پارٹیاں تو سمجھوتے کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ لیکن عالمگیر اصول اس کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ سیاسی پارٹیاں اپنے مخالفوں کے ساتھ سودے ہی کر سکتی ہیں۔ لیکن عالمگیر اصول ہمیشہ ہی اعلان کرتے ہیں کہ ہم ناقابل تسخیر ہیں۔ اگرچہ سیاسی پارٹیاں بھی تقریباً ہمیشہ ہی یہ امیدیں لے کر میدان عمل میں آتی ہیں کہ ہم ایک نہ ایک دن مطلق العنان اختیارات حاصل کر کے ہی رہینگی اور ان میں تقریباً ہر حالت

ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ہی قومی تخیل کو نشو و نما دینے کی غرض سے۔ نئی تحریک کے
پروگرام کے لئے چند ایسے معنی خیز فقرات تجویز کر لئے گئے تھے۔ جو عوام کے لئے ایک
خاص اور غیر معمولی کشش کا باعث ہو سکیں۔ ان کی تعداد کل ۲۵ تھی اور ان
کا سب سے پہلا مقصد یہ تھا کہ ایک معمولی سے معمولی سمجھ بوجھ کے آدمی کی نظروں
میں بھی اس نئی تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد کی صحیح تصویر کھینچ جائے۔
جس سے اسے اس کے سمجھنے بوجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ ساتھ ہی اس کے
یہ پروگرام ہی ایک خاص حد تک ہم سب کے سیاسی عقاید کا اعلان تصور
کیا جائے۔ تاکہ سب ممبروں کے سامنے ایک مشترکہ و متفقہ مقصد آ جو
جائے اور وہ سب کے سب ان کی تکمیل کے لئے دلی اتفاق و اتحاد سے
کام کر سکیں اور ان کی صادقانہ کوششوں سے پارٹی کی طاقت بھی روز بروز
مضبوط ہوتی جائے۔

مجھے یقین ہے کہ پہلے ایک ایسے مسئلہ کا سرسری طور پر اعلان کر دینے
کے بعد جو اصلی حقایق کے عین مطابق نہ ہوتا ہوا بھی اصولاً صحیح ہو کسی
ایک خیال پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا کم نقصان دہ ہے۔ بہ نسبت اس
کے کہ اصل تحریک کے کسی بنیادی قانون پر بار بار بحث کر کے اس میں
کچھ ترقی یا نشو و نما پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ یہ بنیادی قوانین
ہمیشہ ناقابلِ تبدیلی سمجھے جانے چاہئیں۔ ورنہ انکے بار بار تبدیل کرنے
سے اکثر نہایت خراب نتائج رونما ہوتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں جب
کوئی تحریک ملک میں عالمگیر فتح حاصل کرنے کے لئے کام کر رہی ہو۔ اس
وقت تو اس کے بنیادی قوانین میں کسی طرح بھی کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی
اس بارے میں جو بات نہایت اہم اور ضروری ہے اسے بیرونی طور

علان جنگ کیا کرتا ہے۔ کہ دنیا اس پر حیران و ششدر رہ جاتی ہے۔

اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا۔ کہ ہر ایک جنگ آزما کو ہی ان تازہ تخیلات کا پورا پورا علم ہو۔ جنہوں نے کہ لیڈروں کے دماغ پر اثر ڈال کر اس تحریک کو جنم دیا ہے۔ کیونکہ جس فوج میں سبھی جرنیل ہوں۔ وہ کبھی کہیں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کوئی ایسی سیاسی تحریک بھی کسی عالمگیر اصول کی حمایت میں کوئی شاندار نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ جس میں سبھی صاحب دماغ شامل ہوں۔ اور ان کی پیروی کرنے والے عوام نہ ہوں کیونکہ ہر تحریک کو سوچنے والے دماغوں کے ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل کرنے والے مضبوط ہاتھوں اور پیروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور بغیر ان کے کبھی کوئی اندرونی نظام (ڈسپلن) قائم نہیں رہ سکتا۔ یعنی جب تک کسی نظام میں ایک تعداد کثیر ایسے لوگوں کی شامل نہ ہو۔ جو محض جذبات کے زیر اثر اس میں شریک ہوئے ہوں۔ اور جو اپنے صاحب دماغ لیڈروں کے ہر فیصلے اور ہر حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کے لئے تیار ہوں۔ تب تک کوئی نظام زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہر سکتا یعنی اگر کسی فوجی دستے کے دو سپاہیوں میں سبھی دماغی لحاظ سے یکساں سمجھ بوجھ کے آدمی ہوں تو ان میں نظام قائم رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہ نسبت اس دستے کے جس میں صرف دس آدمی تو اچھی فہم و فراست والے ہوں اور باقی معمولی عقل والے۔ مثال کے طور پر سوشیل ڈیماکریٹ پارٹی کو ہی دیکھ لیجئے۔ اس میں عہدیدار بھی ہیں اور معمولی کارکن ممبر بھی۔ جرمن مزدور اور برخاست شدہ فوجی ملازم تو اس کے سپاہی یا ممبر ہیں اور یہودی صاحب دماغ نیز ان کے دیگر ہمخیال ان کے افسر و عہدیدار۔

ان دنوں عوام کے دلوں میں جو مبہم سی خواہشات عام طور پر پیدا

اصولوں پر کبھی نکتہ چینی نہ کریں۔ اور نہ کبھی ان میں کوئی تبدیلی کرنے کی ہی کوشش کریں بلکہ وہ جیسے بھی ہیں انہیں ویسے ہی قائم رکھنے پر ہمیشہ زور دیں۔ کیونکہ ابتدا میں اس نوجوان تحریک کی ہستی کا دارومدار ہی ان اصولوں پر تھا۔ اور ان ہی کی مطابقت میں پارٹی کے آئندہ کام کا سب پروگرام بنایا گیا تھا۔

نیشنل سوشلسٹ تحریک کا بنیادی تخیل قوم پرستانہ تھا۔ اس لئے تمام نیشنل سوشلسٹوں کے خیالات بھی ویسے ہی قوم پرستی سے پر تھے۔

کیونکہ اگر ہمیں نیشنل سوشلزم کو دنیا میں فتحمند ثابت کرنا ہے۔ تو یہ لازمی تھا۔ کہ ہم اپنے اس اور صرف اسی عقیدے پر ہمیشہ نہایت مضبوطی سے قائم رہیں یہ اس تحریک کا صرف فرض ہی نہیں۔ بلکہ اس کا حق بھی تھا کہ وہ اس حقیقت کا کھلے الفاظ میں اعلان کردے۔ کہ نیشنل سوشلسٹ ورکرز پارٹی نے قوم پرستی کے تخیل کے متعلق جو حدود قائم کی ہیں ان سے باہر جاکر اس کے نام پر کسی خیال کے اظہار کا کوئی حق کسی کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔"

اس کے بعد جو اکثر جماعتیں۔ پارٹیاں۔ انجمنیں وغیرہ پیدا ہوکر اور اپنے نام کے ساتھ "نیشنلسٹ" لفظ لگاکر قوم پرستی کا اظہار کرنے لگیں۔ تو یہ بھی بذات خود ہماری نیشنل سوشلسٹ تحریک کا ہی ایک نمایاں اثر تھا۔ ہمارے عالم ظہور میں آئے بغیر شاید ان جماعتوں کو بھی اپنے اپنے ناموں کے ساتھ "نیشنلسٹ" لفظ استعمال کرنے کا بھی کبھی کوئی خیال پیدا نہ ہوتا اور شاید اس لفظ کے معنوں کی طرف بھی ان کی کبھی توجہ نہ جاتی۔ اس کے ساتھ کوئی حقیقی تعلق رکھنے کی توہات ہی جدا ہے۔ اور علاوہ اس کے یہ فخر بھی ہمیں ہی حاصل ہے۔ کہ ہم نے ہی (جرمنی میں) اپنے نام کے ساتھ "نیشنلسٹ"

پر ہرگز تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس تحریک کے اندرونی منشا و مدعا میں
اسے دیکھنا چاہیئے۔ وہاں یہ صاف معلوم ہو جائیگا کہ اس میں کوئی
تبدیلی ممکن نہیں۔ اس لئے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنی بہتری و بہبودی
کو مدنظر رکھ کر ہر حالت میں اس طاقت و قوت کو ہمیشہ قائم رکھا جائے۔ جس
کی کہ ہر جنگ وجدل میں سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اور کبھی کوئی ایسی حرکت
نہ کیجائے۔ جس سے کہ کسی طرح بھی تحریک میں اندرونی نفاق یا اس کی
پائیداری و مضبوطی کی کمی کا اظہار ہو۔

اس بارے میں بھی ہم رومن کیتھولک چرچ کی تنظیم سے بہت کچھ
سبق لے سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کے بہت سے اصول اکثر پہلوؤں میں حقیقی
سائنس اور علمی معلومات کے خلاف ہیں۔ اور بعض صورتوں میں ان سے غیر
ضروری طور پر ٹکراتے بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی چرچ اس قربانی کے لئے کبھی
تیار نہیں۔ کہ ان میں کہیں ذرہ بھر تبدیلی بھی کر دیجائے۔ کیونکہ اس نے یہ
نہایت صحیح طور پر محسوس کر لیا ہے۔ کہ اس کی طاقت مقابلہ کا انحصار ہر زمانہ
کی سائنٹفک معلومات سے جو اکثر تبدیل ہوتی رہتی ہیں مطابقت رکھنے پر
نہیں۔ بلکہ اپنے ان اصولوں پر قائم رہنے پر ہے جو اس کے عقائد کی مضبوطی
کو ظاہر کرنے والے ہیں اور اسی کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ وہ چرچ آج بھی پہلے کی نسبت
بدرجہا زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

غرضیکہ اس طرح نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی نے اپنا یہ پچیس
دفعوں والا پروگرام پیش کر کے اپنی تحریک کے لئے ایک ایسی بنیاد قائم
کر لی۔ جسے ہمیشہ اٹل اور اچل رکھنا چاہیئے۔ اس لئے اب اور آئندہ بھی ہماری
تحریک کے ممبروں کے لئے یہ ایک نہایت ضروری فرض ہو گیا۔ کہ ہم ان بنیادی

۶

ابتدائی جدوجہد

۲۴ رفروری ۱۹۲۰ء کے عالی شان جلسے سے فارغ ہوتے ہی ہم اگلے جلسے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ اب تک تو ہم نے میونخ جیسے شہر میں پندرہ روزہ تو کیا ماہواری جلسے بھی باقاعدہ کرتے رہنے کی اپنے دل میں کبھی جرات نہ کی تھی۔ مگر اب ہم نے ہر ہفتے ایسے ہی شاندار جلسے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہوف برا ہوس فیسٹس آل ہم نیشنل سوشلسٹوں کے لئے ایک مقدس مقام بن گیا۔ ہر ہفتے یہاں خوب حاضری ہونے لگی۔ اور لوگ ہماری تحریک کی طرف زیادہ سے زیادہ تر متوجہ ہونے لگے۔ تقریباً ہر جلسے کی کارروائی "جرم جنگ" کے سوال سے ہی شروع ہوتی تھی۔ جس پر کہ اب تک کسی نے توجہ ہی نہیں دی تھی اور اس کا خاتمہ "عہد نامہ امن" پر ہوتا تھا۔ جس کی دھجیاں اڑانے کے لئے تیز سے تیز طریقے تلاش کئے جاتے تھے اور موزوں و ضروری سمجھے جاتے تھے۔

ان دنوں جب کسی پبلک جلسے میں۔ جو موٹی توند والے سرمایہ پرستوں کا نہیں بلکہ عوام کا ہوتا تھا۔ "عہد نامہ ورسیلز" پر بحث کی جاتی تھی۔ تو اسے ملک کی جمہوری حکومت پر ایک حملہ سمجھا جاتا تھا۔ اور جذبے کو اگر "شاہ پرستانہ" نہیں تو "رجعت پسندانہ" تو ضرور ہی خیال کیا جاتا ہے۔ "ورسیلز" کا ذکر زبان پر آتے ہی ہر تقریر میں باقاعدہ طور پر مداخلت بیجا شروع ہو جاتی

لفظ کو سب سے پہلے وابستہ کیا تھا۔ جو کہ اب ہر طرح کے آدمی نہایت کثرت سے استعمال کرنے لگے ہیں۔ اور ہماری تحریک نے اپنے پرچار کے کام سے یہ پوری طرح ثابت کر دکھایا ہے "کہ قوم پرستانہ خیالات" کی طاقت کتنی زبردست ہے؟ اسی لئے تو اب سب اس کی نقل کرتے ہوئے۔ یہ دعوے کرنے لگے ہیں کہ "ہمارے دل میں بھی قوم پرستی کے جذبات موجزن ہیں"۔

ہے تو ہر ایک کمزور تحریک کے پیروؤں کو قدرتاً یہ رغبت ہو جاتی ہے۔ کہ اپنی حماقتوں کی پردہ پوشی کے لئے وہ بھی عوام کے ساتھ شوروغل مچانے میں شریک ہو جائیں۔ کئی جگہ میں یہ تماشہ دیکھ چکا تھا۔ کہ جب مصنوعی طور پر چند کرایہ کے ٹٹوؤں نے مخالفت کی کوئی آواز بلند کر دی۔ تو پھر اسے دبانا سخت مشکل ہو جاتا تھا۔ اور اس کی آخری مثال اس وقت ہمارے سامنے آئی تھی۔ جب کہ ہمارے ذلیل اخبارات نے جو جرمن زندگی کی ایک لعنت بن گئے تھے۔ جنوبی ٹائیرول کے سوال کو غیر ضروری اہمیت دے کر اسے جرمن قوم کے لئے نہایت خطرناک بنا دیا تھا۔ اور کئی "نام نہاد" قوم پرست لوگ اور جماعتیں بغیر کچھ سوچے سمجھے ہی محض یہودیوں کے ہتھکنڈے ہوئے پبلک جذبات کے خوف سے اس چیخ و پکار میں شریک ہو گئے تھے۔ اور کمال بیوقوفی سے ایک ایسے طریق کی مخالف تحریک کی حمایت کرنے لگے تھے۔ جس کی طرف ہم جرمنوں کو بالکل بھی توجہ نہ دینی چاہیئے تھی۔ خصوصاً ایسے نازک موقع پر جسے اس بدباطن دنیا میں ہمیں اس روشن نکتہ کو سمجھنا چاہیئے تھا۔ اور جب کہ یہودیوں کی بین الاقوامی دنیا یقینی طور پر ہماری قوم کا گلا گھوٹنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ افسوس! اس وقت ہمارے نام نہاد "محب وطن" اور "قوم پرست" بھی اس طریق اور ان آدمیوں کے خلاف لنگر لنگوٹے کس کر میدان میں اتر آئے تھے جنہوں نے کم از کم دنیا کے ایک نہایت محدود سے حصہ میں یہودیوں اور میسنوں کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کی کچھ جرأت تو ظاہر کی تھی۔ اور قوم پرستی کی طاقت کا سہارا لے کر بین الاقوامیت کے اس وسیع اور عالم گیر جیلخانے کی دیوار کو کہیں سے توڑ پھوڑ کر اس سے باہر نکل بھاگنے کی کوشش تو کر دکھلائی تھی مگر اس سے بہت جلد ہم پر یہ ظاہر ہو گیا۔ کہ ہمارے مخالفوں کے

تھی "لبرلیسٹ سٹو وسک" کے آوازے بلند ہوتے لگتے تھے اور ان کا زور اس وقت تک برابر جاری رہتا تھا۔ جب تک کہ یا تو حاضرین جوش میں بھر کر ہاتھا پائی نہ کرنے لگیں۔ یا مقرر ہی اپنی تقریر کا رُخ بدل کر۔ اس کے متعلق لوگوں کو کچھ تبلانے یا اکسانے کی کوشش ترک نہ کر دے۔ ایسے لوگوں کو قابو میں لانے کی طرف سے ہم اکثر مایوس ہو جاتے تھے۔ کیونکہ وہ بھلے مانس یہ سمجھنا ہی نہ چاہتے تھے کہ "ورسیلز" ہمارے لئے کتنا باعث شرم اور موجب توہین ہے اور جو شرائط امن ہم سے اس میں بزور منظور کرائی گئی ہیں۔ ان میں یہ حیثیت ایک قوم کی ہمارے لوٹے گھسوٹے جانے کو کیسے ہر طرح جائز ومنا سب قرار دیا گیا ہے۔ مارکسٹوں کی تباہ کن کارگذاریوں اور ہمارے دشمنوں کے زہر آلود پروپیگنڈا نے لوگوں کو ہر معقول سے معقول، دلیل ومنطق کی طرف سے "اثر پروف" بنا دیا تھا۔ اور کوئی شخص بھی یہ شکایت نہ کرتا تھا۔ کہ فریق مخالف کا جرم کتنا عظیم اور ناقابل اندازہ ہے؟ یا ان سرمایہ داروں نے اس شرمناک تباہی اور لوٹ گھسوٹ کو روکنے۔ یا زیادہ دور اندیشانہ ودانشمندانہ طریق پر آزادی عمل کی طاقت حاصل کرنے کے لئے اب تک کیا کارروائی کی ہے۔

ان حالات میں میں نے یہ صاف طور پر دیکھ لیا۔ کہ جب تک ہماری تحریک اپنی کمزور شیر خواری کی سی حالت میں ہے۔ تب تک ہمیں "جرم جنگ" کے سوال پر تاریخی حقیقتوں کی روشنی میں ہی بحث کر کے اسے صاف کرنے کی ضرورت ہے (یعنی معاہدہ ورسیلز کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہئے) کیونکہ جب کوئی زبردست طاقت لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو کر ان سے دیوانوں اور بے عقلوں کا سا کوئی فیصلہ کرا لیتی

ہی نہیں بلکہ اکثر مرتبہ تو اخلاق سے بھی گری ہوئی خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی جس سے مہیب اور شرمناک لفظ "تلافی" (REPARATIONS) کو جرمنی میں جگہ مل سکتی۔ مگر میں نے لیکچروں میں ان دونوں ہی "معاہدات امن" کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ کہ ان میں سے پہلا معاہدہ شریفانہ اور انسانیت آمیز ہے۔ اس کا اثر بھی نہایت ہی پسندیدہ پڑا۔ اور ایک مرتبہ پھر ایک عظیم جھوٹ کا بار گراں ہزاروں حاضرین کے دل و دماغ سے دور ہو کر ان پر حقیقت و صداقت کی چھاپ لگ گئی۔

ان جلسوں سے مجھے یہ فائدہ پہنچا۔ کہ آہستہ آہستہ میں بھی بڑے بڑے پبلک جلسوں کا ایک تقاریر بن گیا۔ اور ہزاروں حاضرین کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے لب و لہجے کے جس اُتار چڑھاؤ اور ہاؤ بھاؤ کے جس اظہار کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میری عادت و خصلت میں شامل ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ ہمارے ابتدائی جلسوں کی یہ بھی ایک خصوصیت تھی۔ کہ جلسہ گاہ سے باہر میزیں ہر طرح کے پمفلٹوں اور پرچوں سے لدی رہا کرتی تھیں۔ جو مفت تقسیم کئے جاتے تھے۔ لیکن ہم زیادہ تر زبانی تقریروں پر ہی بھروسہ کرتے تھے۔ اور درحقیقت ان کا ہی اتنا اثر بھی ہوتا ہے۔ کہ عوام کے جذبات میں ایک تہلکہ سا مچ کر ان کے دلوں میں انقلاب پیدا ہو جائے اور ان کی دماغی حالت بالکل ہی بدل جائے۔

کیونکہ ہر جلسے کے حاضرین بھی ہر لیکچرار کی برابر رہنمائی کرتے رہتے ہیں اور اپنے لیکچر کی غلطیاں دور کرنے میں اسے مدد دیتے رہتے ہیں۔ یعنی وہ حاضرین کے چہروں پر اپنے الفاظ کے اثر کو برابر دیکھ سکتا ہے۔ اور یہ معلوم کر سکتا ہے۔ کہ اسکی پیش کردہ دلائل کس حد تک ان کی سمجھ میں آ رہی ہیں؟ اور

پاس خصوصاً ہم سے بحث مباحثہ کرنے کے لئے چند خاص دلائل کے سوا اور کچھ بھی مصالحہ نہیں۔ اس لئے وہ ہمارے دعوؤں کے خلاف ان ہی چند دلائل کو بار بار دھرا دیتے ہیں کیونکہ ان سب نے ایک ہی تعلیم پائی ہے اور آج میں یہ فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کے پرچار کو نہ صرف بے اثر کرنے بلکہ ان کے ہی الفاظ سے ان کا منہ بند کر دینے کے ذرائع کو بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔ اور اس دو سال کے تجربہ نے تو مجھے اس فن کا ماہر بنا دیا ہے۔ اس لئے جب بھی میں کہیں تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا۔ تو میں نے ان ہی دلائل کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھا۔ جن کو ہمارے مخالفین کی طرف سے پیش کئے جانے کی امید کی جا سکتی تھی۔ اور ان کا منہ بند کرنے کے لئے سب سے پہلے ان کی ہی بخیہ دری شروع کر کے میں نے عوام پر ان کے کھوکھلے پن کو خوب اچھی طرح ظاہر کر دیا اسی لئے فوجی سپاہیوں میں بطور لیکچرار کے کام شروع کرنے پر میں نے جب "معاہدہ درسیلز" کے ساتھ ہی "معاہدہ برلیسٹ لٹووسک" کو بھی شامل کر کے دونوں کے حسن و قبح کو حاضرین پر خوب روشن کر دیا۔ پھر اس لیکچر کے بعد اس پر جو مباحثہ ہوا اس نے مجھ پر فوراً ہی یہ حقیقت بھی کھول دی۔ کہ عوام کو در اصل "معاہدہ برلیسٹ لٹووسک" کے متعلق کچھ علم ہی نہیں۔ اور وہ ویسے ہی ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو کر ان کی مخالفت کو مضبوط کر دیتے ہیں جنہیں کہ خود غرضوں نے یہ سکھا پڑھا دیا ہے۔ کہ یہ معاہدہ دنیا بھر کے نہایت شرمناک اور تشدد آمیز افعال میں سے بدتر تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ کروڑوں جرمن عوام کی نظروں میں "معاہدہ درسیلز" کی حقیقت معاہدہ "برلیسٹ لٹووسک کے ایک جائز اور حق بجانب" جواب سے بڑھ کر کچھ بھی نہ رہ جاتی تھی اس لئے وہ "درسیلز" کے خلاف ہر ایک مذمت کو غیر حق بہ جانب اور نامناسب

انہیں دُور کرنے میں تو صرف وہ اپیل ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ جو ان خفیہ طاقتوں سے براہ راست کی جائے جو ان تعصبات کو پیدا کرنے والی ہیں۔ مگر ایک مصنف کے لئے یہ محض ناممکن ہے۔ اور ایک مقرر بھی اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہونے کی شاذونادر ہی امید کر سکتا ہے۔

جس قوت نے مارکسزم کو عوام کے دماغ پر یہ حیرت انگیز قابو دلایا ہے وہ یہودی مفکروں کے معمولی تحریر کردہ تصنیفات کی نہیں۔ بلکہ اس زبانی پرچار کے سیلاب کی ہے۔ جو سالہا سال سے ان اصولوں کے متعلق عوام میں بہایا جا رہا ہے۔ ایک لاکھ جرمن مزدوروں میں سے شاید سو نے بھی مارکس کی کوئی کتاب نہ پڑھی ہوگی۔ لیکن تعلیمیافتہ لوگوں اور خصوصاً یہودیوں میں سے ہزاروں ہی ان کا بغور مطالعہ کر چکے ہیں۔ مگر پھر بھی اس تحریک کے سچے پیرؤں میں ادنےٰ طبقات کے لوگ ہی بہت زیادہ ہیں۔ کیونکہ درحقیقت یہ کتابیں عوام کے لئے لکھی ہی نہیں گئیں۔ بلکہ یہودی مشن کے دماغی لیڈروں کے لئے لکھی گئی ہیں اور صرف اس نیت سے کہ وہ اس کی مدد سے دنیا پر فتح حاصل کرلیں۔ اسطرح اس تحریک کی ابتدا ایک بالکل ہی مختلف مسلہ سے کی گئی ہے۔ یہی اختلاف آج بھی ہمارے سرمایہ دار پریس اور مارکسسٹ پریس میں نہایت نمایاں ہے۔ کیونکہ مارکسسٹ پریس میں تو ایجیٹیٹر خود کام کرتے ہیں۔ اور سرمایہ دار پریس میں انکے تنخواہ دار ملازم!

تعجب تو یہ ہے کہ ہمارے سمجھدار تعلیم یافتہ لوگ بھی دنیا کے باقی جاہل اور بیوقوف لوگوں کی مانند ہی یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ایک مصنف مقرر کی نسبت زیادہ سمجھ بوجھ والا انسان ہوتا ہے چنانچہ ایک مرتبہ یہ خیال ایک قوم پرست اخبار میں ایک نہایت پرُ مذاق تصویر کے ذریعہ ظاہر کیا گیا۔ اس میں بتایا گیا

اور اسے ان کے دل ودماغ پر مطلوبہ اثر ڈالنے میں کہاں تک کامیاب ہو رہی ہیں لیکن کسی مصنف یا محرر کا یہ اندازہ نہیں لگ سکتا۔ اس لئے وہ اپنے فقرات میں حسب ضرورت رد و بدل بھی نہیں کرسکتا اور نہ انکی تشریح و توضیح پر ہی مناسب زور دے سکتا ہے اور اسے مجبوراً اپنی تحریر عام دلائل تک ہی محدود رکھنی پڑتی ہے۔

مثلاً فرض کر لیجئے۔ ایک لیکچرار اپنے دوران تقریر میں یہ محسوس کرتا ہے۔ کہ اس کے سامعین صحیح طور پر اس کی تقریر کا منشا و مدعا نہیں سمجھ رہے۔ تو وہ فوراً اپنی دلائل کی تشریح ایسے آسان اور عام فہم طریق پر کرسکتا ہے۔ کہ وہ سب اسکی بات کو سہولیت سے سمجھ جاتے ہیں۔ اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ میری دلیل لوگوں پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتی تو وہ اسے دھرا کر۔ یا مختلف تمثیلات و نظائر پیش کرکے اپنے مطلب کو ان پر ظاہر کرسکتا ہے۔ اور ان کے خاموش شبہات و اعتراضات کا فوراً جواب دے سکتا ہے۔ اور جب تک چاہے یہ سلسلہ جاری رکھ سکتا ہے۔ لیکن کسی مصنف یا محرر کو یہ سہولیت حاصل نہیں ہوسکتی

اسی طرح بعض مرتبہ ایک نقار لوگوں کے تعصبات پر فتح پاکر بھی فوراً ہی انہیں اپنا معتقد بنا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ تعصبات اکثر سمجھ بوجھ سے پیدا نہیں ہوتے۔ بلکہ نادانستہ طور پر مختلف جذبات کے زیر اثر انسان کے دل ودماغ پر قابو پا لیتے ہیں۔ مزید برآں عقل عیوانی سے تعلق رکھنے والی طبعی نفرت۔ جذباتی حقارت اور مخالفانہ ہٹ دھرمی پر قابو پانا تو بہت ہی مشکل ہے۔ بہ نسبت اس مخالفت کے جس کی بنیاد کسی غلط فیصلے یا غیر صحیح علم پر ہو۔ کیونکہ جہالت اور غلط خیالات کی اصلاح تو واقفیت و تعلیم سے ہوسکتی ہے مگر جذبات پر مبنی تعصبات کا دور کرنا نہایت محال ہے

وہ شخص اپنی قوم کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنے میں کتنا ناقابل ثابت ہوا ہے غرضیکہ لائیڈ جارج نے اپنی ان تقریروں سے ہی نہایت اچھی طرح سے یہ ظاہر کردیا تھا۔ کہ وہ بیتھ مین ہالوگ کے مقابلہ میں اسکے برابر ہی نہیں۔ بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ افضل و برتر ہے اور اس کی تقریریں نیز ان کا طرز بیان ایسا ہے۔ کہ ان سے اسکی قوم کے دل اسکے سامنے کھل جاتے ہیں اور وہ اس کی ہر منشا و مرضی کی عملی طور پر فرمانبرداری کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لائیڈ جارج کی تقریروں کا سادہ پن۔ اس کا طرز بیان اور نہایت ہی سادہ استعارات نظایر و تخیلات کا بیان اس کی شاندار سیاسی قابلیت کے بین ثبوت کہے جاسکتے ہیں۔

غرضیکہ عظیم الشان پبلک جلسوں کی اس لئے بہت سخت ضرورت ہے۔ کہ جو شخص کسی نوجوان تحریک میں تہ دل سے شریک ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن کسر نفسی کے باعث اپنی بے بضاعتی کا خیال کرکے پس و پیش کرتے اور خوفزدہ ہوتے رہتے ہیں۔ حاضرین جلسہ میں اپنے بے شمار ساتھیوں کو اپنا ہمراز پاکر ان کا بھی حوصلہ کھل جاتا ہے اور اس "عالمگیر سچتیجن" (تحریک) کے طلسمی اثر سے وہ بھی جوق در جوق پارٹی میں شامل ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان ہزاروں حاضرین کی خواہش اُمنگ اور طاقت ان میں سے ایک ایک کے دل و دماغ میں داخل ہوئی نہیں میدان عمل میں باہر نکلنے کے لئے بار بار ابھارتی اور اکساتی رہتی ہیں۔ اور ان تمام شکوک و شبہات نیز پس و پیش کو۔ جو وہ اپنے دل میں لئے ہوئے جلسہ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ دور بھگا کر ان کے دل کو مضبوط کر دیتی ہیں اور آخرکار انہیں پارٹی کے سرگرم ممبر بنا دیتی ہیں۔ اس لئے نیشنل سوشلسٹ تحریک کو کبھی یہ حقیقت نظر انداز کرنے کی غلطی کا مرتکب نہ ہونا چاہیئے۔

تھا۔ کہ جب کوئی شخص کسی مستند مقرر کی تقریر کو اخبارات میں پڑھتا ہے۔ تو اکثر اس کی آنکھیں کیسے کھل جاتی ہیں؟ مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ دوران جنگ میں ایک اخبار میں میں نے ایسا ہی ایک اور مضمون بھی پڑھا تھا۔ جس میں اس نے لائڈ جارج کی تقریروں کو لے کر۔ جو اس وقت وزیر اسلحہ جات تھے۔ ان پر ایک برقی روشنی ڈالنے کی کوشش کی تھی اور انہیں خوردبین کے نیچے رکھ کر ان کے حسن وقبح کی بخیہ دری بھی کی تھی۔ اور آخر یہ نتیجہ نکالا تھا۔ کہ ان تقریروں سے مقرر کے علم ودماغ کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی کہ وہ بالکل معمولی لفاظی سے پُر ہیں۔ لیکن جب میں نے ان تصویروں کو کتابی صورت میں حاصل کر کے ان کا بغور مطالعہ کیا۔ تو مجھے یہ معلوم کر کے بے تماشہ ہنسی آگئی۔ کہ یہ بیچارہ معمولی جرمن "قلم گھس" دماغی قابلیت کے ان نادر نمونوں کی اس طاقت کو بالکل محسوس ہی نہیں کر سکا۔ جس نے انگریز عوام کے دل ودماغ کو متاثر کیا ہوگا۔ کیونکہ اس شخص نے تو ان تقاریر کا اندازہ صرف اپنی دماغی قابلیت سے لگایا تھا۔ اس اثر کو بالکل بھی نہیں سمجھ سکتا تھا جو کہ وہ برطانی تقاریر اپنی ان تقریروں کی مدد سے اپنے برطانی سامعین اور دیگر عوام کے دل ودماغ پر ڈال سکا ہوگا۔ کیونکہ وہ اس مخالفانہ زہر سے بالکل پاک تھے۔ جو اس جرمن مضمون نگار کے دل اور دماغ میں انگریزوں کے خلاف بھرا تھا۔ اس نکتہ خیال سے تو یہ تقریریں نہایت حیرت انگیز طریق پر کامیاب کہی جا سکتی تھیں۔ کیونکہ ان سے یہ صاف ظاہر تھا۔ کہ اسے عوام کی دماغی کیفیت کا کتنا ماہرانہ علم حاصل ہے اس لئے ان کی تقریروں کا دل میں گھس جانے والا اثر صحیح معنوں میں فیصلہ کن ہوتا رہا ہے۔

اب ذرا لائیڈ جارج کی تقریروں کا ذرا بیتھ مین ہالوگ کی فضول بکواس سے بھی مقابلہ کیجئے۔ پھر آپ پر خود ہی یہ ظاہر ہو جائیگا۔ کہ ہمارے جرمن کرتا دھرتا کی تقریریں اسی مسالہ سے کتنی پر دماغ ہو سکتی تھیں؟ اور یہ اس امر کا کیسا بین ثبوت ہیں۔ کہ

تھے۔ ان میں بھی سخت و کرخت فقرات سے نہایت احتیاط کے ساتھ احتراز کیا جاتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کہیں کہیں کوئی چبھتا ہوا فقرہ یا لطیفہ داخل کر کے اسے مذاق کی چاشنی دے دی جاتی تھی۔ جس سے خوش ہو کر حاضرین کبھی کبھی تالیاں پیٹ کر (وہ بھی کسی خاص جوش و خروش سے نہیں۔ بلکہ نہایت شریفانہ احتیاط سے) اپنے اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جاتے تھے۔

غرضیکہ ایسا معلوم ہوا کرتا تھا۔ گویا کہ سب اونگھ ہی رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی کسی کے آنے جانے کی آہٹ سے ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ تو حقیقتاً" جمبھائی لیتے ہوئے بھی دکھائی دیتے تھے۔ اور آخر میں صاحب صدر کی فرمائش پر کوئی حب الوطنی کے جذبات سے پُر گیت گا کر جلسے کی کارروائی ختم کر دی جاتی تھی۔ اور پھر ہر شخص کو وہاں سے نو دو گیارہ ہونے کی پڑ جاتی تھی۔ کوئی تو سیدھا بیرخانے کی طرف قدم بڑھاتا تھا۔ کوئی قہوہ خانے کی طرف اور کوئی صرف ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کسی کھلے میدان کی طرف لپک جاتے تھے۔

برخلاف ان کے ہماری نیشنل پارٹی کے جلسے کسی طرح بھی ایسے پُر امن نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ وہاں نئی اور پرانی دونو دنیاؤں کے خیالات کی لہریں نہایت زور شور سے دوسرے کے ساتھ ٹکراتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اور کبھی ہیجان سے قومی راگ سے مطمئن نہ ہو کر وہ پوری اور سچی قوم پرستی کے ہر دلعزیز جوش و خروش کا اظہار کیا کرتی تھیں۔ ہمارے جلسوں میں "سرخ جھنڈے" کے پیرو اکثر اپنی مخالفت کا پورے شد و مد سے مظاہرہ کرتے تھے اور وہ بسا اوقات ایک ٹھوس جمعیت کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ اس میں اصلی ایجیٹیٹر تو کم ہی ہوتے تھے۔ مگر ان کے شور و غل مچانے والے پیرو زیادہ۔ جن کے چہروں

(۷)

سرخ تحریک سے جدوجہد

۲۱-۱۹۲۰ء میں نام نہاد سرمایہ پرستوں (بورجیوس) کے جلسوں میں بھی میں شریک ہوتا رہا۔ کیونکہ میں ان کے حالات سے بھی پوری پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور مجھے یہ معلوم کرکے ذرہ بھر بھی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ عموماً ہماری تقریروں کو ایسی حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں؟ میں ڈیموکریٹس جرمن نیشنلسٹس۔ جرمن پیپلز پارٹی (بویرین سٹیٹ پارٹی) کے جلسوں میں بھی شامل ہوا۔ ان میں سب سے زیادہ عجیب بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ ان کے حاضرین میں ہمیشہ ایک ٹھوس اتفاق رائے کی موجودگی تھی۔ یعنی ان جلسوں میں جو لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ تقریباً سب کے سب ہی اس پارٹی کے پیرو ہوتے تھے نہ ان میں کوئی ڈسپلن تھا نہ تنظیم۔ بہ ہیئت مجموعی وہ ایسے آدمیوں کا ایک مجمع نہ معلوم ہوتے تھے۔ جو کسی زبردست انقلاب سے گذر چکے ہوں بلکہ ایسے لوگ ہوتے تھے۔ جو پہلے ہی سے مختلف کاغذات کی طرح نتھی ہو چکے ہوں ان جلسوں کے مقرر بھی ایک پُرامن فضا قایم رکھنے کی حتےّ الوسع کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ وہ باتیں تو بہت لمبی چوڑی بتلاتے تھے۔ مگر بے جان اور پھُس پھُسی سی۔ ان میں سے اکثر اصحاب تو اخبارات کے مضامین کی مانند طول طویل عالمانہ جواب مضمون لکھ لاتے تھے اور انہیں ہی سنا دیتے

کے خلاف ہوتا تھا۔ کیونکہ جو لوگ بھی ہمارے دشمنوں کی طرح آتے تھے۔ وہ اکثر ہماری رائے کی صداقت اور معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمارے دوست بن کر جاتے تھے۔

پھر تو ہمارے مخالفین کی بھی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے یہ چلانا شروع کیا "ساتھیو! قوم پرست۔ ایجیٹیٹروں کے جلسوں سے بچو"! سرخ اخبارات نے بھی آہستہ آہستہ ایسی ہی پس و پیش کی روش اختیار کر لی۔ اس سے لوگوں کی حیرت اور بھی بڑھی اور ان کے رویہ میں بھی اچانک ہی ایک تبدیلی آگئی۔ اور کچھ عرصہ تک تو ہمارے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا رہا جیسا کہ بنی نوع انسان کے سچے دشمنوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے ہماری "مجرمانہ ذہینت" کا اعلان اور ان کا اظہار کرنے کے لئے اخبارات میں مضمون پر مضمون شائع ہونے لگے۔ جو الف سے تک بے بنیاد اور بناوٹی باتوں سے پڑ ہوا کرتے تھے۔ تاکہ کسی طرح تو عوام دھوکا کھا جائیں۔ اور ان کے فریب میں آجائیں لیکن جلدی ہی انہیں یہ بھی یقین آگیا۔ کہ ان کے یہ حملے بالکل بے اثر ہیں نہیں! نہیں!! بلکہ حقیقتاً وہ عوام کی توجہ کو ہماری کوششوں کی طرف اور بھی مرکوز کرنے کا باعث ہو رہے ہیں۔

غرضیکہ ہمارے مخالف ہمارے جلسوں کو منتشر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے؟ اس کا سب سے بڑا باعث ان کے لیڈروں کی ذاتی بزدلی اور کمزوری تھی۔ کیونکہ ہر ایک ایسے موقع پر وہ قابل نفرت اشخاص خود تو باہر کھڑے ہمیشہ اسی امر کے متمنی رہتے تھے۔ کہ دھماکے کی آواز ان کے کانوں تک کب پہنچتی ہے؟ مگر ہم نے بھی مجبوراً اپنے جلسے کا انتظام اپنے ہی ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اور سرکاری افسروں یا ان کی امداد کا بالکل

سے یہی ٹپکتا تھا کہ بس! آج رات کو ہی ہم ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر جائیں گے۔
" اکثر تو ایک کچے دھاگے پر ہی سب معاملہ لٹکتا ہوا دکھلائی دینے لگتا تھا۔ مگر ہمارے
صدر جلسہ کی مضبوطی و سختی نیز ہمارے ہاں کے محافظوں کی دانشمندی سے ان
کے ارادے کامیاب ہوتے ہوتے رہ جاتے تھے۔ اس لئے ان کے دلوں میں
ہمارے خلاف سخت غم وغصہ موجود رہنے کی کافی وجوہات پیدا ہو گئی تھیں۔
ہم نے بھی خوب سوچ وچار کر اپنے پوسٹروں کے لئے سرخ رنگ پسند
کیا تھا۔ کیونکہ ہم اپنے مخالفوں کو چڑانا بھی چاہتے تھے۔ اور ہماری یہ بھی خواہش
تھی کہ ان کے دلوں میں غیض وغضب کی آگ خوب بھڑکے اور وہ ہمارے جلسوں
میں ضرور آئیں خواہ ان کی تشریف آوری کا منشا ہمارے جلسوں کو درہم برہم
کرنا ہی کیوں نہ ہو! تاکہ ہمیں انکے ساتھ دو دو بات کرنے کا موقع تو ملے۔
بقولیکہ

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نغمۂ شادی نہ سہی نالۂ ماتم ہی سہی

اس پر ہمارے مخالف اپنے پیروں کے نام جنہیں وہ جماعتی احساس رکھنے
والے عوام کا نام دیا کرتے تھے ہمارے جلسوں میں شریک ہونے کی اس لئے
ہدایت کر دیا کرتے تھے کہ " شاہ پرستوں کی رجعت پسندانہ ایجیٹیشن کا (جیسا کہ وہ
ہماری تحریک کو کہا کرتے تھے) عوام کے مُکے سے جلد ہی خاتمہ کر دیا جائے۔
اسی کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ ہمارے جلسہ گاہ وقت سے گھنٹہ پون گھنٹہ پہلے ہی حاضرین
سے کھچا کھچ بھر جاتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کہ کسی بڑے پیپے
میں بارود بھر دی گئی ہے۔ اور بس اس کے اڑانے کے لئے دیا سلائی
دکھلانے کی ہی کسر باقی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ ہی مخالفوں کی توقع

یہ یقین دلایا کرتا تھا۔ کہ دنیا بھر کی تمام دانائی بھی اس وقت تک ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ ہم اس پر عمل نہ کریں۔ اور اپنی مضبوط مردانہ طاقت سے اس کی حفاظت کے لئے کمربستہ نہ رہیں۔ امن و امان کی حلیم مزاج دیوی اس وقت تک ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک کہ جنگ کی تیز اور گرم مزاج دیوی اس کے پہلو بہ پہلو موجود نہ ہو۔ امن و امان کی حمایت و برقراری کی غرض سے جو بھی کام کیا جاتا ہے۔ اس کی حفاظت و حمایت کے لئے ہمیشہ ہی زور و طاقت کی ضرورت پڑا کرتی ہے اس طرح میں فوجی طاقت کی اہمیت کو ان کے صفحہ دل پر ہمیشہ ہی ایک نہایت جیتی جاگتی صورت میں قایم رکھتا تھا اور ان میں سے ہر شخص اپنے ملک و قوم کی حفاظت و خدمت کے لئے ہر وقت ہر جگہ اور ہمیشہ زندہ رہنے لگا تھا۔

ہمارے جلسوں میں جب کبھی کوئی ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ تو یہ نوجوان اطلاع ملتے ہی مکھیوں کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ اور جلسوں میں گڑبڑ مچانے والوں کی تعداد کثیر کی کچھ بھی پرواہ نہ کرتے تھے ان پر بے تحاشہ ٹوٹ پڑتے تھے۔ اور اپنے زخموں اور خون کی دھاروں کی طرف کچھ توجہ نہ دے کر پیچھے ہٹنے کا خیال تک بھی کبھی دل میں نہ لاتے کیونکہ ان کے دل ہماری تحریک کے عظیم الشان تخیل سے لبالب پر تھے اور اسے اپنی زندگی کا ایک نہایت ہی مقدس مشن سمجھ کر اس کی ترقی کا راستہ صاف کرنے کے لئے ہمیشہ ہی سربکف رہا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں ہماری "فوج امن" باقاعدہ طور پر زیر تنظیم آنے لگی تھی۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی موسم بہار میں تو وہ آہستہ آہستہ مختلف کمپنیوں میں تقسیم ہونے لگی۔ جو بعد میں اور بھی چھوٹے چھوٹے دستوں میں بانٹ

بھروسہ نہ کرتے تھے۔ بلکہ ہمارے تجربے نے بارہا ہم پر یہ ثابت کر دیا تھا۔ کہ سرکاری لوگ ہمیشہ لوگوں کو فتنہ و فساد کے لئے ہی بھڑکایا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی کامیابی ہی اس میں تھی۔ کہ ہمارے جلسوں میں انتشار پیدا ہو کر وہ پیش از وقت ختم ہو جائیں۔ یا بالکل منعقد ہی نہ ہو سکیں۔ اور اسی نیت سے وہ آیا بھی کرتے تھے۔ مگر ہم بھی اپنے دل میں یہ بخوبی سمجھ گئے تھے۔ کہ جس جلسے میں بھی ہم پولیس کی امداد پر تمام و کمال بھروسہ کریں گے۔ اسی میں عوام کی نظروں میں ہمارے کارکنوں کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ اسی لئے ہم اس طرف سے بالکل مستغنی ہو گئے۔ کئی مرتبہ تو ہمارے مٹھی بھر والنیٹروں نے ہی جوش میں بھرے ہوئے تشدد پسند "سرخ" ہجوم کا نہایت دلیرانہ طور پر مقابلہ کیا۔ اور انہیں اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے دس پندرہ آدمیوں کو تو زخمی ہو کر مخالفوں سے مجبوراً پسپا ہو جانا پڑا تھا۔ مگر بعد میں مخالفوں سے بھی تین چار گنے زیادہ عوام ہمارے دشمنوں کی وہ گت بناتے تھے کہ وہ عمر بھر یاد کرتے رہتے ہونگے۔ اور پھر کبھی ایسی حماقت کے اظہار کی جرات کا خیال تک بھی اپنے دل میں نہ لاتے ہونگے۔

اس سے صاف ظاہر تھا۔ کہ ان سرمایہ داروں کے تباہ کن طریقوں پر چل کر جو ہماری قوم پر حکومت کر رہے تھے۔ حکمرانوں کے خلاف انقلاب برپا کرنا کس طرح ممکن تھا؟ حالانکہ اس وقت بھی جرمن قوم کے حقوق کی حفاظت کے لئے بے شمار گھونسے تیار پائے جاتے تھے۔ اگرچہ کھوپڑیاں ٹوٹنے تک کی نوبت تو کبھی نہ پہنچتی تھی۔ مگر میرے نوجوان ساتھیوں کی آنکھیں اس وقت دلی جوش و خروش سے چمک اٹھا کرتی تھیں جبکہ میں ان کے سامنے ان سے مشن کی ضرورت و اہمیت بیان کرتا ہوا انہیں ہمیشہ اور برابر

تھا۔ لیکن یہ صاف ظاہر تھا۔ کہ ایک ایسی حالت کا نشان۔ جسے مارکس ازم نہایت شرمناک طور پر ملیامیٹ کرنے میں کامیاب ہو چکا ہو۔ اس تحریک کے نشان کے طور پر کوئی وقعت نہیں رکھ سکتا جس کا مقصد مارکس ازم کو بھی کچل کر ختم کر دینے کا ہو۔ خواہ کسی شریف جرمن کے دل میں قدیم جھنڈے کی کتنی بھی قدر، عزت اور محبت کیوں نہ ہو۔ جب بھی اسے اس ترو تازہ اور نوجوان تحریک کو جھنڈے کے مقابلے میں پیش کیا جائے گا۔ جس کے زیر سایہ لوگوں نے ایسی شاندار قربانیاں کرکے اور اتنی کثیر التعداد میں اپنی جانیں نثار کرکے کامیابی حاصل کی ہے تو قدرتاً اس پرانے جھنڈے کی قدر و قیمت آئندہ جدوجہد میں کچھ بہت زیادہ نہ بچ سکیگی۔ اسی لئے ہم نیشنل سوشلسٹوں نے یہ فیصلہ کیا کہ پرانے جھنڈے کو پھر بلند کرنے سے تو ہم اپنی خاص خصوصیات اور خاص مقاصد کو ان کے پورے پورے زور و طاقت کے ساتھ عوام پر کسی طرح بھی ظاہر نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ یہ ہماری ہرگز خواہش نہ تھی کہ ہم تباہ شدہ شاہی سلطنت اور اس کی قدیم شان و شوکت اس کے قبرستان سے پھر باہر نکال کر زندہ کر دکھائیں بلکہ ہم تو بالکل ایک "نئی حکومت" (سٹیٹ) قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ جو تحریک آج اس پہلو میں مارکس ازم کا مقابلہ کرکے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار تھی۔ اس کے جھنڈے اور نشانات بھی الگ ہی ہوں۔ جو اس کی آئندہ "نئی حکومت" میں بھی اس کے کام آسکیں۔

لیکن میں ہمیشہ سے اس خیال کا بھی حامی رہا ہوں کہ ہمیں اپنی قدامت پرستی کا رنگ بھی ہرگز نہ چھوڑنا چاہئے۔ اس لئے بیشمار نمونوں پر غور و خوض کرنے کے بعد میں نے ایک آخری نمونے کا اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔ وہ یہ تھا۔ کہ ہمارے جھنڈے کی زمین بھی سرخ ہی ہو۔ مگر ایک سفید پٹی

دی گئیں - اور چونکہ اس اثنا میں جلسوں کے متعلق ہماری سرگرمیاں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں - اس لئے اس باقاعدہ تنظیم کا ہمارے راستے میں رونما ہونے والی تمام مشکلات کا خود بخود قلع قمع کرتی جا رہی تھیں -

اس وقت تک ہماری پارٹی نے اپنا کوئی نشان یا جھنڈا قائم نہیں کیا تھا اور یہ کمی اس وقت صرف نقصان دہ ہی نہ تھی - بلکہ مستقبل کے خیال سے ناقابل برداشت بھی ہوتی جا رہی تھی - کیونکہ اس طرح پارٹی کے ممبروں اور عام لوگوں میں کوئی تمیز نہ ہو سکتی تھی جذباتی نقطہ خیال سے بھی اس علامت کی ضرورت ایک سے زاید مرتبہ میرے ذہن نشین ہو چکی تھی - چنانچہ جنگ کے فوراً بعد جبکہ میں برلن میں ہی تھا - تو ایک دن مجھے شاہی محلات کے سامنے مارکسٹوں کا ایک عظیم الشان مظاہرہ دیکھنے کا موقع ملا - جس میں سرخ جھنڈوں - سرخ رومالوں اور سرخ پھولوں کے ایک وسیع اور ناپیدا کنار سمندر کے سے نظارے نے اس ہجوم کی طاقت وقوت میں ایک عجیب شان پیدا کر دی تھی - اس روز ان کی تعداد کا اندازہ میری رائے میں سوا لاکھ کے قریب تھا - اس وقت میں نے یہ محسوس کیا کہ بازاروں میں گھومنے پھرنے والا ایک معمولی انسان بھی ان نظاروں کے محرک جادو سے کس طرح متاثر ہو کر وہی کھیل کھیلنے لگ جاتا ہے - جو دوسری ایسی سرگرمی کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے کھیل رہے ہیں -

بورجیوس (سرمایہ پرستوں کی) پارٹی کا بھی - جن کی درحقیقت کوئی عالمگیر تھیوری نہ تھی - کوئی جھنڈا نہ تھا - ان کی پارٹی نام نہاد "محبان وطن" پر مشتمل تھی - اور وہ "ریش" کے جھنڈے کو ہی اپنا جھنڈا سمجھتے تھے - اس کے مقابلے میں نام نہاد "نیشنل بورجیوس پارٹیوں" نے پرانی شاہی حکومت کے جھنڈے کو اپنا جھنڈا بنا لیا تھا - جس میں کالا سفید اور لال رنگ شامل

(CIRCUS. KRONE)-

جنوری ۱۹۲۱ء کے آخر میں جرمنی کے لئے پھر ایک بڑا خطرہ پیدا ہو گیا معاہدہ پیرس جس کی رو سے جرمنی نے ایک ملیرڈو (MILLIARDS) طلائی فرانکس کی بعید از قیاس گرانبہا رقم بطور تاوان جنگ ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لندن کے اعلان جنگ (الٹی میٹم) کی مطابقت میں اب اس کی تصدیق کئے جانے کا دن نزدیک آ رہا تھا۔ لیکن ملک کی کسی بھی سیاسی پارٹی نے اس خوفناک واقعہ کی طرف کچھ بھی توجہ کرنے کی ہمت ظاہر نہیں کی تھی حتیٰ کہ ہماری ورکرز پارٹی بھی ابھی تک یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ کس روز اسکے خلاف مظاہرہ کیا جائے؟ اور اسکا پروگرام کیا ہو؟

یکم فروری کو میں نے اس سوال کا آخری فیصلہ کئے جانے کا زبردست مطالبہ کیا۔ اور پھر اسے بدھ تک ملتوی کر دیا گیا۔ مگر میں کب ماننے والا تھا؟ اسی روز میں نے صاف کہہ دیا کہ ہمیں یہ بتلا دیا جائے کہ اس کے متعلق کوئی جلسہ کرنا بھی مقصود ہے۔ یا نہیں؟ اور کرنا ہے تو کس دن؟ اس کا جو جواب دیا گیا وہ بھی کچھ صاف نہ تھا۔ اس سے بھی پس و پیش ظاہر ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ کہا گیا کہ "ارادہ یہ ہے کہ اگلے ہفتے اتنی ورکرز کارکنوں یا مزدوروں کو مظاہرے کے لئے مدعو کیا جائے" یہ جواب سن کر میں قابو سے باہر ہو گیا۔ اور میں نے وہیں اعلان کر دیا "کہ میں اپنی ذاتی ذمہ داری پر یہ احتجاجی مظاہرہ کروں گا"

پس پھر کیا تھا؟ دس منٹ کے اندر ہی اندر میں نے پوسٹروں کے مضامین لکھوا دیئے۔ اور اگلے ہی دن یعنی ۳ فروری کے لئے "سرکس کرون" کو کرایہ پر لے لیا۔ اس زمانے میں یہ ایک زبردست حوصلے اور دل گردے کی بات تھی۔ کیونکہ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ ہم اس وسیع ہال کو حاضرین سے پر کر سکیں گے یا نہیں؟ جلسے کے منتشر کر دیئے

اسے بیچ سے کاٹتی ہوئی جائے۔ اور اس کے بیچوں بیچ ایک کالی صلیب ہو جس
کے چاروں سرے مڑے ہوئے ہوں۔ بہت تلاش اور سوچ وچار کے بعد بالآخر میں
یہ فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کہ ہمارے جھنڈے اور اس کی سفید پٹی کا تناسب
کیا ہو۔ اور جو صلیب اس کے بیچ میں رکھی جائے اس کی صورت شکل اور موٹائی
کیا رہے۔ اس وقت سے ہمارا جھنڈا بالکل ویسا ہی ہے۔

یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد فوراً اسی نمونے کے "بازوبند (ARMLET)
تیار کرائے گئے۔ تاکہ نظام اور شناخت کے لئے ہمارے سب ممبر انہیں اپنے
بازوؤں پر لگائے رکھیں سب سے پہلے ۱۹۲۰ء کے موسم گرما کے وسط میں یہ
نیا جھنڈا پبلک کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کے دو سال بعد جبکہ ہمارے
ممبروں کو (جن کی تعداد کئی سال سے ہزاروں تک پہنچ گئی تھی) "طوفانی ماٹوز
(STORMDEL-ARNMENTS)
کہا جانے لگا۔ تو یہ بھی ضروری ہو گیا۔ کہ ہم اپنی نئی عالمگیر تھیوری کے اس
جنگی نظام کو فتح عالم کے ایک خاص نشان یعنی "علم" سے بھی مزین کریں اور
اس وقت سے ہی ہمارا یہ قومی جھنڈا ہماری قوم کے "علم فتح" کی صورت میں
تبدیل ہو گیا۔

اس وقت میونخ میں مارکسٹ پارٹی کے علاوہ کوئی پارٹی ایسی نہ تھی
جو ہماری پارٹی جیسے عظیم الشان عام مظاہرے کر سکتی ہو۔ "دی نیشنز
کنڈل کیلر" (KINDALKELLER) نامی مقام بھی جس میں پانچ
ہزار کی حاضری کی گنجائش تھی۔ ہمارے جلسوں میں کئی مرتبہ تنا کھچا کھچ
بھر چکا تھا۔ گویا کہ پھٹا پڑتا تھا۔ اب صرف ایک ہال باقی رہ گیا تھا
جہاں تک ہم نے اب تک کوئی جلسہ نہ کیا تھا۔ اور وہ تھا "سرکس کرون"

اس روز میرے لکچر کا مضمون تھا۔ "آئندہ تباہی!" اور میں نے پورے ڈھائی گھنٹے تک تقریر کی۔ تقریر شروع کرنے کے نصف گھنٹے بعد ہی مجھے یہ یقین ہو گیا۔ کہ ہمارا جلسہ نہایت شاندار طور پر کامیاب ثابت ہو گا۔ اگرچہ پیلا پریس اور بدباطن اخبارات نے اس جلسے کی مختصر رپورٹ شائع کرتے ہوئے صرف یہ لکھا۔ کہ یہ محض ایک "قوم پرستانہ جلسہ تھا" اور اس بات تک کا بھی کسی نے ذکر نہیں کیا۔ کہ جلسے کے منتظم اور داعی کون تھے؟ اور اس کا حقیقی مقصد کیا تھا؟

لیکن ۱۹۲۱ء میں اس ابتدا کے بعد میونخ میں ہمارے جلسے بہت زیادہ تیزی اور کثرت سے ہونے لگے۔ صرف ہفتہ وار ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو میں ایک ایک ہفتے میں دو دو تین تین جلسے کر دیا کرتا تھا۔ وسط گرما نیز موسم خزاں میں، تو ہر ہفتے برابر تین تین جلسے ہوتے رہے۔ اور اب ہمارے جلسے ہوا بھی کرتے تھے "اکثر سرکس کرون" میں! اور سبھی کامیاب رہتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ممبران کی تعداد بھی دن دونی رات چوگنی بڑھنے لگی۔

ہماری اس شاندار کامیابی پر بھلا ہمارے دشمن بھی کب خاموش بیٹھنے والے تھے؟ انہوں نے بھی ہماری چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے کیلئے ایک آخری وہشت خیز کوشش کر گذرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور یہ قرار پایا کہ چند روز میں ہی "ہاف بریے ہوس" میں ہمارا جو جلسہ ہونے والا تھا۔ اور جس میں میری تقریر کا اعلان کیا گیا تھا۔ اسی میں یہ شرارت کیجائے۔ ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کی شام ۶ اور ۷ بجے کے درمیان مجھے اس امر کی یقینی اطلاع ملی۔ کہ ہمارے جلسے کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ بدقسمتی سے ہمیں پہلے اس کا کچھ اندیشہ نہ تھا۔ اور اسی روز ہم اپنا پرانا شاندار دفتر جو "سٹرنیگر گاس"

جلنے کا بھی سخت احتمال تھا۔ بہر حال یہ تو یقینی تھا۔ کہ اگر اس مظاہرے میں ہمیں ناکامیابی ہو گئی۔ تو پھر ایک عرصہ دراز تک ہم سر نہ اٹھا سکیں گے۔ پوسٹر وغیرہ چسپاں کرنے کے لئے بھی صرف ایک ہی دن ہمارے سامنے تھا۔ بدقسمتی سے جلسے والے دن بارش بھی ہو گئی۔ اور یہ اندیشہ ہو گیا۔ کہ بہت سے آدمی بارش اور برف باری کے باعث کسی جلسے میں شریک ہونے کی بجائے اپنے اپنے گھروں میں امن و امان سے بیٹھے رہنا ہی زیادہ پسند کریں گے خصوصاً اس صورت میں جبکہ فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی کا بھی خوف ساتھ ساتھ ہو۔

مگر میں نے کسی بات کی بھی کچھ پرواہ نہ کی۔ اگلے روز دو لاریاں کرایہ پر لے لیں۔ جہاں تک ہو سکا انہیں سرخی سے رنگ کر ان پر اپنے دو جھنڈے لگا دیئے۔ اور ہر لاری میں پارٹی کے پندرہ پندرہ بیس بیس ممبر بٹھا کر حکم دیا۔ کہ انہیں بازاروں میں دوڑاتے ہوئے۔ پبلک جلسے کے اشتہارات ادھر ادھر پھینکتے چلے جاؤ۔ چونکہ اسی روز شام کو ہونے والا تھا۔ یہ پہلا دن تھا۔ کہ اشتہار بازی کے لئے مارکسسٹوں کے سوا کسی دوسری پارٹی نے لاریوں کو اس طرح جھنڈوں سے سجا کر شہر میں گھمایا تھا۔ اس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ ہوا۔ چنانچہ شام کو جب میں جلسہ گاہ میں داخل ہوا۔ تو میرا دل خوشی سے ویسا ہی باغ باغ ہو گیا۔ جیسا کہ پچھلے سال ہوا تھا۔ جبکہ ہم نے اپنا سب سے پہلا جلسہ " ہاف برا ہوس فیسٹ ہال " میں کیا تھا۔ لیکن مجھے اپنی شاندار کامیابی کا اس وقت تک پورا پورا علم نہیں ہوا۔ جب تک کہ میں حاضرین کی ایک نہایت ہی ٹھوس اور مضبوط دیوار کو چیرتا ہوا بصد مشکل پلیٹ فارم پر نہ پہنچ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ وسیع ہال ہزارہا اشخاص سے کھچا کھچ پڑا تھا۔ اور کہیں تل رکھنے کو بھی جگہ نظر نہ آتی تھی۔

میری یہ ہدایات سنتے ہی سب نے تین چیرز دے کر (تین دفعہ تالیاں بجا کر) پہلے سے بہت زیادہ جوش اور سرگرمی کے ساتھ اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا۔ بعد ازاں میں نے ہال میں داخل ہو کر سب صورت حال کو بغور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مخالف میری طرف ایسے دیکھ رہے تھے۔ گویا کہ وہ نظروں ہی نظروں میں اپنی نفرت کی آگ سے مجھے بھون ڈالنا چاہتے ہیں وہ پرمعنی آوازے کس رہے تھے اور چیخیں بلند کر رہے تھے۔ گویا کہ وہ یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ آج وہ ہم سے بہت زیادہ زبردست ہیں۔

مگر میں نے اس کی کچھ پرواہ نہ کر کے اپنی تقریر شروع کر دی۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد فساد کا اشارہ دیدیا گیا۔ چند آدمیوں نے پرغضب چیخیں بلند کیں۔ اور کرسیوں پر کھڑے ہو ہو کر "آزادی"۔ "آزادی" چلانا شروع کیا۔ چند سیکنڈ میں ہی تمام ہال ہجوم کی چیخوں اور شور وغل سے بھر گیا۔ اور بے شمار "پن وان" گولوں کی کی طرح ہوا میں اڑنے لگے۔ کرسیاں توڑ ڈالی گئیں۔ شیشے چور چور کر دیئے گئے اور ہر طرف ایک عجیب دیوانے پن کا سا عالم بپا ہو گیا۔

ابھی یہ "شیطانی ناچ" شروع ہی ہوا تھا۔ کہ ہمارے طوفانی ٹولے نے بھی (جیسا کہ بعد میں اس کا نام مشہور ہو گیا) مخالفوں پر ہلہ بول دیا اور وہ آٹھ آٹھ دس دس کے جتھوں میں بھیڑیوں کی طرح بار بار دشمنوں پر حملہ کرنے لگے۔ اور آخر انہیں ہال سے باہر نکال دینے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اور پانچ ہی منٹ میں مجھے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ دکھائی دیا۔ جو خون سے شرابور نہ ہو۔ عین اسی وقت یکایک دروازے کی طرف سے پلیٹ فارم پر پستول کی دو گولیاں چلائی گئیں۔ جن سے شور وغل اور بھی زیادہ ہو گیا۔ زمانہ جنگ کے یہ نظارے از سر نو دیکھ کر میرا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ مگر اس وقت یہ معلوم کرنا ممکن

میں تھا۔ دوسری عمارت میں تبدیل کر رہے تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ پرانے شاندار دفتر سے نکل چکے تھے۔ لیکن نئے دفتر میں ابھی تک پہنچے نہیں تھے۔ اور ابھی دونوں کے بیچ میں ہی تھے۔ کیونکہ ہمارا اسباب ابھی تک ڈھویا ہی جا رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا۔ کہ اس روز جلسے کا انتظام کرنے کے لئے ہمارے کارکنوں کا دستہ بھی نسبتاً کمزور تھا۔ صرف ۴۵۔ ۴۶ آدمیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور ٹیلی فون بھی کام نہ کرتا تھا۔ کہ دوسرے مقامات سے ہی گھنٹے بھر میں کافی والنیٹرز کو بلا لیا جاتا۔

چنانچہ میں کوئی پونے آٹھ بجے ہال کی ڈیوڑھی میں پہنچا۔ وہاں جو کچھ میں نے دیکھا اس سے مجھے مخالفوں کی فوری نیت میں کچھ بھی شک وشبہ نہ رہا۔ کیونکہ ہال حاضرین سے خوب کھچا کھچ بھرا تھا۔ اور پولیس مزید آدمیوں کو اندر جانے سے روک رہی تھی۔ یعنی ہمارے دشمن پہلے ہی بہچکر اندر گھس گئے تھے۔ اور ہمارے دوست باہر ہی کھڑے ٹاپ رہے تھے۔ مخالفوں کا چھوٹا سا دستہ باہر ڈیوڑھی میں میری انتظار کر رہا تھا میں نے ہال کا دروازہ بند کر دیا۔ اور اپنے حصے کے سب آدمیوں کو بلا کر ان سے کہا کہ آج پہلی مرتبہ تحریک کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرنے کا موقع آپ کے سامنے آیا ہے۔ اس لئے جب تک آپ کے دم میں دم ہے آپ میں سے کسی کو بھی ہال سے باہر جانے کا خیال تک بھی اپنے دل میں نہ لانا چاہئے۔ اگر میں نے کسی بھی شخص کو بزدلی دکھاتے ہوئے دیکھ لیا تو میں خود اس کا بلا چھین لوں گا اور بازو بند پھاڑ دوں گا۔

" اس کے بعد میں نے انہیں حکم دیا۔ کہ سب اپنی اپنی نوکری پر تشریف لے جائیے؟ اور ذرا سی بھی شرارت ہونے پر جلسہ درہم برہم کر دیجئے۔ یاد رکھئے کہ ایسے موقع پر فوراً حملہ کر بیٹھنا ہی مدافعت کا بہترین طریقہ ثابت ہوا کرتا ہے۔"

(۸) زبردست کا جوتہ

آجکل ہر ایک معمولی شہری یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ کہ مزدوروں نے اپنی ٹریڈ یونین بنا کر "جماعت میں کرامت" کا سبق سیکھ لیا ہے۔ اور ان لوگوں کی کٹ پتلیاں بننے سے انکار کر دیا ہے۔ جو ان میں پھوٹ ڈلوا کر انہیں کمزور رکھنا چاہتے ہیں۔ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے۔ کہ یہ اتحاد نہایت طاقت بخش ہے اور اس کی بدولت وہ لوگ جو پہلے بہت کمزور اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں منقسم تھے یکایک متحد ہو کر بہت طاقتور ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ خیال ایک بڑی حد تک بالکل غلط ہے۔

فرض کیجئے! ایک شخص کسی جزوی سچائی کا اعلان کرتا ہے۔ یا کسی خاص سوال کا ایک خاص حل پیش کرتا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کے سامنے بیان کر کے اسے منظور کرنے کی زبردست اپیل کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے ایک ایسی تحریک جاری کر دیتا ہے۔ جس سے اس کے مدعا اور ارادوں کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ یہ طریقہ ہے ایک یونین یا ایک پارٹی قائم کرنے کا جس کا پروگرام یا تو کسی موجودہ خرابی کو دور کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یا کسی آئندہ موقع پر صورت حالات کو کوئی خاص شکل دینے پر۔ جب ایک دفعہ کوئی ایسی تحریک جاری ہو جاتی ہے۔ تو پھر وہ ایک طرح اپنی قدامت کا بھی دعوےٰ کرنے لگتی ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اور سب جماعتیں بھی جو اسی ایک مقصد کے لئے کام کرنا چاہتی ہیں پہلی جماعت کے ساتھ شریک ہو کر آہستہ آہستہ اس کی طاقت بڑھاتی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ سب ایک خاص مشترکہ مقصد کے لئے زیادہ بہتر طور پر کام کر سکیں۔

لیکن یہ کام درحقیقت اس طرح نہیں ہوتا۔ اس کی دو وجوہات ہیں

تھا۔ کہ یہ گولیاں کس نے چلائی ہیں؟ بہرحال میں دیکھ رہا تھا۔ کہ میرے نوجوانوں نے ایک تازہ جوش کے ساتھ مخالفوں پر حملے شروع کر دیئے ہیں۔ جتنے کہ آخری مفسد عنصر کو بھی ہال سے نکال کر باہر کر دیا گیا اس طرح بمشکل ۲۵ منٹ گزرنے پائے ہونگے۔ کہ ہم نے فسادیوں کو بھگا کر ہال پر پھر اپنا تسلط جما لیا۔ اور صدر جلسہ ہر ہرمن ایسر نے کمال اطمینان سے یہ اعلان کر دیا۔ کہ "اب جلسے کی کارروائی پھر شروع ہوتی ہے"۔ بعد ازاں میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری کیا۔

جلسہ ختم ہونے والا ہی تھا۔ جبکہ محکمہ پولیس کا ایک لفٹنٹ جوش میں بھرا ہال میں گھس آیا۔ اور نہایت شان کے ساتھ باہیں ہلا ہلا کر چلانے لگا — "جلسہ برخاست" "جلسہ برخاست" مجھے اس کی اس افسرانہ دلیری پر بے تحاشا ہنسی آگئی۔ اس روز ہم نے بہت سے سبق سیکھے اور یقیناً ہمارے مخالف بھی اس سبق کو جو انہیں سکھایا گیا تھا۔ عمر بھر نہ بھول سکیں گے۔ کم از کم اس کا اتنا اثر تو ضرور ہوا کہ ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں تک اخبار "منشر پوسٹ" (MUNCHER POST) نے پھر "مارکسسٹ مزدوروں کے گھونسوں" کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

ہوتا۔

لیکن ہمیں یہ بھی کبھی نہیں بھول جانا چاہیئے۔ کہ اس دنیا میں صرف اشتراک (کولیشن) سے ہی کبھی کوئی بڑا کام سرانجام نہیں پاتا۔ بلکہ ہمیشہ صرف ایک واحد شخص کی فتح سے پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اشتراک سے اگر کبھی کوئی کامیابی ہو بھی جاتی ہے۔ تو اس میں ابتدا سے ہی آئندہ پھوٹ کا بیج پیدا ہو جاتا ہے جس کی بدولت وہ کامیابی بھی بے اثر ہو جاتی ہے جو اس اشتراک سے پہلے یا اس کے عین بعد کچھ تھوڑی بہت حاصل ہوئی تھی اور نہ ظہور پذیر ہی ہوتی ہے۔ مختلف عناصر کے اشتراک سے تو یہ قطعی ناممکن ہے۔ اس لئے کوئی قومی حکومت مختلف قوم پرست کارکنوں کی مختلف تحریکوں کے ناپائدار اشتراک کی بدولت قائم نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تو صرف ایک واحد تحریک کی ہی نہایت زبردست اور ناقابل تسخیر قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ وہ تحریک اور سب تحریکوں کو شکست دے کر ان پر فتح پالے۔

سبھی پوری پوری دیانت داری سے اس تحریک میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے حق قدامت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ وہ تو محض اس پروگرام کو چرانا چاہتے ہیں جس پر نئی پارٹی نے اپنی بنیاد رکھی ہے اس طرح ۱۹-۱۹۱۸ء میں جو بہت سی پارٹیاں "نیشلسٹ" نام سے قائم ہوگئی تھیں ان کی قائمی ان کے بانیوں کے لئے کچھ باعث فخر نہ تھی۔ کیونکہ یہ تو محض ایک قدرتی نشوونما تھی۔ لیکن ۱۹۲۰ء میں ان سب میں سے نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی آہستہ آہستہ سب سے زیادہ طاقتور اور فتحمند ثابت ہوئی۔ اس لئے اور کوئی چیز بھی ان پارٹیوں کے بعض لیڈروں کی صادقانہ دیانت داری اور قابلیت کو ایسے حیرت انگیز طریق پر ثابت نہیں کر تی تھی۔ جیسی کہ یہ حقیقت کہ ان میں سے کئی ایک نے نہایت قابل تعریف پھرتی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی کم کامیاب پارٹیوں کو غیر مشروط طور پر قربان کر کے انہیں زیادہ کامیاب اور زیادہ طاقت ور پارٹی کے اندر جذب کر دیں گے۔ چنانچہ نورمبرگ کی جرمن سوشلسٹ پارٹی کے روح رواں جولیس سٹریشر نے خصوصاً یہی روش اختیار کی۔ یہ دونوں پارٹیاں بالکل آزادانہ طور پر ایک ہی مقصد کو مدنظر رکھ کر جاری کی گئی تھیں۔ لیکن جونہی سٹریشر کو صریحی اور ناقابل تردید طور پر یہ یقین ہو گیا۔ کہ جرمن ورکرز پارٹی اس کی پارٹی کی نسبت زیادہ مضبوط اور طاقتور ہے وہ اپنے سب ساتھیوں سمیت ہماری پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اور اپنی پارٹی کو توڑ کر ایک مشترکہ مقصد کے لئے ہمارے ساتھ مل کر کام کرنے لگا۔ اس کا یہ فیصلہ ہر پہلو سے قابل تعریف تھا۔ مگر بہ حیثیت ایک انسان کے ایسا کرنا کچھ آسان نہیں

"ملاقت" اور "روایات" کا اشتراک ہو جائے تو وہ حکومت اٹل اور اٹل ہو جاتی ہے۔
اور اسکی پختگی اور مضبوطی میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا۔
یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ عوام کی اکثریت جسے میں "درمیانہ طبقہ" کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ کبھی بھی کوئی نمایاں ہستی اختیار نہیں کرتی۔ سوائے اس حالت کے۔ جبکہ دونوں انتہائی جماعتیں آپس میں برسر جنگ ہوں۔ ان میں سے جو بھی جماعت فتحمند ہو جاتی ہے۔ یہ درمیانہ طبقہ بھی اسی کی متابعت منظور کر لیتا ہے۔ جب بہترین آدمی برسر حکومت ہوتے ہیں۔ تو عوام ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور جب بدترین اشخاص کے ہاتھوں میں عنان حکومت ہوتی ہے تو وہ کم از کم اُنکی بھی مخالفت نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ "درمیانہ طبقے" کے عوام لڑنا بھڑنا تو کسی صورت میں پسند نہیں کرتے۔
اسی لئے جنگ کے بعد ہمیں یہ نظارہ نظر آیا۔ کہ قوم کے بڑے درمیانے طبقے نے جیسا کہ اس کا فرض تھا۔ خون کی صورت میں اپنے حصے کا محصول ادا کر دیا۔ بہترین لوگوں کے انتہائی طبقے نے نمایاں مردانگی کے ساتھ تقریباً آخری ممکن حد تک قربانی کی لیکن بدترین اشخاص کے انتہائی طبقے کی ہمارے احمقانہ قوانین حفاظت کرتے رہے۔ اور قواعد جنگ کو ان پر اس حد تک عاید نہیں کیا گیا جس حد تک ہونا چاہیئے تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان میں سے تقریباً ایک ایک آدمی زندہ بچ گیا۔ اور ہماری قوم کے اس کوڑے کرکٹ نے ہی جس کی ایسی احتیاط کے ساتھ حفاظت کی گئی تھی۔ بالآخر انقلاب کر دیا۔ اور یہ صرف اپنی ان کوششوں میں اسی لئے کامیاب ہو سکا۔ کہ بہترین انسانوں کے اولین طبقے کے لوگ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے باقی نہیں رہے تھے۔
اور تقریباً سب کے سب ہی جنگ میں کام آ چکے تھے۔

(۹)

سوشلسٹ ورکرز سنگھا کا مدعا و مقصد

پرانی حکومت کی طاقت تین ستونوں پر قائم تھی ایک تو بادشاہ کی شخصی عظمت دوسرے صیغہ جات حکومت اور تیسرے فوج۔ انقلاب ۱۹۱۸ء نے شخصی عظمت کو اُڑا دیا تو جوں کی تنظیم کو بھی خراب کر دیا۔ اور صیغہ جات حکومت کو پارٹی بازی کے رحم پر چھوڑ دیا۔ اس طرح ان تینوں ہی ضروری ستونوں کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی۔ حالانکہ حکومت کا انحصار ہمیشہ اور لازمی طور پر ان تین عناصر پر ہی ہوتا ہے۔

وقار حکومت کے لئے پہلا دائمی اور ضروری عنصر "ہر دلعزیزی حمایت ہے"۔ لیکن جو حکومت صرف اسی پر انحصار رکھتی ہے۔ وہ بھی بالکل کمزور۔ ناپائدار اور ڈانواں ڈول رہتی ہے۔ دوسرا صریح عنصر "طاقت" ہے۔ جب طاقت اور ہر دلعزیز حمایت دونوں مل جاتی ہیں اور ایک خاص عرصہ تک مضبوط رہتی ہیں۔ تب حکومت بھی نسبتاً زیادہ پختہ بنیادوں پر قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ پائدار بنیاد وہ ہوتی ہے۔ جس میں ان دونوں کے ساتھ "روایات قومی" بھی شامل ہوتی ہیں۔ اگر ایک مرتبہ بھی کسی حکومت کی بنیاد میں "ہر دلعزیز حمایت"

حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیا تھا۔ یعنی وہ یہ سمجھتے تھے۔ کہ ابھی وہ وقت نہیں
آیا جب کہ جرمنی کو بھی بولشویکی خونریزی کے گڑھے میں ویسے ہی دھکیل دیا جائے
جیسے کہ روس کو دھکیل دیا گیا ہے کیونکہ ان کے سامنے یہ سب سے اہم سوال ہمیشہ
سے درپیش تھا۔ کہ اگر ایسا ہوا۔ تو ان فوجی سپاہیوں کا رویہ کیا ہوگا؟ جو ابھی میدان
جنگ میں ہیں؟ کیا وہ اس انقلاب میں ہمارا ساتھ دیں گے؟ اس لئے وہ
ان ایام انقلاب کی گرما گرمی میں بھی یہ سوچنے کے لئے مجبور تھے۔ کہ اگر ہم اس
خطرے میں نہیں پھنسنا چاہتے کہ ابھی فوجوں کے جو دو تین ڈویژن جنگی
محاذات پر موجود ہیں وہ فوراً ہی آ کر ہم سب انقلاب انگیزوں کا خاتمہ کر دیں۔ تو
ہمیں اپنی تمام انقلابی شورشوں کو کسی حد تک درجہ معتدل صورت میں رکھنا پڑے گا
کیونکہ اگر کہیں ایک ڈویژنل کمانڈر نے بھی اپنے دل میں ہماری مخالفت
کا فیصلہ کر لیا۔ تو وہ اور اس کے وفادار ساتھی فوراً ہی ہمارے "سرخ
جھنڈے" کو پیروں تلے روند دینگے اور اس جھنڈے کی حامی "کونسلوں"
کو کسی دیوار کے سامنے کھڑا کر کے چنوں کی مانند بھون ڈالیں گے اور اگر
دستی بم کے لوگوں نے ان کی کچھ مخالفت کی تو وہ کب کچھ کارگر ہوسکیگی
پھر اس ایک ڈویژن کا ایک ہی مہینے کے اندر اندر چھ ڈویژن بن جانا بھی
تو کچھ غیر ممکن نہیں۔

غرضیکہ یہی وہ سب دور اندیشانہ خیالات تھے جنہوں نے ان یہودی تار ہلانے
والوں کو ہیبت زدہ کر کے زیادہ شرارت کرنے سے باز رکھا تھا۔ کیونکہ انقلاب
امن و انتظام کی طاقتوں کے ذریعہ تو ہوتا ہی نہیں صرف فتنہ و فساد اور
لوٹ مار کی طاقتوں سے ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی مزید تشویشناک
نشوونما بھی ان فتنہ انگیز منتظموں کے قابو کی نہیں رہتی۔ جو انقلاب

لیکن یہ مارکسسٹ لیڈر اپنے اختیارات کے لئے صرف "ہردلعزیز حمایت" پر بھی زیادہ عرصہ تک بھروسہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ لیکن بہرحال نوجوان جمہوریت کو اس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے ۔ کہ ایک مختصر سے زمانے کی بدنظمی کے بعد ہماری قوم کی بہترین عنصر کے باقیماندہ اشخاص ایک تعزیری طاقت کی شکل اختیار کرکے یکایک اُٹھ کھڑے ہوں اور انکا سر کچل ڈالیں مگر ساتھ ہی اس کے وہ عنصر جو انقلاب کا حامی تھا۔ اور جس نے انقلاب کرایا تھا۔ اپنی حفاظت کے لئے فوجوں کو بھی نہیں بلا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ حکومت کی تنظیم پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس میں جو بدنظمی پیدا ہوگئی تھی وہی ان کے مفید مطلب تھی۔ اس لئے اسے ہی وہ پسند بھی کرتے تھے۔ اسی لئے ان کا حفاظتی کلمہ (پاس ورڈ۔ (PASS WORD) یا آخری مقصد "جرمن جمہوریت کی باقاعدگی اور اس کی ساخت" نہیں تھا۔ بلکہ "اس کا لوٹنا۔ گھسوٹنا اور تباہی کرنا" تھا اور یہی وہ کر بھی رہے تھے۔

مگر اتنے ہی میں پہلی مرتبہ کچھ ایسے جرمن نوجوان میدان عمل میں نمودار ہوگئے جو ملکی خدمت کے لئے اور جیسا کہ وہ کہتے تھے "امن و نظام کی برقراری کے لئے ملک کے تباہ کرنے والوں کے خلاف فوجی وردی پہن کر۔ فولادی خود سر پر اور بندوقیں کندھے پر رکھ کر میدان جنگ میں آنے کے لئے تیار تھے وہ والنٹیروں کی حیثیت سے جمع اور منظم ہوگئے اور انقلاب سے ہمیشہ نفرت کرتے ہوئے بھی حکومت کی حفاظت اور اس میں طاقت عمل پیدا کرنے کے لئے ٹھیک نیتی سے کام کرنے لگے۔

انقلاب کے حقیقی بانی مبانیوں اور اس کے اصلی تار ہلانے والوں یعنی "بین الاقوامی یہودیوں" نے جرمنی کی صورت حالات

لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاتی؟

انجام اس کا یہ ہوا کہ جمہوریت کے مخالفوں نے بھی اس کے خلاف اپنا سب جنگ و جدل بند کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس کے وہ ان لوگوں کو بھی ٹھنڈا کرنے میں جمہوری حکومت کی مدد کرنے لگے۔ جو ابھی تک حکومت کے خلاف تھے۔ اگرچہ ان کے اس تعاون کی وجوہات بالکل ہی مختلف تھیں مگر پھر بھی اس کے نتیجے کے طور پر آہستہ آہستہ یہ خطرہ بھی دور ہو گیا۔ کہ شاید پرانے دور حکومت کے حامی ہی نئی حکومت کی مخالفت میں جنگ و جدل شروع نہ کر دیں۔

جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں۔ کہ پرانی حکومت کے ان تمام عیوب سے قطع نظر جو اس انقلاب کا باعث ہوئے ہیں۔ خود یہ انقلابی حکومت اتنی کامیاب کیسے ہو گئی؟ تو ہم ان ہی نتائج پر پہنچتے ہیں۔ کہ اول تو اس کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ عوام کے دلوں میں ان کے فرائض و فرمانبرداری کا تخیل بالکل ہی مردہ ہو چکا تھا۔ اور دوسرے ان تمام دوسری پارٹیوں پر بزدلی اور مردنی سی چھا گئی تھی۔ جن سے یہ امید رکھی جاتی تھی۔ کہ وہ شاہی حکومت کو قائم رکھنے میں کچھ مدد دیں گی ان میں سے پہلی وجہ کا حقیقی باعث تو وہ سرکاری تعلیم تھی۔ جو قوم پرستی کے کسی برائے نام عنصر سے بھی قطعاً عاری تھی۔ اور جس کی بدولت ہمارے قومی ذرائع و مقاصد کے متعلق بالکل غلط خیالات لوگوں میں پیدا ہو کر دور و نزدیک پھیل چکے تھے۔ اور وہ یہاں تک بھول گئے تھے۔ کہ قومی بیداری تکمیل فرائض اور فرمانبرداری ہی بذات خود ہمارا مقصد نہیں اور نہ حکومت ہی ہمارا آخری مقصد ہے۔ بلکہ یہ سب چیزیں تو ہمارے اس مقصد کو حل کرنے کے ممکن ذرائع ہیں۔ جن سے کہ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ ہماری قوم یقینی طور پر اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے اور روحانی نیز جسمانی طور پر ایک

پیدا کرتے ہیں۔ نہ وہ اس کی آئندہ ترقی اور رفتار کا ہی کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور نہ وہ ان کی نگاہوں میں ہمیشہ ہی پسندیدہ رہ سکتی ہیں۔

اس لئے جوں جوں سوشیل ڈیموکریسی یعنی "مجلسی جمہوریت" کے اصول ملک میں پھیلتے گئے۔ انقلاب کی تشددپسندی اور وحشیانہ طاقت کا استعمال بھی روز بروز کم ہوتا گیا حتیٰ کہ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی "سوشیل ڈیماکریٹک پارٹی" عوام کی تساہل پسندی اور امن پرستی کا سہارا لے کر قومی تحفظ کرنے والی طاقتوں کے گلے میں سیسے کے ایک بھاری مردہ بوجھ کی مانند لٹک کر رہ گئی۔ اور اس کا جو زیادہ شورش پسند اور سرگرم حصہ تھا۔ وہ اس سے باہر ہو کر مختلف حملہ آور دستوں کی صورت میں تبدیل ہوگیا اور "انڈیپنڈنٹ پارٹی" "سپارٹیکس یونین" اور انقلابی مارکس ازم کے طوفانی دستے" وغیرہ ناموں سے کئی چھوٹی موٹی جماعتیں پیدا ہوگئیں لیکن جب فوجوں نے محاذات جنگ سے واپس آکر۔ انقلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک خوفناک لیکن خاموش رویہ کی صورت اختیار کر لی۔ تب تو ان کی بھی نانی مر گئی۔ اور اس طرح انقلاب کی جدوجہد اور اس کی سرگرمی اور بھی ہلکی پڑ گئی صرف سوشلسٹ ڈیموکریٹک ہجوم اپنے حاصل کردہ مقامات پر قابض بنے رہے مگر انہوں نے انڈیپنڈنٹ اور سپارٹیکس پارٹی والوں کو بھی اپنے سے الگ ایک طرف دھکیل دیا۔ ابھی یہ صورت حال پوری طرح تبدیل بھی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ انقلاب پسندوں میں بھی دو مخالف جماعتیں پہلو بہ پہلو نظر آنے لگیں۔ جن میں سے ایک تو امن و انتظام کی حامی تھی۔ اور دوسری قتل و خونریزی اور ہیبت انگیزی کی؛ ایسی حالت میں کیا یہ محض فطرتی نہ تھا۔ کہ بورجیوس (درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھنے والی سرمایہ پرست) جماعت بھی اپنی پوری طاقت اور رسوخ کے ساتھ امن و انتظام پسند

سب سے آخر میں "دولیاتی زنجیروں کے پابند" وغیرہ وغیرہ ناموں سے مشہور ہو گئیں۔

اس زمانے میں مارکس ازم کی کامیابی کا باعث ان کے "سیاسی ارادوں کی مضبوطی" اور "وحشیانہ طاقت وقوت کی نمائش" کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ جرمن قوم کے مستقبل کو کسی عملی سانچے میں ڈھالنے اور نشوونما دینے کے متعلق قوم پرست جرمنی کے راستے میں اگر کوئی رکاوٹ تھی تو صرف یہ کہ اس کے سب افراد ابھی تک ارادے کی پوری پوری پختگی و مضبوطی کے ساتھ نہ تو آپس میں تعاون ہی کر سکتے تھے۔ اور نہ سیاسی مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے زور وقوت کا وحشیانہ استعمال ہی کر سکتے تھے۔ اس لئے ان "قوم پرست" پارٹیوں کی خواہشات اور ان کے جذبات خواہ کتنے بھی اعلیٰ اور بلند کیوں نہ مانے جائیں وہ ان کے لئے گلیوں اور بازاروں میں۔ جنگ و جدل کرکے انہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بالکل قاصر ثابت ہوتے تھے۔ مگر اس وقت تمام طاقت "ذاتی تحفظ کی انجمنوں" کے ہاتھوں میں تھی اور وہی گلیوں بازاروں پر قابض تھیں۔ لیکن ان کا کوئی سیاسی پروگرام نہ تھا اور نہ کوئی سیاسی مقصد ہی انکے پیش نظر تھا۔ اس لئے اُن کی طاقت سے بھی قوم پرست جرمنی کو فوراً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

یہ بھی ایک یہودی کی ہی کارستانی تھی۔ جس نے اخبارات میں مضمون چھپوا چھپوا کر نہایت کامیابی سے عوام کے ساتھ ہی ساتھ اُن "ذاتی حفاظت کی انجمنوں" کے ممبروں اور عہدیداروں کو بھی یہ یقین دلا دیا تھا۔ کہ وہ تو بالکل غیر سیاسی جماعتیں ہیں۔ اس لئے انہیں کبھی کسی ملکی یا قومی تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ نہ کرنا چاہیئے۔ اس طرح یہ یہودی لوگ نہایت عیاری و مکاری سے سیاسی تحریکوں کو بھی "خالصاً دماغی تحریک" کہہ کہہ کر لوگوں کی نظروں میں ان کی

مضبوط اور طاقتور زندگی بسر کر سکے۔ اور یہ انقلاب صرف اس لئے کامیاب ہو گیا۔ کہ ہماری قوم۔ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ہماری حکومت متذکرہ بالا خیلات کا صحیح احساس تک کھو بیٹھی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ یہ احساس بطور ایک اصول کے کمزور ہو کر محض ایک نمائشی اور لفظی سی بات رہ گیا تھا۔ جس کی حقیقت و اہمیت کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ بورجیوس پارٹیوں کو جو پرانی حکومت کے عہد میں اپنی قسم کی واحد سیاسی انجمنیں تھیں اس امر کا یقین ہو گیا تھا۔ کہ چونکہ اپنی طاقت و قوت ظاہر کرنے کے سب جسمانی طریقے حکومت کے ماتحت ہیں اس لئے وہ صرف دماغی ذرائع سے ہی اپنے خیالات اور اپنی قوت کا اظہار کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ ایک بالکل حماقت آمیز خیال تھا۔ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ ان کے سیاسی مخالفوں نے اس نقطہ خیال کو بالکل ہی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اور وہ کمال دیانتداری سے یہ اعلان کر رہے تھے۔ کہ وہ تو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے جسمانی زور و طاقت سے بھی ضرور کام لیں گے۔ متوسط طبقات رعایا کی (بورجیوس) پارٹیوں کا سیاسی پروگرام زمانہ گذشتہ کے ساتھ اتنا وابستہ تھا۔ کہ وہ اب تک بھی نئی صورت حالات سے مانوس نہ ہو سکے تھے اگرچہ ان کا یہ مقصد ضرور تھا۔ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ نئی حکومت میں حصہ لے کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ لیکن ان کے ہتھیار اب بھی۔ لفاظی اور کوری لفاظی کے سوا کچھ اور نہیں تھے۔ اس لئے ان کی تمام کوششیں بیکار رہتی تھیں۔ اس وقت مارکس ازم کی مخالفت کی طاقت و ہمت اگر کسی میں تھی۔ تو صرف ان جماعتوں میں۔ جو پہلے تو فری کور یعنی "آزاد افواج" کے نام سے عوام کو مارکس ازم کے خلاف بھڑکا رہی تھیں اور بعد میں "ذاتی تحفظ کی انجمنیں" "آئین وا مانز وہر" اور

کے بیچ میں وہ تیسرا فراخدل درمیانہ طبقہ ہے۔ جسیں تو بہت نیکی کی ہی سپرٹ موجود تھی اور نہ بہت بڑی کبھی
کسی نئے اور عظیم الشان تخیل کی کمی بھی ہر زمانے میں جدوجہد اور جنگ وجدل کی
سپرٹ کو اکثر کم کرنے یا مار ڈالنے کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ ہمیں ہر وقت
اپنے اسلحہ استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ خواہ وہ ہتھیار کیسے ہی ناکارہ یا بیرحمانہ
کیوں نہ ہوں عوام میں یہ پرجوش سپرٹ پھونک دیتا ہے کہ ہم ایک نئے انقلاب
پسند طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جسے دنیا میں ضرور فتحیاب ہونا چاہیئے۔ جو تحریک
ایک ایسے اعلےٰ آدرش کے لئے بھی جدوجہد اور جنگ وجدل کرنے میں پس وپیش
کرتی رہتی ہے وہ کبھی آخری دم تک کشمکش نہیں کرسکتی اور جلد ہمت ہار بیٹھتی ہے
"انقلاب فرانس" نے دنیا کے سامنے ایک نیا اور عظیم الشان تخیل پیش کرنے کے ساتھ
ہی ساتھ اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرنے کا راز بھی معلوم کرلیا تھا۔ "انقلاب
روس" کے متعلق بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ اٹلی کے "فیسزم" نے بھی اپنی تمام
طاقت صرف اسی خیال سے حاصل کی ہے۔ کہ اسے اپنی تمام قوم کی کایا پلٹ
کردینی چاہیئے" اور اس کا نتیجہ بہرحال اس قوم کے لئے نہایت شاندار ہوگا۔

اسی طرح جب جرمن "ریش" کی بنیاد رکھ اسے مضبوط کیا گیا۔ تو مارکسزم
نے بھی آہستہ آہستہ وہ سب طاقتیں حاصل کرلیں۔ جو اس کے اختیارات کو قایم رکھنے
کے لئے نہایت ضروری تھیں۔ اور اس کے منطقی نتیجے کے طور پر خوفناک نظر آنے
والی "قوم پرست حفاظتی جماعتوں" کا اس بہانے سے خاتمہ کردیا تھا۔ کہ اب
ان کی کچھ بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد "نیشنل سوشلسٹ جرمن
ورکرز پارٹی" کا جنم بھی کسی ایسی تحریک کی سب سے پہلی علامت کہا جاسکتا
ہے۔ جسکا مقصد دوسری بورجیوس پارٹیوں" کی مانند محض مشینی طور پر گذشتہ
زمانے کے حالات پیدا کرنا نہیں تھا۔ بلکہ موجودہ ناکارہ اور احمقانہ حکومتی مشینری

اہمیت وعظمت کو کم کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ انقلابی طاقتوں کے لئے
بھی ابھی ایسا کوئی موقع نہ تھا۔ کہ وہ نئی روایات قایم کرسکتیں۔ غرضیکہ اس وقت
روایات کی تو کوئی قدر ہی باقی نہ رہ گئی تھی۔ پرانی سلطنت کی تباہی کے ساتھ
ہی اسکی قدیم شان وشوکت اور روایات کا بھی نہایت بھدے طور پر خاتمہ ہوچکا
جس کے نتیجے کے طور پر حکومت کے وقار کو بھی سخت صدمہ پہنچا تھا۔
اس طرح اس حکومتی وقار کا دوسرا ستون بھی قایم نہ تھا۔ انقلاب پسندوں
نے اپنی کامیابی کے لئے حکومت کی تمام منظم طاقت یعنی "سرکاری فوج" کے نظام کو
بھی درہم برہم کر دیا تھا۔ اور اس کا جو ٹوٹا پھوٹا غیر منظم حصہ بچ رہا تھا۔ اس سے وہ
اپنے انقلابی مقاصد کے متعلق جنگ وجدل میں کام لینے لگے تھے۔ لیکن پھر بھی حکومت
ان باغیانہ ذہنیت والے سپاہیوں کی خدمات پر کچھ بھروسہ نہ کرسکتی تھی۔ جو فوجی
خدمات کو بھی نہایت سبک سری سے دن میں آٹھ گھنٹے تک کے لئے ہی محدود
خیال کرنے لگے تھے۔ اس طرح اس انقلاب پسند جماعت اور اس کی حکومت
کو سوائے ایک سہارے کے یعنی "ہردلعزیز حمایت" کے اور وہ بھی مکمل طور پر
نہیں بلکہ قدرے کم وبیش۔ اور کوئی سہارا حاصل نہ تھا اور اسی پر وہ اپنے
وقار کی تمام عمارت کو قایم رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
اگر غور کیا جائے تو قوم کو بھی اسی طرح تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے
اسکے ایک سرے پر تو بہترین اصحاب کو سمجھئے۔ جو ہر پہلو اور ہر نیکی کے نقطہ خیال
سے بہت مضبوط راسخ الاعتقاد اور اچھے ہیں۔ خصوصاً اپنی ہمت۔ جرات
اور قربانیوں کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ دوسرے پر بدترین طبقہ یعنی
سماج کا کوڑا کرکٹ۔ جو حد درجہ خود غرض اور مطلب پرست ہوتا ہے۔ اور
اپنی ذات واحد کے سوا کسی کا بھی کچھ خیال نہیں کرسکتا۔ ان دونوں حدود

تھا۔ اور اس کا کام محض یہی تھا۔ کہ اپنے جلسوں کا انتظام اور ان کی محافظت
کرے جنہیں ان کے مخالف منعقد نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ انہیں صرف
حملوں کو روکنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ اس لئے نہیں کہ ان کے رہنما اپنی حماقت
سے یہ سمجھ بیٹھے تھے۔ کہ ہمیں صرف ربڑ کے بنتے ہوئے ان محافظ جان آلات"
کی ضرورت ہے جو سمندر میں ڈوبنے والوں کے کام آتے ہیں۔ بلکہ محض اس
لئے کہ اگر فی الحال کوئی دوسرا آدرش انکے سامنے رکھا گیا۔ تو اسے ہرگز برداشت نہ
کیا جائے گا۔ کیونکہ تاریخ عالم میں اکثر ایسا ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ بڑے بڑے
لیڈروں کا انجام کسی ناکارہ وذلیل سے انسان کے ہاتھوں خراب ہو گیا ہے۔ اسلئے
ہم اگرچہ جبر و تشدد کو اپنا مقصد و مدعا ہرگز نہ سمجھتے تھے۔ لیکن یہ بھی برداشت کرنے
کے لئے کسی صورت میں تیار نہ تھے۔ کہ کوئی طاقت اپنے جبر و تشدد کی امداد
سے ہمارے اس عظیم الشان آدرش کو کچل دے اور ملیامیٹ کر دے اور ساتھ ہی
اسکے ہم یہ بھی محسوس کرتے تھے۔ کہ ہمارے فرائض میں یہ بات بھی کسی طرح شامل
نہیں کہ ہم اس حکومت کی حفاظت و حمایت کریں جو ہماری قوم کی حفاظت کے متعلق
اپنے پاک فرائض سرانجام نہیں دیتی۔ کیونکہ ہم تو ان لوگوں کے خلاف اپنے قوم و ملک کی
حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ جو انہیں تباہ و برباد کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں
اس لئے ہمارا یہ "طوفانی ٹولہ" بھی جیسا کہ دشمن اسے کہنے لگے تھے۔ ہماری
تحریک کا ایسا ہی ایک ضروری صیغہ تھا۔ جیسے کہ پرچار و اخبارات۔ سائنٹفک
درسگاہیں۔ یا کوئی اور شعبہ۔ جو پارٹی کو اسکے مقاصد کی تکمیل میں مدد دے
رہا تھا۔ درحقیقت اس "طوفانی ٹولہ" کا حقیقی و بنیادی منشا یہ تھا۔ کہ اس
طرح ہم اپنے قومی نوجوان کو ان کی جسمانی نشوونما کے متعلق بھی مناسب تربیت
و تعلیم دے سکیں۔ تاکہ وہ مکمل طور پر ڈسپلن میں آکر نیشنل سوشلسٹ تحریک کے

کی بجائے ایک "بالکل نئی اور قوم پرست مشینری" قائم کرنا تھا۔ اور جس نے اپنے اس مقصد کیلئے مناسب سرگرمی سے کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے اس نئے خیال اور نوجوان تحریک کی اہمیت و عظمت پر اسے اتنا زبردست اعتقاد تھا۔ کہ وہ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی کو بھی بہت زیادہ خیال نہ کرتی تھی۔

تاریخ عالم میں بارہا ایسا ہی ہوا ہے۔ کہ کسی عالمگیر نئے اصول کے زبردست اور خوف انگیز پرچار کو وقتی حکومت کبھی دبانے اور کچلنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ بلکہ ہمیشہ ہی اسے اس نئے اصول کے پرچارکوں کے زبردست اور باہمت ارادوں کے سامنے ہار ماننی پڑی ہے خواہ اس سے حکومت کے ان حامیوں کے دلوں کو جو اس وقت برسر اقتدار تھے۔ کیسا بھی صدمہ کیوں نہ پہنچا ہو۔ لیکن وہ زمانہ رفتار کے راستے میں حائل نہیں ہو سکے اور نہ امور حقیقی کو ہی بدلنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس وقت چونکہ جرمنی میں مارکس ازم کا طوطی بول رہا تھا۔ اس لئے یہ دیکھتے ہوئے کہ ۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو ارباب حکومت نے بغیر کسی خاص کشمکش کے غیر مشروط طور پر مارکس ازم کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا ہے۔ وہ یہ خیال بھی اپنے دل میں نہ لا سکتے تھے کہ اتنی جلد اور ایسے غیر متوقع طور پر کوئی دوسری طاقت مارکس ازم کا بھی سر کچلنے کیلئے تیار ہو جائیگی اسلئے ان بوہیوں احمقوں نے جو وزارت کی کرسیوں پر متمکن تھے مزدوروں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی کبھی ضرورت محسوس ہی نہیں کی اور وہ "ورکرز" یا "مزدوروں" کے معنی" ہمیشہ" مارکس ازم کے اصولوں کے پیروکار ہی سمجھتے رہے

میں یہ پہلے ہی بتلا چکا ہوں۔ کہ کس طرح ہماری نوجوان تحریک نے ہر عملی مقصد کے لئے۔ لیکن بظاہر اپنے جلسوں کا انتظام قائم رکھنے کے بہانے سے آہستہ آہستہ اپنا ایک دستہ تیار کر لیا تھا۔ جو بعد ازاں ایک باقاعدہ اور منظم فوجی طاقت میں منتقل ہو گیا۔ اگرچہ شروع شروع میں یہ صرف اپنے جلسوں کا ہی محافظ سمجھا جاتا

تربیت یافتہ سپاہیوں کے فوجی نظام کو محض اس بہانے سے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ کہ اب ان کی کچھ ضرورت باقی نہیں رہی۔ گویا کہ یہی ان سب کی ان جان بازیوں اور جاں نثاریوں کا معقول و موزوں معاوضہ تھا۔ جو انہوں نے قومی عزت و عظمت کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں ظاہر کی تھیں۔ ایسی حالت میں کیا یہ کبھی امید کی جا سکتی ہے کہ کوئی بھی خوددار سپاہی ایسی حکومت کے ماتحت ملازمت حاصل کرنے کے لئے تربیت پانا پسند کرے گا۔ جس نے اپنے شاندار سپاہیوں پر تھوک کر ان کے تمغہ اور بلے نوچ کر پھینک دیئے ہوں اور ان کے فوجی جھنڈوں کو نہایت نفرت کے ساتھ پیروں میں روند کر ان کی شاندار کامیابیوں پر حقارت کی غلاظت بکھیری ہو؟ یا کیا اس حکومت نے اپنی پرانی فوج کی عزت و اہمیت کو برقرار رکھنے یا ان کی بحالی کے لئے کبھی کوئی معمولی سا بھی قدم اٹھایا تھا؟ یا ان لوگوں کو کسی طرح سے بھی کسی جوابدہی یا تلافی کے لئے مجبور کیا تھا۔ جنہوں نے کہ اپنے اختیارات کے غلط استعمال سے فوجوں کی توہین کی ہے۔ نہیں بالکل نہیں! بلکہ انہیں ترقی دے دے کر اور بھی اعلےٰ سرکاری عہدوں پر پہنچا دیا تھا۔ اور پھر سپیکر کے مقام پہ یہ ڈینگ ماری تھی۔ کہ "طاقت کے ساتھ ہی ساتھ حق بھی رہتا ہے" یعنی چونکہ آجکل تمام ملکی طاقت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جنہوں نے انقلاب برپا کیا ہے اور چونکہ یہ انقلاب بھی ملک کے خلاف ایک ذلیل ترین غداری اور تاریخ جرمنی میں سب سے زیادہ بدمعاشی آمیز فعل ہے۔ اس لئے کوئی بھی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کیوں ایک نئی اور نوجوان فوج قائم کر کے اس کی شیطانی طاقت میں کچھ اور اضافہ کیا جائے؟ اسی لئے ہر ایک سمجھدار آدمی کی عقل و فہم اس کے خلاف ہے۔

زبردست معتقد و محافظ ثابت ہو سکیں۔ اس حفاظتی دستے کی قائمی سے میرا مطلب درحقیقت یہ تھا۔ کہ چونکہ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ کسی قوم کی پوری پوری حفاظت پرائیویٹ حفاظتی انجمنوں "کے ذریعہ اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ حکومت بھی ان کی حفاظت پر نہ ہو۔ اس لئے فی الحال یہ قطعی ناممکن تھا۔ کہ کوئی ایسی طاقت پیدا کیجائے جو نمایاں طور پر نام نہاد "فوجی ڈسپلن کے ماتحت ہو۔ کیونکہ اسے وہ نہایت ضروری اختیارات تو کسی طرح بھی حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ جن کا تعلق "سزادہی" سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں اس دستے کی قائمی کا امکان محض اس طرح نظر آنے لگا۔ کہ ہمیں اس کے لئے بہت ایسے رضاکار مل گئے جو پرانے فوجی نظام کے ماتحت پوری پوری فوجی تربیت حاصل کر کے میدان جنگ میں دادِ شجاعت دے آئے تھے۔ اور یہ ایک ایسا وصف تھا۔ جو اس زمانے کے دوسرے "حفاظتی دستوں" میں بالکل مفقود تھا۔

اگر یہ بھی فرض کر لیا جاتا کہ باوجود مشکلات کے کوئی جماعت چند ایسے جرمنوں کو جو اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے ہر طرح موزوں و مناسب ہوں صحیح معنوں میں فوجی تعلیم و تربیت دینے میں کامیاب بھی ہو جائے گی۔ تب بھی تو اس وقت تک اس کا نتیجہ صفر کے ہی برابر ہوتا۔ جب تک ملکی حکومت کو یہ بات پسند نہ ہو۔ جو اس خیال کے قطعی خلاف تھی۔ بلکہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ کیونکہ حکومت کا مدعا تو ہر طرح ملک و قوم کی طاقت کو کمزور کرنا تھا۔ جو اس تحریک کے مقاصد سے بالکل ہی نہیں مل سکتا تھا۔ آج بھی تقریباً یہی حالت تھی۔ کیونکہ کیا حکومت کے لئے یہ کوشش محض مضحکہ خیز نہ ہوتی کہ وہ دس بارہ ہزار سپاہی ایسے بالواسطہ اور نیم پوشیدہ طریقوں پر تیار کرتی ۔ حالانکہ آج سے پھر چند سال پہلے ہی اس نے نہایت شرمناک طور پر پانچ لاکھ اعلےٰ

جانتے تھے۔ کہ ہمارے کام کے لئے زہر خورانی۔ چھرے کی نوک یا پستول کی گولیوں سے ہرگز کوئی راستہ صاف نہ ہو گا۔ بلکہ گلی کوچے میں پھرنے والے ہر مرد و زن کے دل پر فتح۔ کامل فتح حاصل کرنے سے ہی ہمارا راستہ کھل سکے گا۔ ہم مارکس ازم کو صرف اس لئے ختم کرنا چاہتے تھے۔ کہ آئندہ گلی کوچوں کی نگرانی اور حکومت نیشنل سوشلسٹوں کے ہاتھوں میں آ جائے جیسے کہ اب آہستہ آہستہ آ بھی رہی ہے۔ اور آئندہ بھی روز افزوں آنے کی امید ہے۔

خفیہ انجمنوں سے ایک اور بھی خطرہ یہ ہے۔ کہ ان کے ممبر اپنے کام کی اہمیت و عظمت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے اور یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ صرف ایک یا دو قتل و خون سے ہی ہماری قومی تحریک ایک شاندار کامیابی حاصل کرے گی۔ یہ خیال صرف اسی صورت میں کسی قدر حق بجانب خیال کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ قوم کسی ایک غیر معمولی طور پر لائق و قابل شخص کے جور و ظلم کا شکار ہو۔ نہ کہ ایسی حالت میں جبکہ لنکا میں ہر ایک باون گز کا ہو۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ کہ کہیں خفیہ انجمنیں قائم ہو جانے پر ان کے ممبر یا مختلف تاریخی نظائر سے متاثر ہو کر دشمنانِ ملک سے انتقام لینے اور ان کا خاتمہ کرنے کو ہی اپنی حد سے بڑھی ہوئی قومی بدقسمتی کا علاج نہ سمجھ بیٹھیں۔ اور اسی کو اپنی قومی مصائب دور کرنے کا ایک ذریعہ نہ خیال کر لیں۔ کیونکہ ایسی سب کوششیں خالص حماقت کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتیں۔ اس لئے کہ مارکسسٹ فتوحات کا باعث کسی ایک سربرآوردہ نمایاں شخصیت کی غیر معمولی قابلیت تو تھی ہی نہیں۔ بلکہ ہمارے بورجیوس (درمیانے) طبقے کی اپنی ناقابل اندازہ نالائقی

مزید برآں اگر حکومت۔ جیسی کہ آج کل ہے۔ حفاظتی دستوں کی تربیت کے کام کو اپنے ہاتھوں میں لے بھی لیتی۔ تو بھی اس سے یہ امید ہرگز نہ کی جا سکتی تھی۔ کہ وہ اپنے ان دستوں کو حدود ملک سے باہر کسی قومی مفاد کی حفاظت میں استعمال کرے گی۔ یا ملک کے اندر بھی ایسے اشخاص کے خلاف کام میں لائیگی۔ جو عوام پر جور و تشدد روا رکھ کر قومی مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اور قوم کے غیظ و غضب کو بھڑکا رہے ہیں اسی لئے ہم نے بھی اپنے "طوفانی دستوں" کا بظاہر کسی فوجی نظام سے کوئی تعلق نہیں رکھا اور انہیں خالصاً نیشنل سوشلسٹ تحریک کی حفاظت و پرچار کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے نام نہاد "حفاظتی انجمنوں" سے بالکل ہی مختلف کاموں میں مصروف رکھا اور نہ انہیں کسی طرح سے کوئی خفیہ سوسائٹی ہی ظاہر ہونے دیا۔ کیونکہ خفیہ جماعتوں کا کام پھر بھی خلاف قانون سمجھا جاتا ہے۔ اور انہیں ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

اس وقت ہمیں جس چیز کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اور اب بھی ہے۔ وہ یہ تھی اور ہے۔ کہ ہمارے مددگار سو دو سو غلط کار سازشی نہ ہوں۔ بلکہ ہزاروں اور لاکھوں ایسے سرگرم اور پر جوش جنگ آزما ہوں جو ہماری نئی عالمگیر تحریک کی حمایت میں سب کچھ برداشت اور قربان کرتے ہوئے ہر طرح کی جدوجہد کے لئے ہر وقت تیار رہیں۔ اس لئے انہیں چوری چھپے کوئی کام کرنے کی بجائے۔ کھلم کھلا۔ دن ہاڑے اور بیانگ دہل اپنی پوری طاقت و قوت سے ہر ایک کام جو انہیں کرنا ہو۔ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم یہ اچھی طرح

کو بڑھانے اور اُنہیں مزید نشو ونما دینے میں اور بھی خاص طور پر مدد کی۔ان میں سے پہلا واقعہ تو یہ تھا۔کہ ۱۹۲۲ئہ کی موسم گرما میں جب کہ سب محب وطن سوسائیٹیوں نے۔میونچ کے "کونگز پلاٹز" میں جمہوری حکومت کے" قوانین تحفظ" کے خلاف ایک عظیم الشان مشترکہ مظاہرہ کیا۔تو ہماری نیشنل سوشلسٹ پارٹی کیطرف سے بھی صرف شہر میونچ کی چھ کمپنیاں شریک ہوئیں۔ان کے پیچھے سیاسی پارٹی کے جو مختلف جتھے (سیکشن) تھے وہ ان کے علاوہ رہے۔اس موقع پر جو جلسہ ہؤا۔اس میں ساٹھ ہزار سے کم حاضری نہ ہوگی۔اور منجملہ دیگر اصحاب کے مجھے بھی اس جلسے میں تقریر کرنے کا فخر بخشا گیا یہ مظاہرہ نہایت ہی شاندار طور پر کامیاب رہا۔کیونکہ "سرخوں" کی زبردست مخالفت اور دھمکیوں کے باوجود بھی اس موقع پر ہم نے پہلی مرتبہ یہ نہایت اچھی طرح ثابت کردیا کہ میونچ کے قوم پرست بھی مناسب جرأت کے ساتھ شہر کے گلی کوچوں میں اپنا جلوس نکال سکتے ہیں۔

۲۔جب اکتوبر ۱۹۲۲ئہ میں کوبرگ کو ایک مہم بھیجی گئی تو وہاں کی بعض جرمن نیشنلسٹ سوسائیٹیوں نے وہاں بھی "یوم جرمنی" منانے کا فیصلہ کیا چنانچہ مجھے بھی اس کارروائی میں حصہ لینے کے لئے مدعو کیا گیا۔اور یہ بھی درخواست کی گئی کہ میں اپنے ساتھ کچھ اور آدمیوں کو بھی لاؤں۔چنانچہ میں نے اپنے "طوفانی دستے" میں آٹھ سو آدمیوں کو اس چھوٹے سے قصبے میں لے جانے کے لئے منتخب کیا۔جو بویریا میں شامل کر لیا گیا تھا۔اور میں ایک سپیشل ٹرین میں انہیں وہاں لے جاکر پہنچ گیا۔کوبرگ کے ریلوے سٹیشن پر منتظمان "یوم جرمنی" کے ایک وفد نے ہمارا خیر مقدم کرنے کے موقع پر مجھے یہ اطلاع دی کہ یہ تمام انتظام مقامی ٹریڈ یونینوں کے ایما سے کیا گیا ہے۔جن کا تعلق انڈیپنڈنٹ اور کمیونسٹ

وبزدلی ہی تھی۔ جس کے لئے یہ علاج کسی طرح موزوں و مناسب نہیں ہو سکتا تھا۔

اس لئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ جب ہمارے "طوفانی دستوں" کو نہ تو ایک فوجی نظام کی ہی شکل دی جا سکتی ہے اور نہ خفیہ انجمنوں کی ہی۔ تو انہیں مندرجہ ذیل اصولوں پر ہی نشوونما دی جائے۔

۱۔ ان کی تعلیم و تربیت فوجی طریق پر ہوتے ہوئے بھی اس امر کو ہمیشہ خاص طور پر مدنظر رکھا جائے۔ کہ ہماری پارٹی کی مقاصد براری کے لئے بہترین طریق عمل کیا ہو سکتا ہے؟ اسلئے اپنے ممبروں کی جسمانی قابلیت بڑھانے کے لئے فوجی قواعد پر اتنا زور نہ دیا جائے جتنا کہ مردانہ کھیلوں اور ورزشوں کی تعلیم پر اسی لئے میں معمولی سے نشانہ بازی کی مشق پر مکے بازی اور جاپانی فن پہلوانی "جیو جتسو" کو ہمیشہ قابل ترجیح سمجھتا رہا ہوں۔

۲۔ طوفانی دستوں کو خفیہ جماعتوں کی سی صورت اختیار کرنے سے باز رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا۔ کہ نہ صرف ان کی صددی کو ہی عام طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ اس کی اہمیت پر بھی ہمیشہ زور دیا جائے۔ تاکہ وہ تحریک کے لئے سب سے زیادہ مفید ہو سکے۔ اور ہر جگہ بسہولیت پہچانی جا سکے اور اس میں کسی طرح سے بھی کسی راز کو مدنظر نہ رکھا جائے۔

۳۔ "طوفانی دستوں" کی ساخت اور ان کے نظام میں پرانے فوجی قواعد و ضوابط پوشاک و لباس اور ساز و سامان کی کسی طرح بھی نقل نہ کی جائے بلکہ اس کے لئے ایسی ایسی نئی باتیں اور نئی چیزیں سوچی اور تجویز کی جائیں جو ہمارے موجودہ منشا و مقصد کے لئے بہترین و موزوں ترین ہوں۔

بعدازاں تین واقعات نے ہمارے ان "طوفانی دستوں" کی اہمیت

ود رو مقابلہ ہونا تھا۔ وہاں سوشلزم مجلسی مساوات اور عالمگیر اخوت کے ان سچے نمائندوں نے ہمارے اوپر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ ہمارا صبر و تحمل بھی اپنی آخری حدود تک پہنچ گیا۔ پھر تو ہم نے بھی کوئی دس منٹ تک خوب دائیں بائیں۔ آگے۔ پیچھے وار پر وار شروع کر دیئے اور پندرہ منٹ میں ہی گلیوں میں کوئی "سرخ" ڈھونڈے بھی نہ ملا۔

رات کو بھی ایک زبردست تصادم ہوا۔ "طوفانی ٹولے" کے گشتی دستے ایک جگہ عین وقت پر نیشنل سوشلسٹوں کی امداد کے لئے جا پہنچے۔ جہاں کہ مخالفین نے انہیں کمزور پا کر ان پر یکدم حملہ بول دیا تھا۔ اور ان کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا بس پھر کیا تھا؛ ہمارے پہنچتے ہی سب کائی کی طرح پھٹ گئے اور لوگ دم بھاگتے ہی نظر آئے۔ اس طرح اگلے روز صبح تک باشندگان کوبرگ کے دلوں سے "سرخوں" کی وہ سب ہیبت یکدم دور ہو گئی جس کے وہ برسوں سے شکار چلے آ رہے تھے۔

اگلے روز ہم اس چوک میں پہنچے۔ جہاں کہ دس ہزار مزدوروں کے مظاہرے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن وہاں ہزاروں کی تو بات ہی کیا؟ صرف چند سو آدمی نظر آئے جو ہمارے وہاں پہنچنے پر زیادہ تر شریفوں کی مانند خاموش رہے۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں "سرخ ٹولیوں" نے جنہیں پہلے کچھ ہمارے ساتھ واسطہ نہ پڑا تھا۔ کچھ شرارت کرنی چاہی۔ مگر انہیں جلد ہی یہ معلوم ہو گیا۔ کہ ہم بھی کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں؛ پھر تو یہ بھی نمایاں ہونے لگا۔ کہ عام باشندگان شہر میں بھی۔ جو انکی دست درازیوں سے بے طرح خوفزدہ تھے۔ آہستہ آہستہ جان آ رہی ہے۔ اور بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ کہیں کہیں دوستانہ طور پر ہمارا خیر مقدم بھی کرنے لگے اور شام کو تو جب ہم وہاں سے واپس آنے لگے۔ تب تو سب نے ہی

پارٹیوں سے ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے جھنڈے لہراتے ہوئے اور بینڈ بجاتے ہوئے ایک ٹھوس جتھے کی صورت میں شہر میں داخل نہ ہونا چاہیئے (کیونکہ میں اس موقع پر اپنا بینڈ بھی لے گیا تھا۔ جس میں ۴۲ باجہ نواز تھے) مگر میں نے ان شرمناک شرائط کو ماننے سے فوراً انکار کر دیا۔ اور جن شرفا نے یہ یوم منانے کی ہمت ظاہر کی تھی۔ ان کے طریق عمل پر اظہار حیرت کرتے ہوئے پوچھا۔

"پھر آپ نے ان لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کیونکر کیا؟ اور اگر شریک بھی کیا تھا تو ان کی یہ شرط کیسے مان لی؟" بعد ازاں ان سے یہ صاف کہدیا۔ کہ "میں آپ کی یہ تجویز کسی طرح بھی منظور نہیں کر سکتا۔ اسلئے اعلان کرتا ہوں کہ میرا جتھا اپنی ٹھوس شکل میں ہی جھنڈے اڑاتا اور بینڈ بجاتا ہوا شہر میں داخل ہوگا"

چنانچہ جب ہم پلیٹ فارم سے سٹیشن کے احاطے میں نکلے۔ تو ہزاروں آدمیوں کے ایک جم غفیر نے "قاتل" "ڈاکو" "لٹیرے" "مجرم" وغیرہ وغیرہ خطابات کے پُر زور نعروں سے جن کی جرمن جمہوریت کے حامی ہم پر ہمیشہ بارش کیا کرتے تھے۔ ہمارا استقبال کیا مگر ہمارے نوجوان "طوفانی دستے" پر ان کی ان بوچھاڑوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا؟ ان کے سکون میں ذرہ بھی فرق نہ پڑا۔ وہ کامل خاموشی اور ضبط کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ اور اسی طرح عین ناف شہر میں "ہاف براہوس کیلر" کے وسیع احاطے میں جا پہنچے مقامی پولیس نے لوگوں کو ہمارے پیچھے پیچھے جانے سے روکنے کے لئے ہمارے وہاں داخل ہوتے ہی۔ احاطے کا پھاٹک بند کر کے قفل لگا دیا۔ چونکہ میرے لئے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ اس لئے میں نے پولیس سے فوراً پھاٹک کھولدینے کا مطالبہ کیا۔ کسی قدر پس و پیش کے بعد کچھ سوچ سمجھ کر پولیس نے پھاٹک کھولدیا۔ اور ہم جس راستے سے آئے تھے اسی سے اس مقررہ مقام پر پہنچ گئے۔ جہانکہ ہجوم سے ہمارا رو

جماعتوں" کو بھی اب کوئی خاص کام کر دکھانا چاہیئے۔ کیونکہ ہمیں اس کا بھی امکان نظر آنے لگا۔ کہ ہمارے "طوفانی ٹولے" جس میں اب کئی ہزار نوجوان شریک ہو چکے تھے۔ ان قومی جذبات میں مناسب حصہ لینے سے محروم نہ رکھا جائے گا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں ہم نے اس کی کایا پلٹ کر کے اسے ایک جنگ آزما فوجی نظام کی سی صورت دے دی اسی وجہ سے ہماری تحریک میں وہ سب مزید نشوونما ہو سکی جو کہ اس سال کے آخر میں عمل میں آئی +

۱۹۲۳ء کے آخری ایام میں جو واقعات رونما ہوئے۔ اگرچہ وہ بادی النظر میں کسی قدر نفرت انگیز ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب گہری نظر اور بلند خیالی سے اُن پر غور کیا جاتا ہے۔ تو انکی ضرورت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایک ہی وار میں "طوفانی ٹولے" میں واقع ہونے والی اُن سب تبدیلیوں کا خاتمہ کر دیا۔ جن سے اُن کے نظام کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے اُن واقعات نے عین اس وقت جب کہ ہم سیدھے راستے سے منحرف ہو رہے تھے۔ یہ امکان بھی ضرور پیدا کر دیا۔ کہ ہم اپنی چال بالکل ہی بدل ڈالیں اور ایک اور ہی رنگ اختیار کر لیں[1] +

علاوہ ازیں ۱۹۲۵ء میں نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی" کے نظام میں پھر کچھ اہم تبدیلیاں کرنے کی ضرورت پڑی۔ اور ان کے ساتھ ہی ساتھ "طوفانی ٹولے" کی ساخت کو بھی پھر ان ہی مضبوط اصولوں پر قائم کرنا پڑا۔ جن کا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ اور اپنی عالمگیر تحریک کی پختگی و مضبوطی کی جدوجہد میں اسے پوری طرح سے معاون و مددگار بنانے کے لئے "طوفانی ٹولے"

---

[1] یہ اشارہ نومبر ۱۹۲۳ء کے واقعات کی طرف ہے۔ جبکہ ہٹلر کو اپنے ارادوں میں ایک سخت ناکامی کا سامنا ہوئی تھی

نہایت جوش و خروش سے تالیاں بجا بجا کر ہمیں "الوداع" کہی۔ غرضیکہ ہمارے کوبرگ کے اس تجربے نے ہم پر یہ ثابت کر دیا کہ ہمارے "طوفانی ٹولے" کے ممبوں کے لئے وردی کیسے ضروری ہے! صرف ان میں ایک رفیقانہ سپرٹ" پیدا کرنے کیلئے ہی نہیں بلکہ انکے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز پیدا کرانے اور انہیں کسی گڑ بڑ اور ناکامی سے بچانے کے لئے بھی۔ کیونکہ اس وقت تک وہ اپنے بازوؤں پر صرف "بلے" یا "بازو بند" ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ مگر اب ان کی وردی میں ایک خاص نمونے کا کرتہ اور خاص ٹوپی بھی شامل کر دی گئی جو اب اچھی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ساتھ ہی اس کے ہم پر اس امر کی اہمیت بھی ظاہر ہو گئی۔ کہ ہمیں ایک خاص پروگرام کی مطابقت میں ان مقامات پر بھی باقاعدہ طور پہنچنا چاہیئے۔ جہاں کہ سالہا سال سے "سرخوں" کی اتنی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ کہ ان سے مختلف خیالات و جذبات رکھنے والے لوگ اپنا کوئی جلسہ کرکے خیالات کا اظہار ہی نہیں کر سکتے اور جب وہ کچھ ہمت بھی کرتے ہیں۔ تو انہیں مار پیٹ کر منتشر کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہاں انکی حوصلہ افزائی کرکے ان کے "آزادیٔ مجلس" اور "آزادیٔ خیال" کے حق کو پھر قائم کیا جائے۔

۴۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں ایک اور ایسا واقعہ رونما ہو گیا۔ جس کی روشنی میں مجھے اس تحریک میں کچھ تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یعنی یہ کہ سال مذکور کے ابتدائی ایام میں فرانسیسیوں نے روہر پر قبضہ کر لیا۔ جس سے بعد میں ہمارے "طوفانی ٹولے" میں بھی کچھ نہایت ضروری اور اہم نشوونما عمل میں آئی۔ یعنی روہر پر فرانسیسی قبضہ ہو جانے سے جو کسی طرح بھی غیر متوقع نہ تھا۔ ہمیں یہ ظاہر کرنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا کہ اب ہمیں بھی "برداشت" کی بزدلانہ پالیسی ترک کر دینی چاہیئے۔ اور ہماری حفاظتی

(۱۰)

فیڈرل ازم کی بیہودگی

سنہ ۱۹۱۹ء کی سردیوں میں اور اس سے بھی بڑھ کر سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں ہماری نوجوان پارٹی کو ایک ایسے سوال کے متعلق اپنی روش کا فیصلہ کرنا پڑا۔ جو کہ ایام جنگ کے دوران میں ہی ایک خاص اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ کسی پہلے باب میں بھی میں اس امر کا ذکر کر چکا ہوں۔ کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی طرف سے ایک خوفناک پرچار شروع ہو گیا تھا۔ جس سے شمالی اور جنوبی جرمنی کے باشندوں کے درمیان اختلافات خلیج بڑھ کر جرمنی کے اتحاد اور ٹھوس پن کے لئے نہایت پُرخطر علامات پیدا ہونے لگی تھیں۔ سب سے پہلے سنہ ۱۹۱۵ء میں ایسے مضامین تحریر کئے جانے لگے اور چھپے ہوئے اوراق تقسیم ہوئے۔ جنہیں جنگ کی تمام ذمہ داری پرشیا کے سر تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۱۸ء تک یہ کوشش آہستہ آہستہ نہایت ہی پُرفریب اور شرمناک طریق پر کی گئی۔ کیونکہ اپنے اس ناپاک مقصد کے لئے اس کوشش کے بانی مبانیوں نے نوع انسان کے ذلیل ترین خواص پر اعتماد کر کے شمالی و جنوبی جرمنوں کے دلوں میں نفرت و عداوت کا بیج بو دیا تھا۔ جو جلد ہی کونپلیں بھی نکال لایا۔ اس غفلت کے لئے حکومت اور فوج (خصوصاً بویرین فوج) دونوں کے ہی افسر لعنت و ملامت کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور وُہ اپنے فرض منصبی کی طرف غفلت و لاپروائی کے الزام سے کسی طرح بھی بری الذمہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ کیونکہ انہوں نے شروع

کو زیادہ تر ایک "حفاظتی آلہ" کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ قرار دیا گیا۔ کہ اسے کسی صورت میں بھی ایک خفیہ جماعت نہ بننے دیا جائے۔ بلکہ اس کے ممبروں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچا کر ان میں قوم پرستی کے خیالات و جذبات تیز کر کے انہیں نیشنل سوشلسٹ پارٹی کا ایک زبردست محافظ جتھا بنا دیا جائے +



انکا گلا گھٹنا ہی شروع نہ ہوجائے۔ اس لئے انہیں یہ بات فوراً ہی جچ گئی۔ کہ ان کے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت کا جذبہ پیدا ہونے کا جو اندیشہ ہر وقت موجود ہے۔ اسکی تیزی و تندی کم کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی بھی ترکیب نہیں ہوسکتی کہ جسطرح بھی ممکن ہو۔ اس کے رخ کو ابھی سے کسی اور طرف بدل دیا جائے۔ اتنے ہی میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور انقلاب ہوگیا تھا؟ بین الاقوامیت کے شیدائی یہودی کرٹ آئیسنر نے بویریا کو پرشیا کے برخلاف بھڑکانا شروع کردیا لیکن باقی ریش کے خلاف بویریا میں انقلاب کی آگ کو اس طرح تیز کرنے سے بھی اسے بویریا کی کچھ بھلائی مطلوب نہ تھی۔ بلکہ وہ تو صرف یہودیت کا نمائندہ تھا۔ اور اسی کی بہتری کے لئے کام کر رہا تھا۔ بویریا میں لوگوں کی وقتی ذہنیت سے فائدہ اٹھا کر انکی مدد سے جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے کردینے میں اسے بھی زیادہ سہولت نظر آتی اس لئے اس نے یہ سمجھ لیا کہ اس طرح ایک دفعہ ریش کا خاتمہ ہوجانے سے تمام ملک بہ آسانی بولشوزم کا شکار ہوجائے گا۔

ادھر بولشویک ایجنٹوں کے یہ ہتھکنڈے بھی اپنا رنگ لائے۔ کہ ہمارے فوجی دستوں نے مختلف علاقوں میں عوام کو دشمنوں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے یا آزادی دلانے کے لئے پرشین افواج کی فتوحات کے نام سے مشہور کر دیا۔ اور یہ ظاہر کیا۔ کہ یہ فتوحات پرشین فوجوں کو دشمنوں پر نہیں۔ بلکہ پرشیا اور اسکے فوجی غلبے کی پالیسی کے مخالفوں پر حاصل ہوئی ہیں۔ حالانکہ اسوقت بویرین لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخابات کے موقعہ پر میونچ میں کرٹ آئیسنر کے حمایتیوں کی تعداد دس ہزار بھی نہ تھی اور کمیونسٹ تو تین ہزار سے بھی کم تھے۔ ہاں کمیونسٹ جمہوریت کے ٹوٹ جانے پر جب یہ دونوں پارٹیاں مل گئیں۔ تب انکے ممبروں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ کے قریب ضرور پہنچ گئی۔

میں نے اپنی عمر بھر میں کبھی ایسے غیر ہردلعزیز کام میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ جیسا کہ

میں اس شرارت کو کچل ڈالنے کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ بلکہ برخلاف اس کے انہیں سے بعض نے تو اسکی طرف اپنی کسی زبردست ناراضگی کا بھی کوئی اظہار نہیں کیا۔ اور شاید یہ بھی نہیں سوچا۔ کہ ان کی یہ غفلت جرمن جماتی کے ٹھوس پن کو کتنا کمزور کر کے فیڈریشن کے خیال کو تقویت دینے والی ثابت ہوگی +

تاریخ عالم میں شاید ہی کوئی ایسی نظیر مل سکے گی جس میں کسی ایسی پر شرارت غفلت کی سزا اس سے زیادہ سخت ملی ہو۔ جیسے کہ ہمیں ملی ہے اسکی بدولت پرشیا کی طاقت میں جو کمزوری واقع ہوئی۔ اس نے ہی تمام جرمنی کو بے جان کر کے اور جنگ کے خاتمے کو نزدیک تر کر دیا۔ جس نے صرف جرمنی کو ہی تباہ و برباد نہیں کیا۔ بلکہ دوسری ریاستوں کو بھی فرداً فرداً اس سے بہت نقصان پہنچایا +

جس شہر میں یہ مصنوعی طور پہ پیدا کردہ نفرت کی آگ بہت زور سے نمودار ہوئی وہاں ہی سب سے پہلے برسر حکومت شاہی خاندان کے خلاف بغاوت وانقلاب کے شعلے بلند ہوئے۔ اس لئے اس سلسلے میں یہ خیال کرنا شاید غلط ہو۔ کہ اس صورت حال کی تمام ذمہ داری مخالفین کے زہر آلود پروپیگنڈے کے ہی سر ہے ہمارے محکمہ جنگ کی تنظیم کرنے والوں کا بھی اسمیں بہت کچھ قصور ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس بارے میں ایسے ناقابل یقین بلکہ کامل طور پر مجنونانہ و احمقانہ طریقے استعمال کئے جنکا نتیجہ پرشیا کے خلاف نفرت وحقارت کا جذبہ پیدا ہونے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسطرح انہوں نے صریحی بددیانتی سے سلطنت کی تمام طاقت و قوت کا مرکز برلن کو تباہ دیا +

ادھر یہودی اتنے عیار و مکار تھے۔ کہ ان کی تیز نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ کہ انہوں نے اس وقت "انجمن ہائے جنگ" کے پردے میں ملک کو لوٹنے کی غرض سے جو شرمناک مہم شروع کر رکھی ہے اسکی مخالفت بھی لازمی ولابدی ہے لیکن اس مخالفت کو وہ اسوقت تک کچھ خطرناک نہ سمجھتے تھے۔ جب تک کہیں سے

پرشین سلطنت کو توڑ پھوڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منتشر کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ وہ کسی طرح اس علیحدگی پسندی کی رغبت کی حمایت یا تائید ہی کر سکتا ہے اس سے تو اور بھی زیادہ ناقابل قیاس ہے۔ کہ ان نام نہاد حامیان فیڈریشن نے پرشیا کے اس عنصر سے ؟ جسے نومبر کی جمہوریت کا کسی طرح حامی سمجھا جا سکتا ہو۔ کیونکہ ان کے حملے اور بدگوئیاں کسی طرح بھی " ویمر کنسٹی ٹیوشن " کے جنم داتاؤں پر جن میں زیادہ تر جنوبی جرمن اور یہودی ہی شامل تھے۔ عائد نہیں ہو سکتی تھیں۔ بلکہ یہ تمام مال پرانے قدامت پسند پرشین لوگوں ہی کے خلاف تھیں۔ جو ویمر کنسٹی ٹیوشن " کے سر بسر مخالف تھے۔ اسلئے ہمیں یہ دیکھ کر کچھ بھی تعجب نہ ہوتا تھا۔ کہ وہ یہودیوں پر کوئی حملہ نہ کرنے میں خاص ہوشیاری و احتیاط مدنظر رکھا کرتے تھے۔ اور شاید یہی اس تمام معمہ کو حل کرنے کی کنجی تھی۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہودی صرف جرمنی کے قوم پرست عناصر کو ایک دوسرے کے خلاف جنگ آرا کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں یعنی ان کی یہ خواہش ہے۔ کہ قدامت پرست بویرین اور قدامت پرست پرشین آپس میں لڑ مریں۔ اور اپنی ان کوششوں میں وہ ایک بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے +

۱۹۱۸ء کی سردیوں میں ہی سیمٹک یعنی یہودی نسل کے خلاف نفرت کا جذبہ جرمنی بھر میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اور یہودی بھی اپنا وہی پرانا وطیرہ پھر اختیار کرنے لگے تھے۔ یعنی انہوں نے نہایت حیرت انگیز پھرتی سے ملک کی ہر دلعزیز تحریک کے سامنے ایک اور بحث طلب سوال پیش کر کے ان کے درمیان اندرونی مخالفت پیدا کر دی غرضیکہ الٹرا مونٹیس رومن کیتھولک عقائد کا مسئلہ پیدا ہو جانے کے بعد اس کے مختلف پہلوؤں پر آپس میں بحث مباحثہ چھڑ گیا۔ اس سے بآسانی یہ امکان پیدا ہو گیا۔ کم از کم کچھ عرصہ کے لئے عوام کی توجہ

یہ مخالفین پرشیا کے جوش و خروش کی مخالفت کا کام تھا۔ نیم کمیونسٹی عہد میں جب ہمارا پہلا جلسہ میونچ میں منعقد ہوا۔ تب وہاں باقی جرمنی کے عموماً اور پرشیا کے خلاف خصوصاً یہ جوش و تنفرت اتنے سخت زوروں پر تھا۔ کہ اگر کوئی جرمن اس جلسے میں شریک بھی ہو۔ تو اسکی جان سخت خطرے میں کہی جا سکتی تھی۔ جلسے میں ہر طرف یہی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کہ پرشیا کا خاتمہ کر دو۔ پرشین کو نکال دو۔ پرشیا مردہ باد۔ وغیرہ وغیرہ جرمن ریشتاغ میں ایک بویرین ممبر نے اپنی تقریر کا خاتمہ ان جنگجویانہ الفاظ پر کیا تھا۔ کہ میں ایک بویرین کی حیثیت سے مرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ بہ نسبت اس کے کہ ایک پرشین کی حیثیت سے زندہ رہ کر لڑتا رہوں +

اس خیال کے خلاف شروع شروع میں جو جنگ میں نے تن تنہا شروع کی اسمیں میرے کئی محاذ جنگ کے ساتھی بھی بعدازاں میرے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور پھر تو جلد ہی ہماری نوجوان پارٹی نے بہ حیثیت مجموعی اس کی حمایت اپنا ایک متبرک فرض سمجھ لیا اور آج میں نہایت فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ ہم صرف اپنے ہمخیال و بہترین دوستوں کی مدد سے ہی آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر اس تحریک کا۔ جو حماقت اور غداری کا ایک مجموعہ کہلا سکتی تھی۔ خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو سکے +

یقیناً یہ صاف ظاہر ہے کہ پرشیا کے خلاف اس تحریک کا فیڈریشن کے خیال کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس خیال سے فیڈریشن کے متعلق سرگرمیاں شروع کرنا۔ کہ انکی بدولت ایک دوسری ٹھوس اور مرکب ہستی میں انتشار پیدا ہو کر وہ ٹوٹ پھوٹ ہو جائے گی۔ کسی طرح بھی مناسب و معقول نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بلکہ سراسر نامعقول و نامناسب ہی تھا۔ کیونکہ فیڈریشن کے ایک سچے اور صداقت پسند حامیوں کی نظروں میں ایک مشترکہ سلطنت کے متعلق بسمارک کا تخیل بھی کسی طرح محض ایک ایسی لفظی بات ٹھہر سکتا۔ کہ وہ ایک ہی سانس میں بسمارک کی اس قائم و مکمل کردہ

ہی یہ معلوم ہو گیا تھا۔ کہ قوم پرستوں کی تحریک کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے
کہ وہ رومن کیتھولک عقاید کی مخالفت کرے۔ وُہ اس مخالفت کو مٹانے کی بجائے
قوم پرستی کی تحریک کو توڑنے پھوڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسلئے میں اطلاعاً
یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ کہیں کوئی ناتجربہ کار نوجوان یہ نہ سمجھ بیٹھیں۔ کہ
ہماری قوم پرست تحریک وُہ سب سے بڑا جادو کر دکھائیگی۔ جو بسمارگ سے
بھی نہیں ہو سکا۔ اس لئے نیشنل سوشلسٹ تحریک کے لیڈروں کا یہ سب سے
بڑا فرض ہے۔ کہ وُہ کسی ایسے مذہبی جھگڑے میں ہرگز شریک نہ ہوں۔ بلکہ اسکے
متعلق اگر کوئی کوشش کی بھی جائے۔ تو اسکی زبردست مخالفت کریں۔ اور جو
لوگ یہ رغبت ظاہر کریں۔ انہیں فوراً پارٹی سے خارج کر دیں۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کی
موسم خزاں تک ہمیں اس پالیسی میں برابر کامیابی بھی حاصل ہوتی گئی تھی۔
یعنی پرجوش پروٹسٹنٹ اور پرجوش کیتھولک بغیر کسی مذہبی روک ٹوک کے مناسب
سرگرمی کے ساتھ برابر پہلو بہ پہلو کام کرتے رہے تھے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جمہوریت امریکہ کی ریاستوں نے وہاں کی یونین
یعنی مشترکہ حکومت کو جنم نہیں دیا۔ بلکہ یونین نے اُن مختلف ریاستوں کو جنم دیا
ہے۔ اور یہ حقیقت ان حقوق سے ظاہر ہے۔ جو ان مختلف ریاستوں کو اُنکی یونین
میں حاصل ہیں۔ حالانکہ وُہ اپنے رقبہ کی وسعت کے لحاظ سے ایک براعظم کے قریب
ہے۔ مگر پھر بھی یہ حقوق سب کیلئے بالکل یکساں ہیں۔ اسطرح امریکن ریاستوں
کی اس یونین کا ذکر کرتے ہوئے کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا۔ کہ ان میں سے کسی ایک
ریاست کو دوسری پر کوئی فوقیت حاصل ہے یا کنسٹی ٹیوشن کے لحاظ سے کسی ایک
ریاست کو دوسری پر کوئی فوقیت حاصل ہے یا کنسٹی ٹیوشن کے لحاظ سے کسی ایک ریاست کو
دوسری کی نسبت کچھ زیادہ بہتر حقوق و اختیارات ادا کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن جرمنی

یہودیوں کی شرارتوں کی طرف سے ہٹ جائے۔ اور جو حملہ اُن کے خلاف مرکوز ہو رہا تھا۔ وہ ٹل جاتے۔ جن لوگوں نے اس سوال پر ہماری قوم میں یہ زہر پھیلایا تھا اس کی تلافی ان کے بھی ہاتھوں سے باہر ہو چکی تھی۔ مگر وہ اپنی اس کامیابی پر خوش تھے۔ اور پروٹسٹنٹوں نیز کیتھولکوں کو آپس میں دست گریباں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے کیونکہ وہ صرف آریہ نسل کے ہی دشمن نہ تھے۔ بلکہ عیسائیت اور انسانیت کے بھی بدخواہ تھے +

اُف! خداوند کریم کے لطف و کرم سے ایک وقت دنیا میں جو عجیب و غریب شرلفیانہ سلسلہ ظہور پذیر ہوتی تھی۔ اس کی افسوسناک تباہی و بربادی کو دونو ہی عیسائی فرقے کمال لاپرواہی و بے تعلقی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ اور اب دنیا کے مستقبل کے متعلق یہ اصول درپیش ہو گیا تھا۔ کہ صرف پروٹسٹنٹ عیسائی ہی نہیں بلکہ کیا تمام نسل بھی جو جرمنی میں مقیم تھی۔ اب اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکیگی یا اسکے خاتمے کے دن ہی نزدیک آگئے ہیں۔ کیونکہ آج اس کی دونو شاخیں اپنی آریہ نسل کے جانی دشمنوں کے خلاف نہیں۔ بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہی ایک نہایت زبردست تباہی خیز اور برباد کن جنگ میں مصروف تھیں +

چونکہ جرمنی میں اس امر کی اجازت نہ تھی۔ کہ خاص کیتھولک یہ پروٹسٹنٹ کی مانند یہاں بھی ان مذہبی سوالات پر کھلم کھلا لڑائی جھگڑے کھڑے کئے جائیں۔ اس لئے یہاں جب کسی فریق کے سیاسی لیڈروں کے خیالات کی فریق ثانی کی طرف سے مخالفت شروع ہوتی تھی۔ تو وہ بہ آسانی پروٹسٹنٹوں اور رومن کیتھولکوں کے مذہبی جنگ کی سی شکل اختیار کر لیتی تھی +

اس روشنی میں نظر ڈالنے سے سب حقائق اپنے متعلق خود ہی زبان حال سے شہادت دینے لگتے ہیں۔ اس لئے ۱۹۲۴ء میں جن حضرات کو اچانک

کم ہوتے گئے تھے۔ اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا۔ بسمارک کی یہ امیدیں اور اسکا منشا بھی پورا ہوتا جا رہا تھا۔ جرمنی کی شکست اور اس کے بعد شاہی حکومت کے خاتمے سے یہ نشوونما لازمی طور پر اور بھی جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اور اس سے فیڈریشن کے متعلق ریش کی خصوصیتوں کو اور بھی سخت صدمہ پہنچا۔ نیز "عہد نامہ امن" کی مجبوریوں نے تو انکا بالکل ہی خاتمہ کر دیا۔

اسکا قدرتی اور نمایاں نتیجہ یہ تھا۔ کہ تمام ممالک کی مالی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ اور جب سے جنگ میں شکست ہونے پر۔ ریش نے اسکے متعلق تمام مالی ذمہ داریوں کا بار اپنے سر پر لینا منظور کر لیا۔ تب سے تو سب ریاستوں نے اپنے رہے سہے جملہ اختیارات بھی ریش کے حوالہ کر دیئے۔ کیونکہ یہ تو کبھی خیال ہی نہیں کیا گیا تھا۔ کہ یہ سب ذمہ داریاں فرداً فرداً ریاستوں کے چندے سے پوری کی جائینگی۔ مزید براں جب یہ فیصلہ ہوا کہ ریش سب ریاستوں کی ریلوں ڈاکخانہ جات کا انتظام بھی اپنے ہاتھوں میں لے لے تب تو "عہد نامہ صلح" کی رو سے ہماری قوم کی غلامی رفتہ رفتہ اور بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

بسمارک کی سلطنت آزاد اور غیر پابند تھی۔ یعنی وہ کسی طرح بھی غیر منفعت بخش پابندی کے بوجھ سے دبی ہوئی نہ تھی۔ جیسا کہ موجودہ "ڈاز کی جرمنی" کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ بسمارک کے تمام اخراجات نہایت اہم ملکی ضروریات کی حد تک محدود تھے۔ اسلئے دیگر ریاستوں پہ کوئی فوقیت ظاہر کئے بغیر بھی مختلف صوبجات اور ریاستوں کی منظور کردہ رقوم سے ہی وہ بہ آسانی اپنا کام چلا سکتا تھا۔ اور اس امر حقیقت کی بدولت سبھی ریاستیں قدرتاً مشترکہ سلطنت کے لئے روپیہ کے حصہ دار کی حیثیت سے زیادہ مطمئن تھیں۔ کیونکہ انہیں اپنے اپنے علاقے میں پھر بھی کچھ نہ کچھ اختیارات حکومت حاصل تھے۔ اور نسبتاً اخراجات سلطنت کے لئے روپیہ کا

ہیں سبھی ریاستیں جنکے اشتراک سے جرمن سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اپنی بنیادی اصلیت کے لحاظ سے شاہی ریاستیں تھیں۔ جرمن سلطنت میں ان ریاستوں کی افرادی شرکت بھی آزادانہ رضامندی یا مساوی تعاون کی بنا پر نہیں ہوئی ہوئی تھی۔ بلکہ اسطرح ہوئی تھی کہ پرشیا کو دوسری ریاستوں پر پہلے ہی علیٰ العال ہو چکا تھا۔ مختلف جرمن ریاستوں کے قد وقامت میں بھی جو فرق ہے۔ اسکے خیال سے بھی امریکن یونین کے ساتھ ان کی مشابہت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ مختلف ریاستوں کی مشترکہ حکومت اور عدم مساوات کا اظہار کرتی ہے۔ اور نہ یہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ انمیں سے اکثر ریاستوں کے حکمرانوں یا باشندوں کو پہلے بھی اپنی حدود میں مکمل آزادی و خودمختاری کے پورے پورے حقوق و اختیارات حاصل تھے +

ماسوائے اس کے ان ریاستوں نے سلطنت میں شریک ہونے کی غرض سے اپنے حقوق حکومت کے متعلق جو دست برداری دی تھی۔ وُہ بھی بہت کچھ رضامندانہ و آزادانہ طور پر نہ تھی۔ بلکہ اکثر حالات میں تو پرشیا کی فوقیت کے باعث ہی چھن چکی تھی۔ اور پھر بسمارک کی بھی یہ پالیسی نہ تھی۔ کہ ماتحت ریاستوں کے وُہ اختیارات بحال کر دیئے جائیں۔ جن سے انہیں محروم کر دیا گیا تھا۔ بلکہ برخلاف اس کے اُس کی یہی پالیسی تھی کہ سلطنت کے نام پہ اُن سے مزید اختیارات ترک کرنے کا ہی حسب ضرورت مطالبہ کیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ کہنا بھی بالکل غلط ہو گا۔ کہ بسمارک نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا تھا۔ کہ حکومت نے وُہ تمام اختیارات تمام وکمال حاصل کر لئے ہیں۔ جن کی کہ اسے کسی آئندہ زمانے میں بھی ضرورت پڑیگی۔ بلکہ برعکس اس کے جو اختیارات اسے اس وقت حاصل کرنے مشکل معلوم دیتے تھے۔ انکا حصول اس نے کسی آئندہ وقت کیلئے ملتوی کر دیا تھا۔ اور اسطرح حقیقتاً ریش کے اختیارات روز بروز بڑھتے اور ماتحت ریاستوں کے

کیلئے سلب کئے جا رہے ہیں۔ اور اسکا باعث سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔"

"یہ ایک امر واقعہ ہے۔ کہ دنیا بھر کی تمام حکومتیں آج کل اپنی ملکی پالیسی میں ایک طرح کی یکسانیت پیدا کرنے کی سمت قدم بڑھا رہی ہیں۔ اور اس بارے میں جرمنی بھی ان سے کچھ بہت پیچھے نہیں رہ سکتا۔ لیکن خواہ یکسانیت کا خیال اور طریق عمل خصوصاً رسل و رسائل کے حلقے میں کتنا بھی قدرتی کیوں نہ معلوم دے ہم نیشنل سوشلسٹوں کا یہ فرض ہوگا۔ کہ وہ زمانہ موجودہ کی ریاستوں میں یہ نشوونما ہرگز پیدا نہ ہونے دیں۔ کیونکہ اس طریق کار کا منشا سوائے اسکے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا کہ امور خارجہ میں ایک خوفناک اور تباہ کن پالیسی کے عمل پذیر ہونے کو ممکن بنا دیا جائے اور اس کے اثرات بازگشت کو روک دیا جائے۔ اسی لئے ہماری موجودہ ریاستیں تمام صیغہ ہائے ریلوے ڈاکخانہ جات اور مالیات وغیرہ کو اپنے قابو میں لانیکی کوشش کر رہی ہے۔ بلکہ ان ذمہ داریوں کو لامحدود تک پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ ایسے تمام ذرائع اور کفالتیں اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتی ہے جو کہ اس کے قابو میں بسہولت آ سکتے ہوں۔ اسلئے ہم نیشنل سوشلسٹوں کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اس پالیسی کے عملدر برآمد کو نکلنے اور ان ذرائع کو جو اس مقصد کے لئے استعمال کئے جائیں بے اثر کرنے کی غرض سے ہر ممکن طریق پر کوشش کریں" +

جملہ اختیارات حکومت کے ایک جگہ مرکوز کر دیئے جانے کی اس زبردست مخالفت کی دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ "یہودی جمہوری ریاست" جو اس وقت درحقیقت جرمن قوم کیلئے ایک بہت بڑی لعنت بن گئی تھی۔ تمام ماتحت ریاستوں کے پیش کردہ اعتراضات کو بے اثر کر دینا چاہتی تھی۔ اور انہیں کچل کر بالکل غیر ضروری حیثیت میں ڈال دینے کے درپے تھی۔ لیکن ہماری قوم ہمیشہ سے ہی نہایت بلند پایہ اور وسیع رہی ہے۔ اس لئے ہم اس تنگدلی یا خود غرضانہ پالیسی کو کسی طرح بھی برداشت نہ کر سکتے تھے +

حصہ بھی بہت کم ادا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ کہنا واقعات کے بالکل خلاف اور قطعاً غیر دیانت دارانہ ہوگا۔ کہ اب اُن میں جتنی بھی بےچینی پھیل رہی تھی۔ وُہ سب کی سب اس مالی غلامی کے باعث تھی۔ جس کی زنجیروں سے سب ماتحت ریاستیں سلطنت کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اور ان کے اختیارات حکومت کی کمی پر ہی اس کی ذمہ داری عائد کی جاسکتی ہے۔ بلکہ اس کا ذمہ دار حقیقتاً وُہ طریق تھا۔ جس سے ریشں میں جرمنی قوم کی نمائندگی ہوتی تھی۔ اسلئے ریشں اپنی ہستی کی حفاظت کے لئے صرف عام حکومتی نقطہ خیال سے ہی نہیں بلکہ اصولاً بھی اختیارات حکومت کو روز بروز کم کرنے کے لئے مجبور تھا۔ کیونکہ یہ دیکھ کر کہ وُہ خود اپنے اقتصادی نچوڑ کی پالیسی کے زیر اثر رعایا کے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑ لینے کے لئے مجبور ہے۔ اور اگر وُہ ملک میں اپنے خلاف بغاوت کی آگ ہی مشتعل کرانے کے لئے آمادہ نہ تھی۔ تو وہ اپنے آپ کو اس امر کے لئے مجبور پاتی تھی۔ کہ شہری آزادی کے متعلق خواہ رعایا کے آخری حقوق بھی سب سلب کرلئے جائیں۔ لیکن وُہ جیسے بھی بن سکے رہ سکے اور اپنا کام چلاتی رہے +

اس لئے ہم نیشنل سوشلسٹوں کو بھی یہ بنیادی اصول تسلیم کرنا پڑا کہ وُہی مضبوط اور زبردست قومی ریشں جو ملک سے باہر اپنے شہریوں کے حقوق کی انکے وسیع ترین معنی میں حفاظت کرتی ہو۔ ملک کے اندر بھی اپنے شہریوں کو پوری پوری آزادی دے سکتی ہے۔ اور اسی صورت میں اسے اپنی طاقت کی پختگی و مضبوطی کے متعلق کوئی خطرہ نہیں رہ سکتا۔ برخلاف اس کے ایک زبردست قومی حکومت ہی یہ ذمہ داری اپنے سر پر لے سکتی ہے۔ کہ وُہ ملک میں اپنے شہریوں کے حقوق کو زیادہ سے زیادہ حد تک سلب کرکے بھی سلطنت کے تخیل کو کسی طرح کمزور نہ ہونے دے۔ اور اسکے سب شہری یہ محسوس کریں کہ ان کے حقوق محض قوم کو دنیا میں زیادہ شاندار بنانے

سے نہایت سختی کے ساتھ آزاد رکھا جائیگا ہماری آئندہ قومی سوشلسٹ حکومت کو لازمی طور پر سابقہ حکومت کی اس احمقانہ غلطی سے احتراز رکھنا چاہیئے۔ اور افواج کو کبھی کسی ایسے کام پر نہیں لگانا چاہیئے۔ جو ان کے لئے مناسب و موزوں نہ ہو۔ کیونکہ جرمن فوج کسی خاص جماعت و فرقے کی فوقیت برقرار رکھنے کیلئے کسی سکول کا کام ہرگز نہیں دے سکتی۔ وہ تو سب جرمنوں کو یہ سبق سکھلانے کے لئے ہوگی۔ کہ سب ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس طرح باہمی النفاق و نزاع کو مٹا کر قومی اتحاد و اتفاق کو ترقی دیں۔ نیز ہر ایک قومی و ملکی نوجوان کو اپنی مخصوص فرقہ داری اور جماعت پرستی کی دلدل سے باہر نکال کر مشترکہ و متحدہ قومیت کا شیدا بنائے۔ اور جرمن قوم کے دائرۂ رسوخ میں ایک موزوں و مناسب جگہ دلائے تاکہ وہ اپنے گھر شہر، صوبے یا ملک کی حدود اربعہ پر ہی اپنی نظریں جمائے رہے۔ کیونکہ ایک دن انکی حفاظت ہی اسکا اولیں اور سب سے زیادہ متبرک و مقدس فرض ہوگا۔ اسلئے کسی جرمن نوجوان کو زیادہ عرصہ تک اپنے گھر میں رہنے دینا سب سے بڑی حماقت ہے۔ اس کے لئے یہی اچھا ہے کہ اسے ملکی فوج میں بھرتی کرکے تمام جرمنی کو دیکھنے اور اس سے رشتۂ محبت قائم کرنے کا موقع دیا جائے۔ اور آج تو اسکی اور بھی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ کیونکہ آج کل جرمن نوجوان پہلے کی مانند سہولیت کے ساتھ دور و نزدیک کا سفر کرکے اپنے دائرۂ نگاہ کو وسعت دینے کے قطعی ناقابل تھے۔

اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ہمارے قومی سوشلزم کے اصول مشترکہ ملک کی کسی خاص ریاست کے سیاسی مفاد کو ترقی یا تقویت دینے کے لئے تجویز نہیں کئے گئے تھے۔ بلکہ ان سے تمام جرمن قوم کی بہتری یکجائی و مضبوطی مطلوب تھی۔ وہ تمام قوم کی متحدہ زندگی پر نظر رکھتے تھے۔ اور اس میں نئی روح پھونک کر اسے نئی اور زیادہ مناسب و موزوں شکل و صورت دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے یہ بھی ضروری تھا۔ کہ بوقت

مگر اس سے کسی کو یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ہم نیشنل سوشلسٹوں کا یہ منشا تھا کہ ریش کو ماتحت ریاستوں پر کسی طرح سے فوقیت کے کوئی اختیارات حاصل نہ ہونے چاہئیں تھے۔ کیونکہ ریش کی یہ فوقیت تو ایک مسلمہ بات تھی۔ جس کے متعلق کبھی کوئی سوال اُٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر ہمارے خیال میں حکومت تو محض ایک بیرونی شکل وصورت کا ڈھانچہ ہی ہوتی ہے۔ اصل چیز تو قوم اور باشندگان ملک ہیں۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ قومی مفاد کے مقابلے میں اور ہر چیز کا خیال ایک ادنیٰ اور ماتحت درجہ رکھتا ہے خصوصاً ہم کسی حکومت کو بھی خواہ ریش ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وُہ بھی قوم کی ایک نمائندہ جماعت ہی تو ہے کسی صورت میں بھی یہ آزادی نہیں دے سکتے۔ کہ وُہ قوم کی متابعت سے قطعاً آزاد ہو کر بہ حیثیت ایک سیاسی حکمران جماعت کے بالکل ہی مطلق العنان وخود مختار ہو جائے۔ بلکہ اس نامعقول بدعت کا خاتمہ بھی لازمی سمجھتے تھے۔ کہ ماتحت ریاستوں میں سے جو بھی چاہے۔ از خود غیر ممالک سے اپنے تعلقات قائم کر لے اور وہاں اپنے سفیر رکھنے یا بھیجنے لگے۔ کیونکہ جب تک یہ ممکن ہے۔ تب تک ہم اس امر پر کوئی تعجب نہیں کر سکتے۔ کہ غیر ممالک ہماری ریش کے ڈھانچے کو بالکل کمزور خیال کرتے ہیں۔ اور اس لئے ان کا سلوک بھی اس کے ساتھ کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں تھا۔

چنانچہ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ ماتحت ریاستوں کو اپنی حدود میں جو بھی اہمیت حاصل ہو۔ وُہ زیادہ تر ان کی اپنی تہذیب اور قومی خصوصیت کے متعلق ہونی چاہیئے۔ لڈوک اوّل شاہ بویریا کو بھی جسے بویریا کی عزت وشہرت کا سب سے زیادہ خیال تھا۔ کوئی خاص مخالفت یا عناد ہو۔ بلکہ اسے بھی ایک عظیم الشان جرمنی اور اسکی روز افزوں صنعت وحرفت کے تخیل سے دلی ہمدردی وانس تھا اس لئے ہمیں اس کی طرف سے بھی کسی خاص مخالفت کا کوئی خطرہ نہ تھا۔

ہم نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ قومی افواج کو ماتحت ریاستوں کے رسوخ واثر

پرچار اور تنظیم

(۱)

پرچار کا درجہ ہمیشہ تنظیم سے پہلے ہے۔ کیونکہ یہی ان اشخاص کے دلوں کو فتح کرتا ہے۔ جنہیں بعد میں تنظیم دے کر ایک متحد اور ٹھوس صورت میں منظم کیا جاتا ہے۔ میں ہمیشہ سے جلد بازی اور عجلت میں کسی نمائشی تنظیم کو زیر عمل لانے کا سخت مخالف بلکہ دشمن رہا ہوں۔ کیونکہ اس سے اکثر فائدے کی بجائے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ پہلے ایک خیال کا کسی خاص مرکز سے خوب پرچار کیا جائے اور پھر جو اصحاب اس پرچار سے متاثر ہوں ان میں سے نہایت غور و خوض کے ساتھ اور خوب جانچ پڑتال کر کے ان کے لیڈر منتخب کئے جائیں۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ جو شروع شروع میں کوئی خاص قابلیت یا سرگرمی ظاہر نہیں وہی بعد میں پیدائشی لیڈر ظاہر ہوتا ہے۔ اسلئے یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے۔ کہ کتابی یا اصولی علم کی زیادہ واقفیت ہی ایک کامیاب لیڈر بننا ثابت ہونے کے لئے ضروری شرط ہے۔ کیونکہ اکثر صورت حال اس کے برعکس بھی دیکھی جاتی ہے۔ یعنی جو شخص اصولوں اور قاعدوں سے اپنی زیادہ واقفیت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی ایک عظیم الشان لیڈر ثابت ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اکثر ایک ایجیٹیٹر میں وہ صفات زیادہ تر پائی جاتی ہیں جو لیڈر کے لئے ضروری ہیں۔ اس سے ان لوگوں کو تو ضرور افسوس و رنج ہوگا جو ہر سوال پر صرف قاعدہ قانون اور سائنس کے رو سے غور کرنے کے عادی ہیں۔ مگر حقیقت بہر حال حقیقت ہی ہے۔ جسے کوئی بھی چھپا

ضرورت مقررہ حدود سے بھی باہر قدم رکھنے کی ہمت و جرات کا اظہار کرتے۔ بلکہ اسے اپنا ایک حق سمجھ کر اس کے دعویدار ہوتے۔ تاکہ ملک کی آئندہ سیاسی نشو و نما کو مدنظر رکھ کر ابھی موجودہ حدود میں بھی مناسب ترمیم و تنسیخ کی جاسکتی۔ کیونکہ اس تقسیم در تقسیم اور اس کی موجودہ سختیوں کو ہم اب بھی دائمی تسلیم کرنے کو تیار نہیں +



بہترین و قابل ترین آدمیوں کو منتخب کر کے انہیں اپنی پارٹی کے سرگرم کارکن بناتی جائے۔ پرچارکوں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وُہ ہر شخص کی لیاقت، قابلیت ماہرانہ خصوصیت کیرکٹر یا کسی اور خوبی کیطرف کچھ توجہ دیں۔ اور اس کی تلاش میں سرگرداں و پریشان رہیں۔ یہ تو منتظموں کا کام ہے۔ کہ وُہ ہمیشہ مندرجہ بالا صفات کو پیش نظر رکھ کر اپنے ہم خیال عوام میں سے ایسے بہترین و معتمد ترین اصحاب کو منتخب کرتے رہیں۔ جو ان کی تحریک کی ترقی اور اس کی فتوحات ..... میں حقیقی طور پر کارآمد ہو سکیں +

اس لئے پروپیگنڈا یا پرچار کا پہلا کام یہ ہے۔ کہ وُہ آئندہ تنظیم کیلئے عوام کے دل پر فتح حاصل کرے۔ اور تنظیم کا کام یہ ہے۔ کہ وُہ اس پرچار کو مناسب جوش و خروش سے جاری رکھنے اور توسیع دینے کے لئے عوام میں سے بہترین و موزوں ترین آدمیوں کو منتخب کرتی رہے۔ پرچار کا دوسرا کام یہ ہے۔ کہ وہ اپنا نیا عقیدہ پیش کر کے پرانے و موجودہ بوسیدہ عقائد کو کھوکھلا کرتا رہے۔ اور تنظیم کا کام یہ ہے۔ کہ وُہ ان عقائد کو تہ و بالا کرنے کی طاقت حاصل کرنے کے لئے برابر جنگ و جدل جاری رکھے تاکہ اسکی بدولت وُہ اپنی تحریک کی آخری کامیابی کو یقینی بنا سکے +

تنظیم یا سنگھٹن کا ایک اور سب سے بڑا اور ضروری کام یہ ہے۔ کہ وُہ اپنے ممبروں کے حلقے میں کسی طرح بھی نفاق نہ پیدا ہونے دے تاکہ وُہ آپس میں تقسیم در تقسیم ہو کر تحریک میں کمزوری پیدا کرنے کا باعث نہ بنیں۔ اور ساتھ ہی اسکے یہ بھی خیال رکھے۔ کہ اس کے ممبران میں حملہ آور رہنے کی سپرٹ کسی طرح ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔ بلکہ برابر تیز ہوتی جائے۔ اس لئے ممبران کی تعداد میں بھی اسی عجلت کے ساتھ ضرب در ضرب کبھی نہ ہونی چاہیئے۔ کہ انہیں سنبھالنا اور منظم رکھنا ہی ناممکن ہو جائے۔ کیونکہ سرگرمی اور جرأت ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمیشہ

نہیں سکتا +

جو ایجیٹیٹر کسی خیال کو عوام کے ذہن نشین کر دینے کی قابلیت رکھتا ہے۔اس کے لئے ماہر نفسیات PSYCHOLOGIST ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ لوگوں کی دماغی حالت اور ان کے دماغی رجحان کو وقتاً فوقتاً اچھی طرح پہچان کر اس سے مناسب و موزوں طور پر فائدہ اٹھا سکے۔خواہ ویسے وُہ "کورالفاظ" ہی کیوں نہ ہو۔یعنی اور کچھ لیاقت اس میں بہت زیادہ نہ ہو۔تو بھی وُہ ہمیشہ ایک اچھا لیڈر ثابت ہوگا۔ بہ نسبت اس قاعدہ قانون اور اصولوں کے ماہر کے جسے انسانی دل و دماغ کے متعلق کچھ بھی علم نہیں۔کیونکہ لیڈر تو وہی ہو سکتا ہے۔جس میں عوام پر اپنا اثر ڈالنے کی کچھ قابلیت موجود ہو۔خیالات یا سکیمیں پیدا کرنے کی قابلیت کا لیڈری کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔لیکن جس شخص میں اصولوں کی واقفیت۔تنظیم کی طاقت اور عوام کو متاثر کرنے کی تینوں قوتیں موجود ہوں۔اس کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ وُہ تو دنیا میں نادر ونایاب ہی ہے۔اور یہی اس کی عظمت و بلندی کی خاص شان ہوتی ہے +

میں پہلے ہی تو یہ بیان کر چکا ہوں کہ میں نے اپنی تحریک کے ابتدائی ایام میں پرچار کی طرف کتنی توجہ دی تھی۔اس کا مقصد یہی تھا۔کہ پہلے اپنے نئے خیال کو عوام کی محدود اسی تعداد کے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا جائے۔تاکہ اُن میں سے وُہ لوگ نکل سکیں۔جن سے کہ آئندہ تنظیم کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔اس طریق عمل میں پرچار کا مقصد تنظیم سے بدرجہا زیادہ فوقیت رکھتا ہے۔کیونکہ پرچار کو یہ کام کرنا پڑتا ہے۔کہ کسی نئے خیال کی حمایت کرے۔تاکہ وُہ اس طرح پرچار کے ذریعہ فتح کردہ آدمیوں میں سے

واقعات ایسے رونما ہو گئے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوا۔ کہ ہماری تحریک پرچار کی رفتار کے مطابق ترقی کر رہی ہے۔ یعنی ہمارا پرچار تحریک کی نسبت نمایاں طور پر زیادہ کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ مگر تنظیم ایسی نہیں جیسی کہ ہونی چاہیئے۔

اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں ممبران نے تحریک کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی منتخب کر دی تھی۔ اور اس کا مضحکہ خیز پہلو یہ تھا۔ کہ یہ کمیٹی اسی پارلیمنٹری اصول پر منتخب کر دی گئی۔ جس کے خلاف ہماری تحریک نہایت شدومد کیساتھ جنگ وجدل کر رہی تھی۔ چنانچہ میں نے اس حماقت کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا اور چند روز بعد کمیٹی کے اجلاسوں میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ مگر اپنے طور پر آزادانہ پرچار برابر جاری رکھا۔ اور میں نے کبھی کسی اناڑی شخص کو یہ اجازت نہ دی۔ کہ وہ مجھے میرے راستے سے گمراہ کر سکتا۔ اسی طرح میں نے دوسروں کے کام میں بھی دخل دینا قطعاً چھوڑ دیا۔ لیکن جونہی کہ نئے قواعد منظور ہونے پر مجھے پارٹی کا صدر منتخب کیا گیا اور مجھے اس سلسلے میں مناسب اختیارات وحقوق حاصل ہوئے میں نے اس حماقت کا فوراً خاتمہ کر دیا۔ اور کمیٹی کے فیصلوں کی بجائے قطعاً ذمہ داری کے اصول کو ایک مرتبہ پھر قائم کر دیا۔ اس طرح تحریک کا صدر ہی اسکی تمام وکمال نگرانی کا واحد ذمہ دار بن گیا۔ پھر یہی اصول آہستہ آہستہ قدرتاً (کم از کم جہاں تک پارٹی کی عام نگرانی کا تعلق تھا۔) تحریک کی تمام اندرونی حلقوں میں کام کرنے لگا۔

ان کمیٹیوں کو جو سوائے ناقابل عمل سفارشات کرتے رہنے کے اور کچھ بھی کام نہیں کرتیں۔ بے ضرر بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ انہیں کسی اصلی کام کی سرانجام دہی میں لگا دیا جائے۔ پھر یہ دیکھ کر بے اختیار قہقہہ لگانے کو جی کریگا کہ کام سے جی چرانے والے اور محض باتیں بنانے والے ممبر کمیٹیوں سے کس طرح خود بخود غائب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور کہیں ڈھونڈے بھی نہیں ملتے۔ اس سے مجھے اسی قسم کی

ایک محدود سی فیصدی ہی ان اوصاف سے متصف ہوا کرتی ہے۔ اسلئے جو تحریک اپنی
تنظیم کے متعلق مناسب شرائط و حدود قائم نہیں کرتی۔ وہ ناپسندیدہ لوگوں کے
گھس آنے سے جلد ہی کمزور ہو جایا کرتی ہے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اگر
اور کسی لئے نہیں تو محض ذاتی تحفظ کے خیال سے ہی جب تک کہ تحریک کو اپنے
مقاصد میں کامیابی حاصل نہ ہو جائے۔ وہ نئے ممبروں کی بھرتی پر زور نہ دے۔ اور
اس کے بعد بھی بڑی احتیاط۔ ہوشیاری اور چھان بین سے کام لے کر اپنی ترقی و
توسیع کی طرف متوجہ ہو۔ صرف اسی طرح وہ اپنی تحریک کے مغز کو تر و تازہ اور
تندرست رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس امر کا بھی ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے
کہ تمام تحریک کی نگرانی اور باگ دوڑ برابر اس مغز کے ہی ہاتھوں میں رہے یعنی
وہی ایسے طریق پرچار کا فیصلہ کرے۔ جو عالمگیر ہر دلعزیزی و اعتراف حاصل کر سکے
اور وہی تمام طاقت کا خزانہ و ذخیرہ بن کر اپنے آدرش کی کامیابی و تکمیل کے لئے
ضروری سرگرمیوں کو جاری رکھے اور مناسب طور پر ان کی نگرانی کرتا رہے ✦

میں اپنی پارٹی کے پرچار کا نگران (کنٹرولر) ہونے کی حیثیت سے نہ صرف
تحریک کی آئندہ عظمت و شان کے لئے میدان تیار کرنے میں ہی محتاط رہتا تھا۔ بلکہ
تحریک کے لئے بہترین مصالحہ حاصل کرنے کی غرض سے بھی نہایت وسیع اور آزاد
خیالی سے پُر اصولوں پر عمل کیا کرتا تھا۔ کیونکہ جتنا زیادہ بلند پایہ آزادی پسند اور پُر
جوش میرا پرچار ہوتا تھا۔ اتنے ہی کمزور دل اور متذبذب مزاج اشخاص اسمیں شرکت
سے گھبراتے اور خوف کھاتے تھے۔ اور اسطرح وہ ہماری تحریک کے مغز میں گھسنے
سے باز رہ کر اُسے خراب نہ کر سکتے تھے۔ اور یہ سبھی کے لئے اچھا بھی تھا۔ چنانچہ
سنہ ۱۹۲۱ء کے وسط تک ہماری یہ تبلیغی سرگرمیاں نہایت کافی ثابت ہوتی رہیں
اور ان سے ہر طرح تحریک کی بہتری ہی ہوئی۔ لیکن اس سال گرمیوں میں چند

کی۔ کہ وہ ہماری تحریک کا کاروباری مینجر ہونا منظور کریں۔ بہت پس وپیش کے
بعد انہوں نے میری درخواست منظور کر لی۔ کیونکہ اس وقت بھی وہ ایک اچھے عہدے
پر مامور تھے جہاں آئندہ ترقی کی بھی خوب گنجائش تھی۔ مگر اس شرط پر کہ انہیں
اناڑی ممبروں کی کسی کمیٹی کے رحم پر نہ چھوڑا جائے۔ اور ایک واحد ذمہ دار مالک
کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت ہو +

اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اخبار مذکور کے عملے میں چند ایسے آدمی بھی لے لئے گئے۔
جن کا تعلق بورژن پیپلز پارٹی کے ساتھ تھا۔ وہ اپنے کام میں بہت ہوشیار تھے۔
اور بالآخر تجربہ ثابت بھی نہایت کامیاب ہوا۔ اور حقیقی قابلیت کے اس
دیانت دارانہ اعتراف کی بدولت ہماری تحریک کو اپنے ملازموں کے دلوں
پر بھی نہایت تیزی کے ساتھ اور یقینی طور پر ایک ایسی فتح حاصل ہو گئی۔
جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ بعد ازاں وہ بورژن بھی نہایت اچھے اور سرگرم
نیشنل سوشلسٹ ثابت ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے طریق عمل سے ہماری
نئی تحریک کے ساتھ اپنی سرگرم وفاداری و صداقت شعاری کا پورا ثبوت دیا۔
نیز پارٹی کی نہایت گرانبہا خدمات ادا کیں +

میں نے آئندہ دو سال میں اپنے خیالات و تجاویز کو اور بھی نمایاں طور پر عملی جامہ
پہنایا۔ اور آج جہاں تک کہ تحریک کے سب سے بڑے رہنما کا تعلق ہے۔ ان کی
پوزیشن نہایت مضبوط ہے۔ اور موجودہ مشکلات کا یہ تحریک ہی قدرتی
حل سمجھی جاتی ہے۔ ۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو ہمارے اس طریق عمل کی کامیابی
اور نمایاں طور پر ظاہر ہو گئی۔ چار سال پہلے جبکہ میں اس تحریک
میں شامل ہوا تھا۔ تو جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں۔ اس کے دفتر میں
ربڑ کی ایک مہر تک بھی موجود نہ تھی۔ مگر ۹ نومبر ۲۳ء کو جبکہ سرکاری حکم کے

ایک دوسری بڑی سنستھا یعنی ریشش کا بھی خیال ہو آیا۔ اور میں نے سوچا۔ کہ اگر وہاں بھی درحقیقت کوئی کام ہونے لگے۔ اور صرف باتیں ہی باتیں نہ ہوتی رہیں۔ تو اسکے باقی ممبر بھی کسطرح خود بخود اُڑ جائیں گے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ ہر ایک ممبر کو ذاتی طور پر اسکے کام کا ذمہ دار قرار دیا جائے +

دسمبر ۱۹۲۰ء میں ہم نے اخبار "دوئل کیشر بو باشٹر" کو خرید لیا۔ یہ ایک ہر دلعزیز اخبار تھا۔ جو اب نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی "کا ترجمان ہوگیا۔ پہلے یہ ہفتے میں دو مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ مگر ۱۹۲۳ء کے شروع میں اسے روزانہ کردیا گیا۔ اور اگست کے آخر میں اسکا حلیہ تبدیل کر کے اسکے قدوقامت اور ضخامت کو بھی بڑھا دیا گیا۔ اسوقت سے اس نے خوب شہرت حاصل کی اور اسکی ہر دلعزیزی اور بھی بڑھ گئی۔ اگرچہ یہ پہلے بھی ایک ہر دلعزیز اخبار تھا اور اسکی کافی سے زیادہ اشاعت تھی گو اسکے مضامین نہایت اعلےٰ ہوتے تھے مگر بہ حیثیت ایک تجارتی کاروبار کے اسکا انتظام ناممکن کی حد تک خراب ہو چکا تھا۔ اسکی تہ میں یہ بنیادی خیال کام کر رہا تھا۔ کہ اُسے اسکی ہر دلعزیزی کے نام پر عوام سے عطیات حاصل کر کے جاری رکھنا چاہیئے۔ یہ کبھی محسوس نہیں کیا گیا تھا کہ دوسرے اخبارات کے مقابلہ اسے بھی اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونے کے قابل بننے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اگر ایثار پسند نیک مزاج محب الوطنوں کی فیاضی کی بدولت اس کاروبار کی تاجرانہ غلطیوں۔ کمزوریوں اور لاپرواہیوں پر برابر پردہ ڈالا جاتا رہے گا۔ تو یہ ایک شرمناک فعل ہوگا +

چنانچہ میں نے ان خطرناک صورت حالات کو سمجھکر انکی اصلاح کے لئے سخت محنت کی ۱۹۱۴ء میں جنگ کے دوران میں ہی میکس امان سے میری ملاقات ہوگئی تھی۔ جو آجکل ہماری پارٹی کے عام کاروباری ڈائرکٹر ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں میں نے اپنے پرانے رفیق جنگ کی (جس سے اتفاقاً ایک دن ملاقات ہوگئی تھی) خدمت میں یہ درخواست

ٹریڈ یونین کا سوال

(۱۲)

ہماری تحریک جس سرعت اور تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی تھی۔ اسکے باعث ۱۹۲۲ء میں ہمیں ایک ایسے سوال کی طرف بھی اپنی روش کا فیصلہ کرنا پڑا۔ جو کہ ابھی تک کچھ بہت صاف نہ ہو چکا تھا۔ اس مسئلہ کا مطالعہ کرتے ہوئے۔ کہ ہماری تحریک عوام کے دلوں پر نہایت ہی تیزی اور سہولیت کے ساتھ کسطرح قبضہ حاصل کر سکتی ہے ؟ بار بار یہ اعتراض ہمارے سامنے آیا ہے۔ کہ جب تک مزدوروں کے پیشہ وارانہ اور اقتصادی حالات و مفادات کا حل اور انکی تمام سیاسی انجمنوں کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جو ہم سے بالکل مخالفانہ رائے رکھتے ہیں۔ تب تک وُہ ہماری تحریک کے ساتھ تمام و کمال طور پر کیسے وابستہ ہو سکتے ہیں ؟" +

اس سے پہلے بھی میں ٹریڈ یونینوں کے مقاصد ان کے کام اور ان کی ضرورت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں۔ کہ جب تک سرکاری قوانین وغیرہ سے بالعموم کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یا ایک نئے آدرش کی تعلیم کی بدولت مزدوروں سے کام لینے والے ملکوں کے رویہ میں یہ

بموجب ہماری پارٹی کو خلاف ضابطہ قرار دیکر اس کی تمام مقبوضات ضبط کرکے نیلام کی گئیں۔ تو ان کی قیمت ایک لاکھ ستر ہزار طلائی مارکس وصول ہوئی۔ اس سے بڑھ کر شاندار کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے



اور اس کی ابتدا بھی محض نیستی سے بغیر ایسے آدمیوں کے کسی عملے کے از خود ہی ہو جائے گی۔ جنہیں پہلے سے ہی اس کام کی سرانجام دہی کے لئے مناسب سپرٹ میں تعلیم دی گئی ہو۔ اس لئے یہاں ہی ہمیں یہ اصول بھی ماننا پڑے گا۔ کہ کسی نمائیشی شکل وصورت کی نسبت اسکی روح یا سپرٹ بہت زیادہ ضروری چیز ہے۔ اور وہ نسبتاً زیادہ سرعت کے ساتھ پیدا کی جاسکتی ہے +

اس لئے کوئی شخص بھی اچانک ہی اپنے جزدان میں سے کوئی نیا "آئین ساخت" (کنسٹی ٹیوشن) نکال کر پیش نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی بالائی یا آسمانی حکم سے کسی ایسے آئین کو "نافذ" کیا جاسکتا ہے۔ اگر ایسی کوئی کوشش کی بھی جائے۔ تو اسکا انجام کچھ نہ ہوگا۔ اور وہ یقیناً ایک مردہ بچے کی مانند بے جان ہی پیدا ہوگا۔ اس سلسلہ میں مجھے یاد آتا ہے۔ کہ کس طرح "ویمار کنسٹی ٹیوشن" کو جنم دے کر اسے ایک نئے کنسٹی ٹیوشن کی حیثیت سے ایک نئے جھنڈے کے زیر سایہ جرمن قوم کے گلے منڈھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حالانکہ ان دونو (اس کنسٹی ٹیوشن اور اس جھنڈے) کا ہی گذشتہ نصف صدی کے دوران میں ہمارے قوم وملک سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ لہٰذا نیشنل سوشلسٹ حکومت کو بھی ایسے تمام انوکھے تجربات سے احتراز رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ اسے صرف ان ہی بنیادوں پر نشوونما حاصل ہو سکیگی۔ جو پہلے سے یہاں کام کر رہی ہونگی۔ اسلئے یہ مناسب وضروری ہے۔ کہ نیشنل سوشلسٹ تحریک اس ضرورت کو ابھی سے تسلیم کرے۔ کہ اسے اپنی علیحدہ ٹریڈ یونین قائم کرنی پڑے گی +

غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوتی۔ کہ وہ اپنے مفاد کی حفاظت کا کام خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اور اس مقصد کے لئے ملک کی اقتصادی زندگی میں کسی عہد نامے کے ایک فریق کی حیثیت سے اپنے مساوی حقوق پر پورا پورا زور دیتے ہیں۔ اور ان کے حصول کے لئے عوام سے براہ راست پُر زور اپیل کرتے ہیں۔ اُن کے اس طریق عمل کا ہماری تمام قوم کے مجلسی نظام پر نہایت گہرا اثر پڑے گا۔ کیونکہ اس بارے میں جو مجلسی بے انصافیاں اس وقت ہو رہی ہیں۔ انکی وجہ سے جان و مال کے ان نقصانات کا رد کا جانا ناممکن ہے۔ اس صورت میں ان کے آئندہ بھی وقوع پذیر ہونے کا سخت احتمال ہے۔ میں نے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا۔ کہ جب تک مالکان میں ایسے آدمی موجود ہیں۔ جو نہ صرف اپنی مجلسی ذمہ داریوں کی ہی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ انسانیت کے نہایت ابتدائی حقوق تک کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے۔ تب تک ٹریڈ یونینوں کی ضرورت بھی مسلمہ طور پر قائم رہے گی۔ اور موجودہ صورت حالات میں مجھے اس امر کا پورا پورا یقین ہے۔ کہ ٹریڈ یونین تحریک کے خاتمے کا کوئی بھی امکان نہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے۔ کہ ہماری قوم کی اقتصادی زندگی میں نہایت ہی ضروری سنستھائیں ہیں۔

ممکن ہے۔ کہ نیشنل سوشلسٹ تحریک جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ آئندہ عوام کے لئے ایک نیشنل سوشلسٹ حکومت قائم کی جائے۔ اس بارے میں کوئی بھی شک و شبہ اپنے دل میں نہ آنے دے۔ کہ آئندہ حکومت کی بنیاد ہی اس ٹریڈ یونین تحریک پر ہی رکھی جائے۔ کیونکہ یہ خیال کر لینا سب سے بڑی غلطی ہو گی۔ کہ صرف طاقت ہاتھ میں آجانے سے ہی سوسائٹی کا نظام بھی خود بخود ہی کوئی اور صورت اختیار کر لے گا۔

نیشنل سوشلسٹ کارخانہ داروں اور مالکوں کو بھی یہ معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ ان کے عظیم الشان کارخانوں اور کاروباروں کی ہستی اور نشوو نما کے لئے یہ اشد ضروری ہے۔ کہ ان کے مزدور کارکن خوش و مطمئن رہیں"۔

اس لئے ہماری اپنی نیشنل شوشلسٹ ٹریڈ یونین کو بھی دوسری یونینوں کے پہلو بہ پہلو قائم کر دینا دیوانہ پن ہوگا۔ کیونکہ سب سے پہلے تو ہمیں اس بات پر پورا پورا یقین ہونا چاہیئے۔ کہ ہمارا یہ کام ایک عالمگیر وسعت رکھتا ہے"۔ اور پھر یہ جاننا چاہیئے۔ کہ اس سے ہمارے اوپر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ نہ صرف اسی قسم کی ان جماعتوں کے متعلق جن کا منشا و مدعا ہم سے بالکل مختلف و مخاصمانہ ہے۔ بلکہ خود ہمارے اپنے ممبروں اور معاونوں کے متعلق بھی"۔ پھر ہمیں اپنی اس جداگانہ اور ضروری ہستی کے اعلان و اظہار کے لئے بھی ہر طرح تیار ہو جانا چاہیئے۔ تاکہ ہمارے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔ کیونکہ پھر ہم دوسری نسبتی خواہشات والوالعزمیوں کے ساتھ کسی طرح بھی کوئی سمجھوتہ نہ کر سکیں گے اور اپنی واحد مطلق العنان ہستی کو قائم رکھنے کے حق کے لئے ہمیں ہر طرح جدو جہد کرنی پڑے گی۔

اس طرح ہماری ٹریڈ یونین ابھی قائم کرنے کے خلاف اور بھی بہت سے دلائل ہیں۔ اور میں ہمیشہ ایسے تجربات کا نہایت سخت مخالف رہا ہوں۔ جن کی کامیابی شروع سے ہی یقینی نہ ہو۔ اور میں اسے ایک قومی جرم سمجھتا ہوں کہ غریب مزدوروں سے ان کی لہو پسینے کی کمائی میں سے کچھ حصہ کسی ایسے کام کیلئے وصول کر لیا جائے جس کی کامیابی کی بابت خود ہی کوئی پوری پوری امید نہ ہو۔ اور

لیکن ہماری یہ ٹریڈ یونین کیا ہوں گی ؟ ان کے متعلق ہمارا کام اور ہمارا مقصد کیا ہوگا - اس کے جواب میں صرف اتنا ہی سمجھنا کافی ہوگا - کہ جماعتی جنگ کا کوئی آلہ کار نہ ہوں گی - یہ صرف مزدوروں کی نمائندگی اور ان کے حقوق کی حفاظت کا کام سرانجام دیں گی نیشنل - وشلسٹ حکومت میں جماعتوں کی کوئی تمیز و تخصیص نہ ہوگی - بلکہ سیاسی نقطۂ خیال سے سبھی لوگ صرف "شہری" ہوں گے سب کو کامل طور پر مساوی حقوق حاصل ہوں گے - اور اسی طرح سب کے فرائض بھی بالکل یکساں ہونگے - اور ان کے پہلو بہ پہلو رعایا کی ایک ایسی ماتحت جماعت ہوگی - جسے سیاسی نقطہ خیال سے کچھ بھی حقوق حاصل ہوں گے +

ہماری اس ٹریڈ یونین تحریک کا ابتدائی مقصد یہی ہوگا - کہ وہ کبھی بھی جماعتی جنگ میں کوئی حصہ نہ لے - حالانکہ مارکسزم نے انہیں جماعتی جنگ کے لئے ہی ایک اوزار کے طور پر تیار کیا ہے - ساتھ ہی اس کے مارکسزم نے ایک اور اقتصادی ہتھیار بھی بنا یا ہے - جسے آزاد و مختار قومی حکومتوں کی اقتصادی بنیادوں کی تباہی کی غرض سے اور ان کی قومی صنعت و حرفت نیز تجارت اور سوداگری کو برباد کرنے کے لئے بین الاقوامی یہودی استعمال میں لاتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد ہی صرف یہ ہے - کہ کسی طرح دنیا بھر کی آزاد قوموں کو اقتصادی طور پر یہودیوں کا غلام بنا دیا جائے - جن کا اپنا نہ تو کوئی ملک ہی ہے - اور نہ کوئی حکومت یا ریاست ہی اس لئے ہر ایک نیشنل سوشلسٹ مزدور کو مادی خوشی و مسرت حاصل ہو سکے "

صلح و جنگ کی جرمن پالیسی

(۱۳)

امور خارجہ کے متعلق پالیسی میں جرمن ریشس کی کمزوری نیز صلح اور سمجھوتوں کے متعلق صحیح اصولوں کی پیروی میں اس کی ناکامیابی۔ انقلاب کے بعد بھی صرف جاری ہی نہیں رہی۔ بلکہ روز بروز بد سے بدصورت اختیار کرتی گئی۔ کیونکہ اگر امور خارجہ میں حکومت کی غلط رہنمائی کی ذمہ داری جنگ سے پہلے کے ایام میں سیاسی خیالات کی گڑبڑ اور ابتری پر ڈالی جائے۔ تو یہ کہنا پڑے گا۔ کہ بعد از جنگ اس کی تمام و کمال ذمہ داری ان لوگوں کے سر تھی۔ جنہوں نے صورت حال کو ٹھیک کرنے کے سب اختیار رکھتے ہوئے بھی۔ اس کی اصلاح کے لئے کبھی صادقانہ کوشش نہیں کی کیونکہ یہ صاف ہی ظاہر ہے۔ کہ جس پارٹی نے اپنے تباہ کن مقاصد میں انقلاب انگیزی سے کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ از سر نو ایک آزاد جرمن حکومت قائم کرنے ... کی غرض سے کسی بھی طاقت کیساتھ کوئی صلح یا سمجھوتہ کرنا پسند نہ کرتی تھی۔ اسلئے

اسلئے جس سے ہم آخر میں انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیں ۔
۱۹۲۲ء میں ہم نے جو طریق عمل اختیار کیا۔ اسکی بنیاد بھی ان ہی خیالات پر تھی۔ لیکن ہاں ہم دوسرے لوگوں نے شاید اپنی عقل و ہمت پر زیادہ بھروسہ کرکے ٹریڈ یونین جاری کردیں لیکن وہ بھی کچھ ہی مدت بعد غائب ہوگئیں ۔ اور آخر میں وہ بھی پھر اسی حالت میں رہ گئے۔ جس میں کہ ہم تھے۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ ہم نے نہ تو اپنے آپ کو ہی کوئی دھوکا دیا۔ اور نہ کسی اور کو ہی ۔



ہی ہو گی۔ اور اس سے بڑھ کر اس کی اہمیت کبھی کچھ نہ سمجھی جائے گی۔ اس لئے اُس کا آخری نتیجہ بہر حال یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے ہماری قومیت کے خیال کی حوصلہ افزائی ہو۔ اور اسے کچھ نہ کچھ تقویت ضرور حاصل ہو۔ لہذا غیر ملکی سیاسیات کے متعلق کبھی کسی تجویز پر اس نقطہ خیال کے سوا کسی اور خیال سے غور نہ کیا جائے۔ کہ اس سے ہماری قوم کے زمانہ ہائے حال و مستقبل قریب و بعید پر کیا اثر پڑے گا۔ یعنی اس سے کیا فائدہ حاصل ہونے کی اُمید کی جا سکتی ہے؟ یا کیا کچھ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے؟

ماسوا اس کے ہمیں یہ بھی سوچنا ضروری تھا۔ کہ اپنے مادر وطن کی آزادی اور اُس کی برباد شدہ طاقت و قوت کی بحالی کے لئے یہ لازمی ولابدی ہے۔ کہ ان سب علاقہ جات کو پھر حاصل کرنے کے سوال پر پورا پورا غور و خوض کیا جائے۔ جو کسی زمانے میں ہم سے چھینے جا چکے ہیں۔ لیکن مادر وطن کے لئے تمام و کمال آزادی حاصل کرنے کے اہم ترین سوال کے مقابلے میں ان علاقہ جات کے سوال کو بھی ہم فی الحال قطعی لا پرواہی سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ جو ابھی تک اغیار کے قبضے میں جا چکے ہیں۔ کیونکہ مادر وطن کی گود سے کسی جدا شدہ علاقے یا وہاں کے باشندوں کی مجبوریوں معذوریوں یا اُن پر روا رکھے جانے والے ظلم ناروا کا علاج نہ تو ان جدا شدہ بچوں کی چیخ و پکار اور اظہار و اصدار اضطراب و ناراضگی سے ہو سکتا ہے۔ اور نہ اُن بچوں کی بے قراری و پریشانی سے ہی۔ جو کہ اس وقت جبراً مادر وطن کی گود سے بچھڑ کر جیسے کیسے اپنی زندگی کے ایام بسر کر رہے ہیں۔ اس کا واحد علاج تو صرف یہی ہے۔ کہ خود وطن کی جو اپنے سب بچوں کی واحد و مشترکہ ماں ہے۔ حقیقی طاقت و قوت کو مضبوط کیا جائے۔ اور اُسے طرح مکمل و مؤثر طور پر آزاد و خود مختار کر دیا جائے۔ تاکہ وہ خود اپنے پیروں پر پختگی و مضبوطی سے کھڑے ہو کر اپنے بچوں کی حفاظت کر سکے۔ اور بچھڑوں کو ملا کر اپنے سایۂ عاطفت میں یکساں آرام و آسائش کے ساتھ جگہ دے سکے۔

جب تک ہماری نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی ایک چھوٹی سی اور ایک غیر مشہور رہی تب تک تو ہمارے دوست واحباب کی ایک تعداد کثیر کی نگاہوں میں خارجہ پالیسی کا مسئلہ کچھ زیادہ اہم و ضروری نہیں رہا۔ اور درحقیقت ممالک غیر کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے متعلق ہر جدوجہد کی ابتدا بھی لازمی طور پر اسی طرح ہو سکتی تھی کہ سب سے پہلے ان بنیادی وجوہات کو دور کیا جاتا جو میدان جنگ میں ہماری شکست اور تباہی کا باعث ہوئی تھیں۔ اور پھر ان لوگوں کو ٹھیک کیا جائے جو مصداق۔

اپنا مرنا ان کے گھر شادی ہوئی خون کے چھاپے لگے دیواریں

ہماری اس قومی بربادی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے تھے اور من مانے طور پر اپنے ہاتھ رنگتے تھے۔ بعد ازاں کسی اور طرف توجہ کی جائے

لیکن جونہی کہ ہماری ناچیز اور ناقابل توجہ سوسائٹی نے رفتہ رفتہ اپنی روز افزوں کارگذاریوں اور سرگرمیوں سے کافی اہمیت و عظمت حاصل کر لی۔ اور میدان عمل میں نمایاں طور پر پرزے نکال لئے۔ اور ہاتھ پیر پھیلائے۔ تب تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہو گیا۔ کہ وہ اس امور خارجہ کے متعلق سیاسی پالیسیوں کی طرف بھی اب کچھ توجہ دیگر ان کی نشوونما دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کی طرف متوجہ ہو اس غرض سے سب سے پہلے تو ہمارے لئے ایسے اصولوں کا فیصلہ کرنا لازمی آیا۔ جو ہمارے بنیادی تخیل سے کسی طرح بھی ٹکر نہ کھاتے ہوں۔ بلکہ ہر طرح سے ان کے معاون و مددگار ثابت ہو کر ان کی تشریح و توضیح کا ذریعہ بن سکیں۔ اس پہلو میں سب سے اول وہی خیال ہمارے سامنے آیا۔ جو ہمیشہ ہر سوال میں ہمارے پیش نظر رہتا ہے کہ یہ خارجہ پالیسی بھی ہماری ...... نظروں میں اپنا اصل مقصد حاصل کرنے کے مختلف ذرائع میں سے صرف ایک ذریعہ

کے ساتھ رشتہ اتحاد جو اس وقت عین ممکن تھا۔ قائم کرنے کی صلاح بھی نہ مانی اور ساتھ ہی اس کے روس سے امداد حاصل کرنے کے موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جب انہیں عالمگیر جنگ میں پھنسنا پڑا۔ تو سوائے بدقسمت منحوس اور رو بہ زوال ہیپسبرگ خاندان کے اور کسی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا۔

ملکہ ایلزبتھ کے زمانے سے ہی برطانی سیاسیات کی تاریخی رغبت یہ تھی۔ جس کا جواب جرمنی میں بھی پرشین افواج کی روایات کو کہا جا سکتا ہے کہ یورپ میں کسی قوم کو بھی ایک خاص درجہ سے زیادہ مضبوط و طاقتور نہ ہونے دیا جائے اور جو اُس سے بڑھتی ہوئی دکھائی دے۔ اُسے ہی اگر ضرورت ہو۔ تو فوجی طاقت سے بھی کچل کر کمزور کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے برطانیہ جو بھی ذرائع استعمال کرتا تھا۔ وہ سب حسب ضرورت مختلف ہوا کرتے تھے۔ لیکن ان سب کے پس پشت مقصد ایک ہی کام کیا کرتا تھا۔ برطانیہ کی سابق امریکن نو آبادیوں کی سیاسی آزادی کا نتیجہ ہوا۔ کہ وہ براعظم یورپ کی اقوام میں امداد اور سہارا تلاش کرنے لگا اس طرح جب سپین اور نیدرلینڈز یورپ کی شان دار طاقتیں بنتے بنتے رہ گئے۔ تو سلطنت برطانیہ نے اپنی تمام توجہ فرانس کی اُبھرتی ہوئی طاقت کو کمزور کرنے پر لگا دی۔ حتیٰ کہ نپولین کی شکست سے اُس کا بھی فیصلہ ہوگیا۔ اور اس طرح برطانیہ کے ایک زبردست رقیب کا جس کے کبھی مدمقابل ثابت ہونے کا زبردست خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ بظاہر ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

جرمنی کی طرف برطانی مدبروں کی نظر عنایت کا رُخ اس لئے بہت ہلکا تھا۔ کہ جرمنی میں اندرونی طور پر قومی اتحاد و یگانگت موجود نہ تھی۔ کہ وہ انگلستان کے لئے کسی خطرے کا باعث ہو سکتا۔ لیکن ۱۸۷۰-۷۱ء میں انگلستان نے ایک اور

اس لئے رہنمایانِ ملک کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اپنی ملکی غیر ملکی دونوں پالیسوں کو اس طرح ڈھالیں۔ کہ اُن سے مادرِ وطن کی طاقت خود بخود بڑھتی اور مضبوط ہوتی جائے۔ اور اسے ایسے جانباز و جانثار مردمیدان حاصل ہوتے جائیں جو اسکی حمایت میں اپنی تمام مشترکہ ومتحدہ طاقتوں سے ہر طرح کام لینے کیلئے ہمیشہ آمادہ و کمربستہ رہیں۔ میں اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں اس امر پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں کہ جنگ سے پہلے غیر ممالک سے صلح وسمجھوتہ کرنے کے متعلق ہماری پالیسی کیسی کمزور اور نیم دلی کی پالیسی رہی ہے۔ اور کس طرح ہم یورپ کے ہی اندر نئے علاقے حاصل کرنے کے متعلق کوئی مضبوط پالیسی اختیار کرنے کی بجائے یورپ سے باہر آبادیاں بسانے اور اپنی تجارت کو پھیلانے کی غلط پالیسی کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ اور اس میں بھی سب سے بڑی غلطی یہ تھی۔ کہ ہم یہ اُمید کرتے رہے۔ کہ اپنی اس پالیسی میں بھی ہمیں کسی خاص مسلح جنگ وجدل کے بغیر ہی کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ اور اس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ بہت سی کرسیوں پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم منہ کے بل اوندھے زمین پر آ رہے۔ جیسا کہ ایسی حالتوں میں اکثر ہوا کرتا ہے اور عالمگیر جنگ میں ہمیں اس غلط رہنمائی کا خمیازہ ایک شرمناک شکست کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ حالانکہ اس پہلو میں صحیح راستہ جو ہمارے سامنے کھلا پڑا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ہم یورپ میں ہی نئے علاقے حاصل کر کے اپنی حدود کو وسعت دینے کی کوشش کرتے رہتے۔ اور اپنی طاقت بڑھاتے رہتے۔

لیکن چونکہ ہماری اس جد امجد یعنی ہماری جمہوری پارلیمنٹ کے ممبروں نے ملکی حفاظت کے متعلق کسی باقاعدہ سکیم پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ نیز یورپ میں ہی نئے علاقے حاصل کرنے کے متعلق سب تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ اور ان کے مقابلہ میں آبادیاں قائم کرنے اور غیر ممالک میں تجارت پھیلانے کو ترجیح دی۔ انگلستان

کہ اپنی بہادری کے زعم میں آکر بھی قوم کو شکست نہ کھانے دی جائے۔ بلکہ ہر ایک عملی طریق سے فتح کے میدان میں اس کے قدم مضبوط رکھے جائیں۔ ایسی حالت میں ہر ایک سڑک جو اس منزل مقصود تک پہنچا سکے۔ وہی صحیح ہوتی ہے۔ اور اس پر قدم نہ بڑھانا ہی اپنے فرض کی طرف سے سخت لاپرواہی وغفلت ظاہر کرنے کے الزام کا جان بوجھ کر مجرم ہونا ہے۔ جو کوئی معمولی سمجھ دار انسان بھی پسند نہ کرے گا۔

جب جرمنی میں انقلاب پھیل گیا۔ تو جہاں برطانی مدبروں کا تعلق تھا۔ جرمنی کی عالمگیر عظمت کی سب دھمکیوں کا بھی اس کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا۔ لیکن یورپ کے نقشے سے جرمنی کا نام ونشان تک مٹا دینا بھی کسی طرح برطانی مفاد کے حق میں نہ تھا۔ بلکہ برخلاف اس کے نومبر ۱۹۱۸ء میں ہمارے خوفناک انجام نے برطانیہ کو ایک نئی صورت حال سے رُودررُو کرا دیا۔ جو فوراً ہی ممکن نظر آنے لگی۔ یہ جرمنی کی تباہی کے بعد یورپ بھر میں فرانس کے سب سے زیادہ طاقتور ہو جانیکا اندیشہ تھا۔ لیکن چونکہ دوران جنگ میں برطانی مدبر خود ہی عوام کے جذبات کو فرانس کے حق میں ہمیشہ سے زیادہ بھڑکا چکے تھے۔ اس لئے وہ نومبر ۱۹۱۸ء اور موسم گرما ۱۹۱۹ء کے درمیانی عرصے میں اس خطرے کے باوجود بھی فرانس کی طرف سے اپنی روش میں کوئی تبدیلی ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اب فرانس کی طاقت کو حد سے زیادہ بڑھنے سے روکنے کا صرف یہی طریقہ برطانیہ کے سامنے کھلا تھا۔ کہ وہ فرانس کی مخاصمانہ خواہشات میں خود بھی شریک ہوتا رہے۔ کیونکہ درحقیقت انگلستان جس نیت سے جنگ میں کودا تھا۔ وہ مقصد اس کا پورا نہیں ہوا تھا۔ یعنی وہ یورپ میں کسی دوسری قوم کو اپنے خاص معیار طاقت سے زیادہ مضبوط وطاقتور ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔ اور آخر وہ طاقت جرمنی کی صورت میں نہیں۔ تو فرانس کی صورت میں سہی نہایت پختہ طور پر قائم ہو گئی تھی۔

روش اختیار کرنی شروع کی۔ کیونکہ ایک طرف تو دنیا کے اقتصادیات میں امریکہ کی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ اور دوسری طرف روس بھی بہ حیثیت ایک قوم کے خاص نشو ونما حاصل کر رہا تھا۔ جس سے انگلستان ایک خاص تذبذب میں تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نے اُس کی اس حالت سے جرمنی کیلئے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ اس میں تبدیلی ہونے سے برطانی مدبروں نے اپنی ایک اُس سے بھی زیادہ مضبوط پالیسی اختیار کرلی۔

جرمنی کی تجارتی اور صنعتی ترقی دیکھ کر برطانیہ اس میدان میں جرمنی کو بھی آخر کار اپنے لئے ایک خطرہ سمجھنے لگا۔ اور اُس نے پُرامن طریق پر گھسنے کی پالیسی سے دُنیا کو فتح کرنے کا جو طریق اختیار کر رکھا تھا اور جسے ہمارے جرمن مدبر دانشمندی وتدبر کا سب سے اعلیٰ درجہ سمجھ رہے تھے۔ اُسے ہی برطانی مدبروں نے اپنی طاقت تحفظ کی تنظیم کی بنیاد بھی بنالیا۔ یہ بات حق ہے کہ اُس تنظیم تحفظ نے ہی بعدازاں ایک منظم حملے کی صورت اختیار کر بھی لی۔ برطانی مدبروں کی پالیسی کے عین مطابق تھی۔ جسکا منشا ابتدا سے ہی یہ تھا۔ کہ اس قابل اعتراض امن وامان کو زیادہ عرصہ تک قائم نہ رکھ کر دنیا میں برطانی عظمت کی دھاک بٹھانے کے لئے کوشش کی جائے۔ مزید براں یہ امر واقعہ کو برطانیہ بِن حکومتوں سے فوجی نقطہ خیال سے کسی طرح فائدہ اٹھا سکتا تھا اُن ہی سے اُس نے اپنے دوستانہ تعلقات گانٹھ لئے برطانی مدبروں کی اس واقعی دوراندیشی کے کسی طرح خلاف نہ تھی۔ جس سے وہ اپنے مخالفوں کی طاقت کا اندازہ لگاکر خاص مواقع پر ان کی کمزوریوں کا علم حاصل کیا کرتا تھا۔ برطانی نقطہ خیال سے یہ کسی طرح ناجائز بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کیونکہ ایسے مکمل طور پر ایک عظیم الشان جنگ کی تنظیم کے کام کا اندازہ کسی طرح بھی ایک بہادری کے معیار سے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ وقت اور موقع کی مناسبت وموزونیت سے ہی ہُوا کرتا ہے۔ اور اسی کو "تدبر" بھی کہتے ہیں

سکتا۔ کہ یورپ میں فرانس کی طاقت کچھ اور مضبوط ہو جائے۔ کیونکہ اس کے مستقبل کا انحصار ہی اس پر ہے۔ کہ بحیرہ روم میں اس کی عظمت قائم ہو۔ وہ جنگ میں فرانس کی طاقت بڑھانے کے لئے شریک نہیں ہوا تھا۔ بلکہ بحیرۂ ایڈریاٹک میں جو اس کے رقیب تھے۔ ان کا خاتمہ کرنے کے لئے شامل ہوا تھا۔ اسلئے فرانس کی طاقت میں جو بھی اضافہ ہو گا۔ وہی اٹلی کے مستقبل کے لئے خطرہ ہے۔ اور وہ اس دھوکے میں بھی مبتلا نہیں کہ قومی تعلقات رقابت کے زہر سے مبرا ہوتے ہیں۔

اس لئے نہایت گہرے غور وخوض سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ برطانیہ اور اٹلی دونوں کے اپنے اپنے مفاد کسی طرح بھی جرمنی کی ہستی کے خلاف نہیں۔ بلکہ کسی حد تک اس کے حق میں ہیں۔ اگرچہ جرمنی کو اور بھی زیادہ ذلیل کرنا برطانیہ کی حکومتی پالیسی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہودیوں کی بین الاقوامی اقتصادی پالیسی اس کی ضرور ہی خواہاں ہو سکتی ہے۔ برطانی حکومت کی بہتری و مفاد سے قطع نظر تمام یہودی سرمایہ پرست جرمنی کی مزید اقتصادی ذلت کے خواہاں نہیں۔ بلکہ اسکی مکمل سیاسی غلامی کے بھی متمنی ہیں۔ اس لئے یہودی جرمنی کی تباہی کے لئے سب سے بڑھ چڑھ کر ایجی ٹیشن کرنے والے ہیں۔ اُنکے خیالات کا رجحان صاف ظاہر ہے۔ وہ جرمنی کے قومی تخیل کو تباہ کر کے اور جرمن مزدوروں کی طاقت کو عالمگیر یہودی اقتصادیات اور سرمایہ پرستی کے جوئے میں جوت کر جرمنی میں بولشوزم پھیلانا چاہتے ہیں۔ اور یہی اُن کی تمام فریب آمیز بعید کی وسیع عالمگیر فتوحات کے سلسلہ میں سب سے پہلی کڑی ہے۔ ماسوا اس کے انگلستان اور اٹلی دونوں ہی ممالک میں وہاں کے خالص سیاسی تدبر کا یہودی دنیائے اقتصادیات کے مطالبات سے جتنا وسیع اختلاف ہے۔ وہ بھی ہم سے کسی طرح پوشیدہ نہیں۔ اسلئے ہمیں صرف حکومت فرانس اور یہودی

غرضیکہ آج فرانس کی پوزیشن بے نظیر ہے۔فوجی نقطہ خیال سے وہ براعظم یورپ میں سب سے زبردست طاقت ہے جس کا کوئی بھی رقیب نہیں۔اس کی سرحدیں بھی اٹلی اور سپین کے حملوں کی طرف سے قطعاً محفوظ ہیں۔جرمنی کی طرف سے اُس کی اپنی فوجیں ہی اُس کی حفاظت کرتی ہیں۔جو اس وقت دنیا میں سب سے زبردست ہیں۔جرمنی بالکل مجبور ولاچار ہے۔اس کے لمبے چوڑے سمندری ساحل بھی اس کے بیڑے کی طاقت و قوت کے باعث جو آہستہ آہستہ بیڑے سے بھی بازی لئے جا رہا ہے۔ہر قسم کے حملے سے محفوظ ہیں۔اسی لئے برطانیہ کی ہمیشہ سے یہ مستقل خواہش رہی ہے۔کہ وہ یورپ کے تمام ملک میں توازن قائم رکھے۔کیونکہ دنیا میں برطانیہ کے رسوخ و عظمت کی برقراری کے لئے یہی سب سے ضروری شرط ہے۔

لہذا انگریز امریکن یا اطالین مدبروں میں تو کوئی ایک مدبر بھی ایسا نہیں جسے کسی طرح بھی جرمنی کا حمایتی یا خیراندیش کہا جا سکتا ہو۔جو شخص بھی اُن ممالک میں سے کسی مدبر پر جرمنی کی بہتری کے لئے بھروسہ کرتا ہے۔وہ یا تو مدبر ہی نہیں کہلا سکتا۔اور اگر وہ کہلاتا بھی ہے۔تو پھر خالصاً گدھا ہے۔انگلستان ہرگز بھی جرمنی کو دنیا کی بڑی طاقتوں کی صف میں دیکھنا پسند نہیں کر سکتا۔یہی ان دونوں کا سب سے بڑا فرق ہے۔ہم بھی اُس وقت دنیا کی طاقتوں میں شمار ہونے کے لئے جدوجہد نہیں کرتے۔ہم تو ابھی صرف اپنی جدوامجد کی سرزمین کی ہستی کی برقراری اپنی قوم کے اندرونی ایجاد نیز اپنے بچوں کی روزانہ روٹی کی فکر میں ہی مبتلا ہیں۔ان حالات میں صرف دو قومیں ہی ہمارے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔جن میں سے ہمیں کوئی دوست مل سکتا ہے۔ایک برطانیہ اور دوسری اٹلی۔

برطانیہ فرانس کو اپنے مفادات کا مدمقابل دیکھنا پسند نہیں کرتا۔فرانس کی فوجی عظمت اس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔اور اٹلی بھی یہ برداشت نہیں کر

اُسے مادرِوطن کی گود میں ہی محفوظ رکھا جائے۔ کیونکہ جرمنی کے لئے جنوبی ٹیرول کی محافظت کی ضامن ویانا کے "راتھس" یا میونخ کے "فیلڈ ہرن ہال" کے جلسوں میں پرجوش اشتعال انگیز دروغ بافیوں سے بھرے ہوشیار ممبران پارلیمنٹ کی دھواں دھار تقریریں بھی کسی طرح نہیں ہو سکتی تھیں۔ بلکہ صرف وہ جانباز فوجیں ہی ہو سکتی تھیں۔ جو اُس محاذ پر سرگرم رہی تھیں۔ اور ان ہی لوگوں نے دیگر جرمن اضلاع کی فوجوں کی مانند ان میں بھی بے چینی و بے اطمینانی پھیلا کر جنوبی ٹیرول کے ساتھ غداری اور دھوکا بازی کی تھی۔ جو آج یوں بڑھ بڑھ کر اس کے لئے باتیں بنا رہے ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ شرمناک بات تو یہ ہے۔ کہ اُن باتیں بنانے والوں کو خود بھی یہ یقین نہیں کہ اُن کی صدائے احتجاج کا کچھ اثر ہوگا۔ کیونکہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ ان کی یہ سب فضول بک بک کتنی بےضرر اور بے اثر ہے۔ اور اب وہ یہ سب بکواس صرف اس لئے کر رہے ہیں۔ کہ اس وقت جنوبی ٹیرول کی حفاظت میں سربکف ہونے کی نسبت اسکے پھر حاصل کرنے کیلئے یہ بک بک کرنا بہت زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ سب کو ہی کچھ نہ کچھ کرنا تو ضرور چاہیئے۔ ہم لوگوں نے اس کی حفاظت میں اپنا خون بہایا تھا۔ تو کیا یہ اپنی زبان کی تیزی وطراری بھی اُسکے لئے نہ دکھائیں۔ اور بالکل غدار ہی بنے رہیں۔

اگر جرمن قوم اس آفت کو روکنا چاہتی ہے۔ جو اس وقت یورپ کے اُوپر منڈلا رہی ہے۔ تو پھر اُسے اُسی غلطی میں ہرگز نہ پھنس جانا چاہیئے۔ جس کی کہ وہ گذشتہ جنگ سے پہلے مرتکب ہوئی تھی۔ اور اس طرح اپنے آپکو خدا اور دنیا دونوں کا ہی دشمن نہ بنا لینا چاہیئے۔ بلکہ اُسے سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا چاہیئے۔ کہ اُسکا سب سے زیادہ خوفناک اور خونخوار دشمن کون ہے۔ اور پھر اپنی تمام

سرمایہ داروں میں ہی جو سٹاک ایکسینچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک گہرا سمجھوتہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اس لئے بھی ہم فرانس کو جرمنی کے لئے ایک بڑا زبردست خطرہ خیال کرتے ہیں۔

لیکن ہم نیشنل سوشلسٹوں کے لئے یہ بھی آسان نہیں۔ کہ ہم برطانیہ کو اپنا ایک ممکن دوست ہی سمجھ لیں۔ ہمارا یہودی پریس اور اُس کی دیکھا دیکھی کئی ایک کوڑھ مغز اور بے وقوف جرمن قلم قصائی بھی یہاں برطانیہ کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہیں۔ اور جرمن بڑے کو طاقتور بنانیکی باتیں بنا رہے ہیں۔ ہماری نوآبادیاں کے چھینے جانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے یہ آواز اٹھا کر کہ ہمیں انہیں پھر حاصل کرنا چاہیئے۔ یہودی بدمعاشوں کے ہاتھوں میں کھیلتے انگلستان کو اور بھی زیادہ ہمارے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے ان کوتہ اندیش مدبروں کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے۔ کہ ہمیں ابھی اپنی بحری طاقت کی بحالی کیلئے جدوجہد کرنیکی کچھ ضرورت نہیں۔ کسی روسی جنگ سے پہلے اس مقصد کیلئے اپنی قومی طاقت کو ضائع کرنا بھی ایک حماقت ہی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے ہمیں یورپ میں اپنی کھوئی طاقت کو یقینی طور پر مضبوط بنا لینا چاہیئے۔ اور حالات موجودہ میں تو اس قسم کی خواہش کو اپنے دلمیں جگہ دینا بھی اس قسم کی حماقتوں میں شامل ہوگا۔ جنہیں کہ مجرمانہ کہا جاتا ہے۔

یہاں میں خاص شرارت کا کچھ ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ جسے گذشتہ چند سال سے یہودی نہایت ہوشیاری اور دانائی سے پیدا کر رہے ہیں۔ وہ ہے۔ جنوبی ٹیرول کے متعلق! سب سے پہلے میں اس بارے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں اُن آدمیوں میں سے ایک ہوں۔ جنہوں نے کہ اگست ۱۹۱۴ء سے نومبر ۱۹۱۸ء تک جب کہ ٹیرول کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ اس کی خدمت میں کچھ حصہ لیا تھا۔ اسلیئے نہیں کہ اُسے دُشمنوں کے حوالہ کر دیا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ جب ممکن ہو

جا سکتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی شرم و ذلت سے جرمنی کے چھ کروڑ مردوں عورتوں کے دلوں میں اپنے دشمنوں کے خلاف حقارت کی آگ کا ایک بحرِ ذخار شعلہ زن ہو اٹھتا۔ اور ان کے دلوں میں ایک فولادی قوتِ ارادی پیدا ہو کر وہ سب یک زبان ہو کر چلا اُٹھتے۔ کہ ہم بھی دوسری قوموں کی مانند مسلح ہوئے بغیر کبھی آرام و اطمینان سے نہ بیٹھیں گے"۔ لیکن افسوس کہ ہماری مہربان حکومت نے سب موقعے ہاتھ سے کھو دیئے۔ اور کچھ بھی نہیں کیا۔ ان حالات میں پھر تعجب ہی کیا ہے۔ اگر ہماری قوم کی وہ حالت اور وہ عزت نہیں؟ جو کہ ہونی چاہیئے۔ اور جسے وہ بہ آسانی حاصل بھی کر سکتی تھی۔

ایک ایسی قوم جو اس ذلیل حالت میں ہو۔ جس میں کہ ہم ہیں۔ اُسے دنیا بھر میں کون سا ایسا آزاد ملک ہو گا۔ جو اس قابل سمجھے گا۔ کہ اسکے ہاتھ کوئی عہد نامہ کیا جائے۔ تاوقتیکہ اسکی حکومت اور رائے عامہ سربکف ہو کر یہ ظاہر نہ کر دے۔ کہ وہ پوری پوری آزادی حاصل کرنے اور اسے ہر طرح برقرار رکھنے کی غرض سے ہر طرح جنگ وجدل کے لئے آمادہ و کمر بستہ ہے۔ اسلئے ابھی اپنے جنگی بیڑے اور اپنی نو آبادیوں کی بحالی کیلئے سب چیخ و پکار صریحاً بے سود ہے۔ کیونکہ اسکے عملی امکان و تکمیل کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آتی۔ جو یہ شور و غوغا مچا رہے ہیں۔ وہ خدا اور باقی دنیا کے سامنے ایسے فضول مظاہرات میں اپنا وقت و طاقت ضائع کر رہے ہیں۔ جنکا نتیجہ سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ حصول کامیابی کے اس پہلے اور نہایت ضروری اصول کو ہی بھول رہے ہیں۔ یا نظر انداز کر رہے ہیں کہ جو کچھ بھی کرو جی جان سے اور اپنی پوری پوری طاقت و جرأت سے کرو۔ پانچ یا دس حکومتوں کے برخلاف پھونک پھونک کر ہم اپنی قومی قوت ارادی۔ جسمانی کوششوں اور تمام طاقتوں کو اپنے زبردست اور پرجوش دشمنوں کے خلاف کرنے کے موقعوں کو

طاقت کو اُسی کے خلاف مرکوز کر دینا چاہیئے۔ اگر جرمنی نے یہ طریق عمل اختیار کیا
آئندہ نسلیں بھی ہماری اُن عظیم ضروریات اور انکی تکمیل کے متعلق ہمارے فکر و اضطراب
کو کچھ محسوس کر کے ہمارے اُن جانبازانہ ارادوں کی اور بھی زیادہ تعریف کرینگے۔
جب کہ وہ یہ دیکھیں گے۔ کہ اُن کی بدولت ہم نے کیسی شاندار کامیابی
حاصل کی ہے۔

سچ پوچھو تو جرمنی کی تباہی و بربادی کا اصل باعث ہیپسبرگ حکومت آسٹریا
کی مُردہ لاش کے ساتھ اتحاد و اتفاق احمقانہ خواہش کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔
اور آج بھی ہماری کسی خارجہ پالیسی کے متعلق کوئی ناقابل عمل قیاسات و تخیلات
ہی ہماری آئندہ ترقی کے راستے میں ہمیشہ کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ثابت
ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہماری موجودہ حکومت نے قوم میں حصول آزادی کی یہ قابل فخر
سپرٹ پیدا کرنے اور ہمارے اُن مردانہ قومی ارادوں کی مخالفت میں کیا کیا کچھ
کیا ہے۔ یہاں اس پر کچھ غور و غوض کرنا بھی کسی طرح بے محل نہ ہوگا۔

۱۹۱۹ء میں جب جرمن قوم کی گردن پر عہد نامہ صلح کا بارگراں لدرہا تھا۔ اس
وقت تو یہ اُمید کرنا کچھ حق بجانب بھی ہو سکتا تھا۔ کہ اس دستاویز جبر و تشدد کے
خلاف ہمارے نالہ و فریاد کرتے رہنے سے حصول آزادی کیلئے جرمنی کی چیخ و پکار
کو ضرور کچھ نہ کچھ مدد ملے گی۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ وہ صلحنامے ہی جو
ایک زبردست قوم کے لئے وبال جان ہوتے ہیں۔ اُس کی آئندہ ترقی اور اُسے
از سر نو زندگی بخشنے کے لئے سب سے بڑے معاون ہوتے ہیں۔ اور اسکے حصول آزادی
کے لئے نقارے کی پہلی چوٹ بن جاتے ہیں۔ اس طرح ہم بھی عہد نامہ ورسیلز سے کتنا
فائدہ اٹھا سکتے تھے :

اس کی ہر ایک بات قوم کے دل و دماغ پر گرم جلتے ہوئے لوہے کی مانند داغ

طرح برطانی حکومت کے نمائندوں اور یہودی دنیا کی ڈکٹیٹری کے درمیان عرصہ دراز سے برابر ایک زبردست کشمکش جاری ہے۔ اور جنگ کے بعد پہلی مرتبہ نمایاں طور پر یہ ظاہر ہوا ہے۔ کہ جاپانی سوال پر برطانی اخبارات اور حکومت کے درمیان رہنمائی کے لئے آپس میں کیسی کھینچ تان ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح جنگ ختم ہوتے ہی امریکہ اور جاپان میں بھی ان کی پرانی کشاکشی ازسرِنو شروع ہو گئی ہے۔ اور تو اور بین الاقوامی اقتصادیات دسیاسیات کے میدان میں امریکہ بھی جو صلحنامے اور عہدنامے کرتا ہے انہیں بھی انگلستان اپنے تمام رشتہ دارانہ ویگانہ تعلقات کے باوجود نہایت رشک آمیز نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ انگلستان کیوں اتنے غور و فکر کے ساتھ اپنے پرانے احباب اور حلیفوں کی فہرست پر نظر دوڑا رہا ہے۔ اور نہایت پرخوف نظروں سے اُس دن کی آمد کا انتظار کر رہا ہے جبکہ دنیا کے سمندروں پر..... "برطانیہ اعظم" کی بجائے امریکہ کا بول بالا ہو گا۔

غرضیکہ جرمنی کو اس طرح تباہ و برباد کرنے میں برطانیہ کا اتنا بھلا نہیں تھا۔ جتنا کہ یہودیت کا بالکل اسی طرح جیسے آج جاپان کی تباہی سے برطانی مفاد کو کسی صورت میں اتنا فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ جتنا کہ یہودیوں کی مجوزہ وسیع وعالمگیر اقتصادی سلطنت کو جس کی قائمی کی وہ اُمید لگائے بیٹھے ہیں۔ اس لئے جہاں ایک طرف انگریز دنیا میں اپنی موجودہ عظمت و اہمیت کو قائم رکھنے کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ وہاں دوسری طرف یہودی اپنی آئندہ اقتصادی فتوحات کیلئے اپنی تمام زیراثر طاقتوں کو تنظیم دے رہے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ نہایت اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ ہزارہا سال سے اُن کی ان ریشہ دوانیوں کو جو برداشت کیا جا رہا ہے۔ اُسکی بدولت وہ یورپ کی تمام قوموں کو اُن کی اصل سے بے اصل کرنے اور

بالکل نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ اور ہم اُن ذلیل کن شرمناک شرائط کی نظرثانی کرانے کے لئے دوسروں سے اتحاد اور میل جول پیدا کر کے اپنی طاقت بڑھانے کے ہر ایک امکان کو قربان کرتے رہے ہیں۔

یہی ہماری نیشنل سوشلسٹ تحریک کے لئے ایک مشن اور منزل مقصود بن سکتا ہے۔ اسے قوم کو یہ تعلیم دینی چاہیئے۔ کہ وہ اپنے عظیم الشان مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں معمولی اور جزوی باتوں کو نظر انداز کرنا سیکھیں اور کبھی اُن کی بنا پر آپس میں پھوٹ نہ ڈالیں۔ اور کبھی یہ نہ بھولیں۔ کہ جس مقصد کیلئے آج ہم جنگ وجدل کر رہے ہیں۔ اسی پر ہماری قومی زندگی وموت کا انحصار ہے۔ اور جس دشمن پر ہم اپنی پوری طاقت سے حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری قومی ہستی مٹانے اور تباہ وبرباد کرنے کے درپے ہے۔ ماسوائے اس جرمن قوم کو اسوقت تک دنیا کی باقی طاقتوں سے کوئی شکوہ وشکایت کرنے کی بھی بالکل گنجائش نہیں۔ جبکہ وہ اپنے ہی قومی غداروں اور ملکی دشمنوں کو قرار واقعی سزا نہ دے لے۔ جنہوں نے کہ اپنی خودغرضی اور مطلب پرستی کو مدنظر رکھکر اُسے دشمنوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ کیا یہ بھی ممکن ہے۔ کہ جو لوگ اقوام پرست حکومتوں کے اُن جانی دشمنوں کے ہم خیال ہو سکیں گے۔ یا ایک دفعہ اُنکے جال میں پھنس کر اپنی حسب منشا یا مرضی سے اپنے حقیقی مقصد میں کوئی کامیابی حاصل کر سکیں گے۔

فیسٹ اٹلی نے یہودیت کی تین سر برآوردہ طاقتوں کے خلاف نادانستہ طور پر اگرچہ مجھے بذات خود اسکا یقین نہیں جو جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ یہ اس امر کا بہترین ثبوت ہے۔ کہ باہر سے اور اوپر جو زہریلے دانت اس حکومت پر جم رہے ہیں۔ اُن سے نجات حاصل ہو رہی ہے۔ خواہ یہ نجات بالواسطہ طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ غرضیکہ سب خفیہ سوسائٹیوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ نام نہاد آزاد اور قوم پرستی کا مخالف پریس دبا دیا گیا ہے۔ اور بین الاقوامی مارکس ازم کی طاقت کو کچل ڈالا گیا ہے۔ انگلستان میں بھی اسی

مشرقی پالیسی

(۱۴)

ہماری نام نہاد صاحب دماغ جماعت نہایت ہی نامعقول طور پر ہماری خارجہ پالیسی کو قومی مفاد کی حقیقی نمائندگی کی طرف سے محض اس لئے منحرف کر رہی کہ وہ ان کے خیالی اصولوں کی کچھ معاونت کر سکے۔ اس لئے اس بارے میں بھی میں یہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اپنے ہم خیال دوستوں کے سامنے اپنے خیالات صاف صاف اور نہایت احتیاط سے ظاہر کر دوں پہلے یہ حقیقت ہی ہم سب کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ روس کے ساتھ ہمارے تعلقات کیسے رہنے چاہئیں۔ اور پھر ہمیں حتیٰ الوسع اُس پر عمل بھی کرنا چاہیئے۔

ہر ایک قومی حکومت کو ہمیشہ اپنی خارجہ پالیسی میں یہ فرض پیش نظر رکھا جانا چاہیئے۔ کہ جو نسل اس حکومت کے ساتھ سب سے زیادہ گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اسکی آبادی کا تناسب غیروں کے مقابلہ میں ہمیشہ صحت بخش اور قدرتی بنا رہے۔ اور اس قوم کی تعداد نیز اس کے زیر قبضہ اراضیات میں جو ترقی و اضافہ ہو۔ اسمیں بھی یہ تناسب کبھی کم نہ ہونے پائے۔ بلکہ ہمیشہ برقرار رہے۔ اور ملک کی جن زمینوں پر اس نسل کا قبضہ ہو۔ وہ اپنی قسم و پیداوار کے لحاظ سے اچھی رہیں۔ کیونکہ کسی قوم کی ہستی اور آزادی کی برقراری کے لئے اپنی ضروری چیز اور کوئی بھی نہیں۔ جتنی کہ اس کی قابل کاشت اور اچھی پیداوار والی زمین ہے۔ اس نقطہ خیال سے صرف جرمن قوم ہی دنیا کی ایک بڑی قوم کی حیثیت سے اپنی حفاظت کر سکے گی۔ اور جرمن میں جو بھی دوسری قومیں آباد

نسل سے دوغلہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن ایشا کی کسی بھی قوم پرست حکومت پر جیسی کہ جاپان ہے۔ ان کا یہ جادو چلنا صرف محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

اسی لئے یہودی آج دنیا بھر کی قوموں کو بالکل ویسے جاپان کے خلاف بھی بھڑکا رہے ہیں۔ جیسے کہ وہ پہلے جرمنی کے برخلاف بھڑکایا کرتے تھے۔ اور عین ممکن ہے۔ کہ اس کا یہ نتیجہ ہو۔ کہ ایک طرف جہاں برطانی مدبر جاپان کے ساتھ صلح و اتحاد کے لئے کوشاں ہوں۔ وہاں دوسری طرف برطانیہ کا یہودی پریس اس کے اسی رفیق کے خلاف اعلان جنگ کا مطالبہ کرے۔ اور جمہوریت کی دہائی مچاتا ہوا اس کا نام و نشان تک مٹا ڈالنے کے درپے ہو جائے۔ نیز یہ نعرہ جنگ بلند کرنے لگ جائے کہ "جاپانی جنگ پرستی اور شاہ پرستی کا خاتمہ کر دو"۔ حاصل کلام یہ ہے۔ کہ آج یہودی انگلستان میں بھی علم بغاوت بلند کر رہے ہیں۔ اور ان کے اس وسیع عالمگیر خطرے کے خلاف وہاں بھی جلد ہی ایک زبردست جدوجہد شروع ہونے ہی والی ہے۔

اب ہماری نیشنل سوشلسٹ تحریک کا یہ فرض ہے۔ کہ کم از کم اپنے ملک میں تو وہ اپنے اس جانی دشمن کی ہستی سب کو محسوس کرا دے۔ اور جو جنگ و جدل اس کے خلاف یہاں شروع ہو۔ وہ ایسا ہو۔ کہ دوسری قوموں کے لئے جہاں کہ ابھی یہ تاریکی اتنی زیادہ نہیں پھیلی۔ ایک شمع ہدایت کا کام دے سکے۔ نیز زندگی کی جدوجہد میں انہیں آرین انسانیت کے فوائد سے مستفید کر سکے۔

وُہ بھی اپنی اپنی وسیع سلطنت کے مختلف حصوں کی رنگدار آبادی سے اپنی افواج ..... میں روز بروز اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ اور اگر وہ برابر اسی طرح ترقی کرتا رہا جیسا کہ گزشتہ تین سو سال سے کر رہا ہے۔ تو ایک دن اس کی وسیع حد بند سلطنت رہائن سے لے کر کانگو تک کے رقبہ پر پھیل جائے گی۔ اور اس کی روزافزوں آبادی روز بروز زیادہ تر مخلوط النسل ہوتی جائے گی۔ نوآبادیوں کے متعلق فرانس کی پالیسی صرف اس پہلو میں ہماری سابقہ پالیسی سے مختلف ہے کیونکہ ہماری پالیسی نے نہ تو اس زمین میں ہی کچھ اضافہ کیا جو جرمنی کے قبضہ میں تھی۔ اور نہ سیاہ خون کو ہی اپنی نسل میں شامل کرنے کی کوئی مجرمانہ کوشش کی۔ جرمن مشرقی افریقہ میں عسکری کی موجودگی بھی اسی سمت میں ایک چھوٹا سا قدم تھا۔ جو نہایت پس و پیش کے بعد اٹھایا گیا تھا۔ لیکن ہم انہیں بھی درحقیقت اس نوآبادی کی حفاظت کے لئے ہی استعمال کرتے تھے۔ اب تو دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں میں وہ حیثیت بھی باقی نہیں رہی۔ اس کے لئے بھی ہماری وہ خارجہ پالیسی ذمہ دار ہے۔ جو شروع سے ہماری قوم کی اس مہلک سمت میں رہنمائی کرتی رہی ہے۔ کیونکہ اس میں ہمارا وہ روایاتی رنگ موجود نہ تھا۔ جس کو میں ایک خارجہ پالیسی کا نہایت ضروری عنصر سمجھتا ہوں۔ اور اسی لئے ہماری وہ حس اور اکساہٹ جو ہمارے قومی احساس کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھی۔ تمام و کمال زائل ہو گئی تھی۔

ان تمام خرابیوں کا علاج بھی اب نیشنل سوشلسٹ تحریک کو ہی کرنا پڑے گا۔ اس لئے یہ کوشش ہونی چاہئے۔ کہ ہماری آبادی اور نیز ہماری گذشتہ عظمت اور موجودہ مایوسی خیز ذلت و بے عزتی کے درمیان یہ جو ناموزوں تناسب پیدا ہو گیا ہے۔ وہ قائم نہ رہے۔ کیونکہ یہ رقبہ ہی تو ہماری سیاسی طاقت کی بنیاد اور اس کی ضمانت کا ذریعہ

ہیں ۔ وہ اس بارے میں ایسے کبھی کوئی مدد نہیں دیں گی۔

ہمارے قومی مفاد نے جیسا کہ ہمیں...... اپنی منفعت بخش خارجہ سرگرمیوں کو ہمیشہ سمجھنا چاہیئے۔ گذشتہ دو ہزار سال سے تاریخ عالم میں ایک نہایت شاندار حصہ لیا ہے۔ ہماری اپنی زندگی ہی اسکی بہترین شہادت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک دنیا کی سب قومیں جس عظیم الشان جدوجہد میں مصروف رہی ہیں۔ وہ سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں تھی۔ کہ ہماری جرمن قوم دنیا میں اپنی ہستی کے اظہار کے لئے ایک زبردست کشمکش کر رہی تھی۔ اور یہی کشمکش "عالمگیر جنگ" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اُس زمانہ میں جرمن قوم نمایاں طور پر دنیا کی کوئی بڑی قوم نہ تھی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ اگر اس نے اپنے متذکرہ بالا تناسب کو برقرار رکھا ہوتا۔ تو درحقیقت وہ ایک بڑی قوم ضرور ہو جاتی۔ اور جنگِ عظیم باوجود اپنے تمام دیگر ضروری عناصر کے۔ یا تو ہوتی ہی نہیں۔ اگر ہوتی بھی۔ تو اسکا انجام بہرحال ہمارے حق میں ہوتا خلاف ہرگز نہ ہوتا۔

لیکن آج جرمن قوم کسی طرح بھی دنیا کی قوموں میں ایک سربرآوردہ قوم نہیں کہلا سکتی۔ خاص رقبہ زیر تسلط کے لحاظ سے ہماری رعیت کے تحت میں جو رقبہ ہے۔ وہ دنیا کی دوسری بڑی قوموں کے رقبہ کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ انگلستان کی مثال تو کسی طرح بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ برطانی مادرِ وطن انگلستان تو درحقیقت برطانیہ کی وسیع سلطنت عالم کا ایک صرف دارالسلطنت ہی تو ہے۔ جو کل صفحۂ عالم کے تقریباً ایک چوتھائی رقبے کی ملکیت پر فخر کر سکتی ہے۔ لیکن دوسری حکومتوں مثلاً امریکہ کی ریاستہائے متحدہ رُوس اور چین ہی کو دیکھئے! جن میں سے بعض کا رقبہ ہماری نام نہاد سلطنت جرمنی کے رقبے سے تقریباً دس گنا ہے۔ فرانس کو بھی اُن میں سے ایک ہی سمجھنا چاہیئے

جو کہ دوسرے ہمیں بنانا چاہتے تھے +

اب اور آئندہ بھی ہماری بہتری و بہبودی کے لئے یہ نہایت ضروری تھا۔ کہ ہم یا ابھی طرح سمجھ لیتے۔ ہماری قوم کی حقیقی سیاسی کامیابی کس بات پر منحصر ہے؟ اور وُہ فضولیات کیا ہیں۔ جن کے لئے ہماری قوم کا خون فضول بہایا گیا ہے؟ اس لئے ہماری نیشنل سوشلسٹ تحریک کو بھی آج کل کی نام نہاد بورژیوس (جمہور نواز) دنیا کے پُر شور اور شرارت آمیز حب الوطنی کے جال میں نہیں پھنسنا چاہیئے۔ ہم لوگوں کے لئے یہ اور بھی خاص طور پر نقصان دہ ہوگا۔ اور اگر ہم اپنے آپ کو ان تمام نشوونماؤں سے ذرا بھی وابستہ سمجھنے لگے۔ جو جنگ سے عین پہلے رونما ہوئی تھی تو ہمارا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم اپنے لک کے رقبے کو اپنی آبادی کی تعداد کے مطابق موزوں تناسب میں کسطرح لائیں! لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی ہماری ایک بہت بڑی سیاسی حماقت ہوگی۔ اگر ہم ابھی سے یہ مطالبہ کرنے لگیں۔ کہ "ہماری ۱۹۱۴ء سے ملکی حدود کو بحال کر دیا جائے" لیکن پھر بھی لوگ برابر یہی شور و غل مچا رہے ہیں۔ اور اسے ہی سب شا مدبرانہ فعل سمجھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہم اپنی اس بیوقوفی سے اپنی سب مخالف طاقتوں کے اتفاق و اتحاد کو اور بھی زیادہ مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔ جو بصورت دیگر خود بخود قدرتی طور پر ڈھیلا پڑ جاتا۔ کیونکہ ان میں یگانگت یکسانیت کا تو کوئی عنصر موجود ہی نہیں یہی اس امر کی سب سے نمایاں شریح ہے۔ کہ آج جنگ عظیم سے سالہا سال کے بعد بھی وُہ تمام مختلف عناصر ہماری مخالفت میں کم و بیش ٹھوس بنے ہوئے ہیں۔ جو ہمارے خلاف فتح یاب ہونے کے لئے مختلف ہوتے ہوئے بھی کسی نہ کسی طرح ایک ہو گئے تھے +

ہے۔ ہماری سابقہ جرمن پالیسی کے تمام کارناموں میں سے سب سے زیادہ شان دار کارنامہ تو پرشین حکومت کی حامی تھا۔ اور اس کی بدولت ہی وہ شان حکومت کا تخیل پیدا ہو کر جرمن افواج کی ساخت اور زمانہ جدید کی تمام ضروریات کے مطابق اس کی پختگی و مضبوطی رونما ہوتی تھی۔ حکومت کے اس تخیل اور اس کی طاقت و قوت کی ساخت سے ہی نیز اس کے تحت میں جو نئے اصول قائم کئے گئے ان کی بدولت ہی قانونی و انفرادی حفاظت کے خیال نے قومی و ملکی حفاظت کے فرض کی صورت اختیار کر لی۔ اور اب اس خیال کی اہمیت و عظمت میں کسی طرح کا مبالغہ کرنا ناممکن ہے۔ ہماری جرمن قوم جو پہلے انفرادی شخصیت کے خیال سے تقسیم در تقسیم ہو کر کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ پرشین افواج کے زیر نظام ایک عمدہ تربیت یافتہ جماعت بن گئی اور اس طرح اس نے ایک مرتبہ پھر اس زبردست طاقت تنظیم کی قابلیت حاصل کر لی۔ جو کہ پہلے اس سے زائل ہو چکی تھی +

اس فوجی تعلیم کی بدولت ہی ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے اپنے اندر وہ بات پیدا کر لی تھی۔ جیسے اور قومیں اپنے اتحاد و اتفاق کے لئے ہمیشہ ضروری سمجھتی ہیں ابھی لئے لازمی فوجی خدمات کے قاعدے کی منسوخی۔ جو شاید دوسری درجنوں قوموں کی نظر میں معمولی سی بات ہو گی۔ وہی ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال بن گئی بلکہ اگر دس پشت تک جرمنوں کو فوجی تعلیم و ڈسپلن نہ ملے۔ اور انہیں ان کی اس پھوٹ و نفاق کے زیر اثر چھوڑ دیا جائے۔ جو ان کے خون میں داخل ہو چکی ہے تو یقیناً ہماری قوم صفحہ زمین پر اپنی آزاد ہستی کی آخری یاد بھی اپنے دل سے بھلا بیٹھے گی۔ اس صورت میں بھی شاید یہ ممکن ہوتا۔ کہ دوسری قوموں کی غلامی میں بھی ہم اپنے قومی تہذیب و اخلاق کا کچھ حصہ دنیا کو دیتے رہتے۔ مگر یہ ضرور تھا کہ اس حالت میں ہم اپنی اصلیت و حقیقت کو بالکل بھول جاتے اور وہی کچھ بن جاتے

اپنا اور بھی خون بہانا پڑے گا حتیٰ کہ اتنا بھی خون باقی نہ رہے جس سے کہ ہم کوئی ایسا
فیصلہ کر سکیں یا طریق عمل اختیار کر سکیں۔ جس سے کہ قوم کی آئندہ زندگی بحال ہو سکے
اور وہ زمانہ مستقبل میں خاطر خواہ طور پر پھل پھول سکے۔ برخلاف اس کے اس بے محل اور بے سود
فتح کے فضول غرور و تکبر سے بھول کر ہم پہلے اس بہ دیر حاصل ہونے والے مقصد کو بھی نظر انداز کر دیں گے
کیونکہ اس وقت "قومی ذلت اور بے عزتی" کا یہ خیال بھی ہمارے دل سے دور ہو جائے گا۔
اور ایک مرتبہ کسی نہ کسی طرح ہمارا دروازہ وہاں سب پرانی تجارتی ریشہ دوانیوں کے لئے کھل
جائیگا۔ حتیٰ کہ پھر کوئی ایسا ہی ناپسندیدہ واقعہ رونما ہو کر ہماری تباہی و بربادی کو مکمل
کرنے والا بن جائے گا +

اس لئے حالات موجودہ میں "ہم نیشنل سوشلسٹ" لوگوں کا فرض یہی ہے۔ کہ ہم
اپنی خارجہ پالیسی میں بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنے اُن ہی مقاصد کے ساتھ چپٹے
رہیں۔ اور جرمن قوم کو یہ یقین دلاتے رہیں۔ کہ ایک نہ ایک دن ہم اس صفحہ زمین پر
اس سب علاقے کو ضرور اپنے قبضہ اقتدار میں لے لیں گے۔ جو ہمارا ہے۔ اور جس پر ہمیں
حق ملکیت حاصل ہو چکا ہے +

دنیا کی کسی قوم کے قبضہ میں بھی کوئی ایک گز کا خطہ زمین ایسا نہیں جس کا حق ملکیت
اسے کسی خدائی پٹے کے ذریعہ حاصل ہوا ہو۔ ممالک کی حدود کو حضرت انسان ہی ہمیشہ
بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ کوئی قوم صفحہ زمین کی ملکیت میں ناجائز طور
پر ایک بڑا حصہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس امر کی کوئی اعلیٰ دلیل نہیں۔
کہ اس کے اس قبضہ کو ہمیشہ ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یہ تو صرف فاتح کی قوت
اور مفتوح کی کمزوری کو ثابت کرکے اسی اصول کی تائید کرتا ہے "کہ جس کی لاٹھی اسکی بھینس"
اور اسطرح طاقت ہی حق ملکیت کو ثابت کرتی ہے۔ خواہ آج ہم فرانس کے ساتھ کسی سمجھوتے
و صلح نامے کی ضرورت کو کتنا بھی کیوں نہ محسوس کریں۔ اگر اس سمجھوتے کے لئے ہماری خارجہ

جرمنی کی تباہی اور بربادی سے ان سبھی حکومتوں نے کم وبیش فائدہ اٹھایا تھا۔ ہماری طاقت وقوت کے خوف نے ہی دنیا کی ان سب بڑی بڑی قوموں کے دل میں ان کے حقیقی رشک وحسد کو عارضی طور پر دبا دیا تھا۔ اور وہ سبھی یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اگر کسی طرح ہماری جرمن سلطنت کے آپس میں حصے بخرے کرنے میں وہ کامیاب ہو جائیں۔ تو ہم پھر کبھی سر نہ اٹھا سکیں گے۔ اور ہماری طرف سے ان کے سب خوف وخطر ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔ غرضیکہ اُن کی گنہگار ضمیر اور ہماری زبردست قومی طاقت کے خوف نے ہی ایک نہایت مضبوط سیمنٹ بن کر انہیں ایک دوسرے کے ساتھ اتنا متحد ومنفق کر رکھا تھا۔ مگر اب دیا نا کانفرنس کے بعد سے صورت حالات بالکل ہی بدل چکی تھی۔ اب شہزادے اور اُن کی منظور نظر محبوب صوبجات کو تو داؤ پر لگا کر جرأتہ کھیل سکتے تھے۔ مگر اب وہ خود ہی یہودیوں کی شطرنج کے مہرے بنے ہوئے تھے۔ اور یہ بے رحم بین الاقوامیت پرست یہودی خود سب قوموں کی قسمت کا مالک بننے کی غرض سے جدوجہد کر رہے تھے +

اسلئے اب ۱۹۱۴ء کی حکومت کا جرمنی کے مستقبل کے ساتھ کچھ تعلق نہ تھا۔ نہ تو وُہ زمانہ ماضی میں ہی اسکی حفاظت کر سکی تھی۔ اور نہ مستقبل میں ہی کر سکتی تھی۔ وُہ جرمن قوم کو اندرونی طور پر کچھ طاقت وقوت دیکر اسے ٹھوس بھی نہیں بنا سکتی تھی۔ اور نہ اسے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ خوراک ہی بہم پہنچا سکتی تھی — فوجی نقطہ خیال سے بھی وُہ کچھ زیادہ موزوں۔ بلکہ قابل اطمینان نہ تھی اور نہ وُہ ہماری موجودہ حالت میں دنیا کی دوسری قوموں کا مقابلہ کرنے میں ہی کچھ فائدہ پہنچ سکتی تھی۔ جو آہستہ آہستہ حقیقی طور پر دنیا کی طاقت وقوت بنتی جا رہی تھی۔ لیکن صرف ایک بات ضرور تھی۔ ۱۹۱۴ء کی حدود سنبھال کرنے کرنے کے لئے ابھی جو بھی کوشش کی جائے گی۔ اگر وُہ کامیاب بھی ہو گئی۔ تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو گا۔ کہ ہماری قوم

ہوئے سے چھٹکارا پانا ایسا ہی ناممکن ہو گیا ہے ۔ جیسا کہ یہودیوں کے لئے زیادہ عرصہ تک اس وسیع سلطنت پر اپنا قبضہ رکھنا ناممکن ہے ۔ کیونکہ تنظیم و تعمیر تو اُس کی عادت میں ہی داخل نہیں ۔ وہ غریب تو توڑ پھوڑ اور بربادی و تباہی ہی جانتے ہیں اس لئے یہ عظیم الشان سلطنت بھی ایک دن انتشار اور خاتمے کا شکار ضرور ہوگی +

۱۹۲۰ء کے آغاز میں ہی کئی طرف سے ہماری پارٹی کے پاس یہ پیغامات آنے لگے ۔ کہ ہم دیگر ممالک کی حصول آزادی کے لئے کوششوں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرلیں ۔ یہ منظوم اقوام کی انجمن کے طریق پر کام کرنے کی دعوت تھی ۔ جس کی اتنی وسیع اشتہار بازی ہوئی ہے ۔ اس میں زیادہ تر بعض بلقانی ریاستوں کے نمائندے شامل ہیں ۔ اور کچھ ہندوستانی و مصری بھی ہیں جنہیں میں نے صرف باتونی ہی پایا ہے ۔ ان کی جڑھ میں یا پیٹھ پر کوئی طاقت نہیں ۔ لیکن ان میں چند جرمن قوم پرست بھی تھے ۔ جو ان بیچارے مشرقیوں کے جال میں پھنس گئے تھے ۔ اور یہ سمجھتے تھے ۔ کہ ہر ایک ہندوستانی یا مصری طالب علم جو کسی نہ کسی طرح یہاں آ پہنچا ہے ۔ ہندوستان یا مصر کا حقیقی نمائندہ ہے ۔ انہوں نے کبھی ان کے متعلق کچھ زیادہ پوچھ تاچھ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ۔ اور نہ میں نے ہی یہ خیال کیا ۔ کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی پیٹھ پر کوئی مضبوط طاقت نہیں ۔ اور نہ انہیں یہ اختیار ہی حاصل ہے ۔ کہ وہ اپنے ملک و قوم کی طرف سے کسی کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرسکیں ۔ اس لئے ان کے ساتھ کچھ مغز ماری کرنے کا نتیجہ صفر اور تضیع اوقات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوسکتا ۔

مجھے وہ طفلانہ اور ناقابل اعتبار امیدیں بڑی اچھی طرح یاد ہیں ۔ جو ۱۹۲۰ء میں ان جرمن قوم پرستوں کے دلوں میں اچانک ہی پیدا ہوگئی تھیں ۔ جب کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا ۔ کہ بس اب ہندوستان میں حکومت برطانیہ کا خاتمہ ہی ہوا جاہتا ہے ۔ چند ایشیائی لفنگوں نے ذ ممکن ہے ۔ کہ وہ ہندوستان میں آزادی کے

پالیسی کے مقصد کو قربان کر دینے کی بھی ضرورت پیدا ہو جائے۔ تو یہ سمجھوتہ ہمارے لئے بالکل بے سود و فضول ثابت ہوگا۔ لیکن اگر اس خطہ زمین کی ملکیت کے لئے جس پر ہماری قوم کو یوروپ میں رہنا اور آباد ہونا ہے۔ یہ ہمارے حق کو کچھ تقویت بخشتا ہے۔ تبھی یہ ہمارے لئے مفید ہوسکتا ہے۔ اور اس کے منظور کرنے میں ہماری دانائی اور دانشمندی ہے۔ چونکہ نوآبادیوں کا حصول ہماری اس مشکل کو حل نہیں کرسکتا۔ اس لئے ایسے خطۂ ملک کو حاصل کئے بغیر ہمیں کبھی اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا۔ جہاں ہمارے نوآبادکار نہ صرف اپنی مادرِ وطن کے قریب ہی رہتے ہوئے اس کے دُکھ سکھ میں ہر طرح شریک رہیں۔ بلکہ ایک متحد ملک کے بڑے قد و قامت سے جو فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ ان سب سے فیضیاب ہوتے رہیں۔ اور اس کے ضامن بھی بن سکیں +

ہم نیشنل سوشلسٹوں نے اپنی قوم کی جنگ سے پہلے کی رغبتوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اب سے چھ سو سال پہلے کی حالت ہماری نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔ ہم یورپ کے جنوب اور مغرب کی طرف بہنے والے جرمنی کے چشمے کا رُخ ادھر سے موڑ کر اپنی نگاہیں مشرق کی طرف جما رہے ہیں۔ ہم نوآبادیوں اور تجارت کے متعلق جرمنی پالیسی کا خبط چھوڑ کر آئندہ کے لئے اراضیات کے حصول کی پالیسی کی طرف توجہ دینا چاہیئے۔ قسمت بھی اس وقت ہمیں یہی ہدایات دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جب قسمت نے روس کو بولشوزم کے ہاتھوں چھوڑ دیا۔ تو گویا اس نے روسیوں سے انکی تعلیم یافتہ جماعتوں کو چھین لیا۔ جنہوں نے ایک زمانہ میں انکی حکومت کو قائم کیا تھا۔ اور جو بحیثیت ایک قوم کے ان کی ہستی کے ضامن تھے جرمن عنصر تو گویا اب روس میں بالکل رہا ہی نہیں۔ اور اس کی جگہ بھی اب یہودی عنصر نے لے لی ہے۔ اب روسیوں کے لئے محض اپنی طاقت سے یہودیوں کے

امن و امان کے زمانے میں بھی یہ اُمیدیں کافی خراب ہیں۔ اتحاد ترکی اور آسٹریا
کے وقت بھی ہمارے لئے خوشیاں منانے کی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ ایک ایسے
زمانے میں جبکہ دُنیا بھر کی بڑی بڑی فوجی اور صنعتی حکومتیں سرگرم جارحانہ اتحاد
میں شریک ہو رہی تھیں۔ ہم نے دو چار کمزور اور میدان ترقی و عمل میں بہت پیچھے رہی
ہوئی قوموں کے ساتھ رشتہ جوڑ کر اس کوڑے کرکٹ سے ہی دنیا بھر کے اس سرگرم اتحاد
کا مقابلہ کرنے کی سوچ لی۔ اور اپنی اس غلط خارجہ پالیسی کا خمیازہ بھی خاطر خواہ برداشت
کیا لیکن میں بطور ایک ایسے قوم پرست کے، جو انسانیت کا اندازہ اسکی نسلی خوبیوں
پر لگاتا ہو۔ یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ ہمیں کسی طرح بھی نام نہاد "مظلوم قوموں"
کے ساتھ کوئی رشتہ اتحاد قائم کرنا چاہئے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ سب
نسلی لحاظ سے ہی بالکل گئی گذری ہیں۔ کوڑی کام کی نہیں۔ اور موجودہ روس کے فرمانرواؤں
کا بھی یہ دلی ارادہ ہرگز نہیں۔ کہ وہ کسی بھی قوم سے کوئی دیرپا اتحاد کریں۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ کہ بولشویک خونی اور قاتل ہیں۔ ایک غمناک
وقت پر صورت حالات سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ایک عظیم الشان حکومت کا خاتمہ
کر دیا ہے۔ اور قتل عام کے جنون و دیوانگی کے زیر اثر انہوں نے اپنے لاکھوں ہوشیار
اور صاحب دماغ لوگوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اب گذشتہ دس سال سے
وہ ایسے ہی ظالمانہ طور پر حکومت کر رہے ہیں۔ جس کی نظیر صفحہ عالم پر کسی زمانے
میں بھی کہیں نہ ملے گی۔ ہمیں یہ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان میں سے اکثر لوگ تو
ایک ایسی نسل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی خصلت میں بدترین حیوانی زندگی
کی نایاب خاصیت شامل ہے۔ جو جھوٹی باتیں بنانے کی نادر قابلیت رکھتی ہے۔
اور جس کے دماغ میں یہ خبط سمایا ہے کہ وہ دنیا بھر کو اس خونی جبر و تشدد میں اپنا شریک
کار بنانے کے لئے ہی پیدا ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے ہم یہ حقیقت بھی نظر انداز

حقیقی سپاہی بھی ہوں۔ مگر اس کی بھی مجھے پرواہ نہیں۔ جو یورپ میں جگہ جگہ بھاگے پھرتے تھے۔ اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کو یہ یقین دلا دیا تھا۔ کہ بس اب وسیع برطانوی سلطنت کا جس کی جڑیں ہندوستان میں قائم ہے۔ خاتمہ نزدیک ہے۔ لیکن ان کے دل میں یہ خیال کبھی نہیں گذرا۔ کہ یہ سب اسی خواہش کا سراب ہے۔ جو ان کے دل میں برطانیہ کے خلاف موجزن ہے۔ کیونکہ خواہش ہی ہر خیال کی ماں ہے۔"

یہ خیال کر لینا بھی محض بچپن ہی ہوگا۔ کہ انگلستان بھی اپنے عالمگیر اور وسیع برطانوی اتحاد کے لیئے اپنی سلطنت ہند کی عظمت و اہمیت کو اچھی طرح محسوس نہیں کرتا۔ اور یہ اس امر کا ایک نہایت ہی افسوسناک ثبوت ہے۔ کہ ہم نے جنگ عالم سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اور ہم انگریزوں کی اینگلوسیکسن خصلت کو اچھی طرح نہیں سمجھے۔ جو ہم اپنے بھولے پن سے یہ سمجھ بیٹھے۔ کہ انگلستان ایسی آسانی کے ساتھ ہندوستان کو اپنی مٹھی سے نکل جانے دے گا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک جرمنی میں برطانی حکومت و انتظام کے طریق عمل کی طرف سے بھی کتنی لاعلمی و جہالت پھیل رہی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ انگلستان اس وقت تک ہندوستان کو اپنے قبضے سے کبھی نہیں نکلنے دے گا۔ جب تک کہ وہ اپنی حکومتی مشینری میں نسلی گڑبڑ پیدا نہ کرے گا۔ یا کسی زبردست دشمن کی تلوار کے دباؤ سے وہ ایسا کرنے کے لیئے مجبور نہ ہو جائے۔ ہندوستان میں بغاوت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہم جرمن ذاتی تجربے سے یہ جانتے ہیں۔ کہ انگریزوں کو کسی بات کیلئے مجبور کرنا مشکل ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر میں بحیثیت ایک جرمن کے یہ کہوں گا۔ کہ میں ہندوستان کو کسی اور کا غلام دیکھنے کی نسبت یہ زیادہ پسند کرونگا کہ وہ انگریزوں کا ہی غلام بنا رہے۔ مصر میں بھی انگریزوں کے خلاف کسی بغاوت کی امید ایسی ہی خیالی قیاسی اور بے بنیاد تھی جیسی ہندوستانی بغاوت کی :

ساتھ اتحاد و اتفاق کر لیتا۔ اور براعظم یورپ میں ہی علاقے حاصل کرنے کے خیال سے ایک دن تمام دنیا پر چھا جانے کا کمزوری آمیز ارادہ ترک کر دیتا۔ کیونکہ میں ان گستاخانہ دھمکیوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ جو روس نے سلاودں کا حمایتی بن کر جرمنی کو دی تھیں۔ اور نہ ان مسلسل جنگی تیاریوں کو ہی نظر انداز کر سکتا ہوں جس کا مقصد جرمنی کو تنگ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نیز جنگ سے پہلی رُوسی رائے عامہ کا جو عام رجحان تھا۔ یعنی جس طرح وہ ہماری قومی سلطنت کے خلاف اپنے حملوں کو تلخی میں اپنی سب پہلی کارگذاریوں سے بھی بازی لے جانا چاہتی تھی۔ اسے بھی میں فراموش نہیں کر سکتا۔ اور نہ میں روسی پریس کو ہی نظر انداز کر سکتا ہوں۔ جو ہمارے مقابلہ میں فرانس کی حمایت کرتا رہا ہے۔

دنیا کی بڑی بڑی قومیں اس وقت بھی اپنی طاقتوں کو جس طرح مضبوط کر کے ٹھوس بن رہی ہیں۔ یہ ہمارے لئے فہمائش ہے۔ کہ ہم بھی ہوشیار ہو جائیں۔ اور اپنے ہموطنوں کو ان کے خواب غفلت سے بیدار کر کے تلخ واقعات اور سخت سچائیوں پر غور کرنے کے لئے مجبور کریں۔ اور انہیں وہ طریقہ بتلائیں۔ جس پر عمل کر کے ہماری پرانی "ریش" پھر نئی طاقت و قوت حاصل کر کے پھل پھول سکتی ہے۔ اسلئے اگر ہماری نیشنل سوشلسٹ تحریک ہر طرح کے توہمات سے آزاد ہو کر صرف عقل و دلیل کو اپنا رہنما بنا لے۔ تو ۱۹۱۸ء کی رہنمائی بھی ہمارے لئے ایک برکت و رحمت ثابت ہو کر بطور ایک قوم کے مستقبل کو نہایت شاندار بنا سکتی ہے۔ اور انجام کار ہم بھی وہ طاقت حاصل کر سکتے ہیں۔ جس کی بدولت وہ بار بار اپنی بگڑی بنا لینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور وہ طاقت "سیاسی روایات کی طاقت" کے سوا اور کوئی طاقت نہیں ہے۔

اٹلی اور انگلستان کے ساتھ اتحاد و اتفاق کرنے میں اگر ہمیں کامیابی حاصل ہو جائے۔ تو اس کا نتیجہ روس کی دوستی و رفاقت سے بالکل ہی مختلف ثابت ہو گا۔

نہیں کر سکتے ۔ کہ اس وقت بین الاقوامیت پرست یہودیوں کا روس میں بول بالا ہے اور وہ جرمنی کو اپنا دوست نہیں سمجھتے ۔ بلکہ ایک ایسی قوم خیال کرتے ہیں جس کا وہی حشر ہونے والا ہے ۔ جو کہ روس کا ہوا ہے ۔

جو خطرہ روس نے برداشت کیا ہے ۔ جرمنی کے سر پر بھی وہ ہمیشہ ایک ننگی تلوار کی مانند لٹک رہا ہے ۔ کیونکہ جرمنی ہی بولشوزم کا دوسرا بڑا نشانہ ہے ہماری قوم کو ایک مرتبہ پھر بیدار کرنے اور اٹھانے کے لئے ہمارے اصولوں کے پرچار کے متعلق ایک پُرزور تخیل کی ضرورت ہے ۔ تاکہ اسے اس بین الاقوامی بھوت کے پنجے میں پھنسنے سے بچایا جا سکے ۔ اس کے خون میں جو زہر پیدا ہو رہا ہے ۔ اسے روکا جا سکے ۔ اور اس طرح قوم کی تمام طاقتوں کو ایک مرتبہ پھر آزاد کر کے انہیں اپنی قومیت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکے ۔ اگر ہمارا دلی مقصد یہی ہے ۔ تو ہمارے لئے اس سے بڑھ کر بیوقوفی اور حماقت اور کیا ہو سکتی ہے ۔ کہ ہم اس قوم کے ساتھ گہرے اور یگانگت کے تعلقات پیدا کریں ۔ جس کے آدرش ہم سے بالکل مختلف ہیں ۔ اور جو زمانہ مستقبل میں ہماری جانی دشمن ثابت ہو سکتی ہے ۔

ایک اور خاص گناہ جو پرانی جرمن سلطنت سے اپنی اتحاد و رفاقت کی پالیسی کے سلسلہ میں سرزد ہوا وہ یہ تھا ۔ کہ اس نے اپنی متلون مزاجی کی بدولت اور اپنی اس کمزوری کی وجہ سے کہ چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے ۔ امن و امان ہی قائم رکھنا چاہئے ۔ سب کے ساتھ ہی اپنے تعلقات بگاڑ لئے ۔ لیکن بایں ہمہ اس بات کا الزام اس پر کسی طرح بھی نہیں لگایا جا سکتا ۔ کہ اس نے روس کے ساتھ اپنے تعلقات قائم نہیں رکھے ۔ اگر میں یہ کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں ۔ کہ دوران جنگ میں میرا یہ خیال ضرور تھا ۔ کہ جرمنی کے حق میں یہ بہت اچھا ہوتا ۔ کہ وہ بحری افواج اور نو آبادیات کے متعلق اپنی احمقانہ پالیسی ترک کر کے کسی روسی حملے کے خلاف انگلستان کے

لیکن چہار ہی سال میں یہ عین ممکن ہے۔ کہ ہم ایک ایسے زبردست پشتے کی مانند بن جائیں۔ جس کے ساتھ دریا کی لہریں ٹکرا ٹکرا کر لوٹ جاتی ہیں۔ یا کسی اور سمت میں اِدھر اُدھر پھیل جاتی ہیں +

ان دونوں ممالک کی دوستی میں سب سے بڑی بڑی بات یہ ہوگی۔ کہ ہمیں جنگ کا خطرہ بالکل نہ رہے گا۔ ہمارے اس اتحاد کا مخالف اگر کوئی ہو سکتا ہے۔ تو صرف فرانس۔ لیکن وُہ بھی کھلم کھلا اس کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ اور اس طرح یہ نیا اینگلو جرمن اٹالین اتحاد فرانس کی لگام کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھ سکے گا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی ہر طرح قابلِ غور ہے۔ کہ اس نئے اتحاد میں تمام علاقے شامل ہو جائیں گی۔ جو تمام صنعتی و حرفتی صفات سے بھرپور ہی نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل بھی کرتی ہیں ✣

اس میں شک نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ کہ یہ اتحاد کسی قدر مشکل ضرور ہے۔ لیکن کیا اس سے پہلے جو "اتحادِ ثلاثہ" ہو چکا ہے۔ وُہ اس وقت کچھ آسان دکھائی دیتا تھا۔ جب کہ شاہ ایڈورڈ کو ان سب بظاہر مخالف نظر آنے والے مفادات کے متحد کرنے میں کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اسی طرح اگر ہمیں بھی کبھی کسی متحد طریق عمل کی ضرورت کا پورا پورا احساس ہو جائے۔ تو یہ اتحاد بھی کسی طرح بھی ناممکن نہ ہوگا۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ ہم اپنے ملک و نسل کے دشمنوں کی کینہ توزیوں کا ہر طرح پوری پوری سختی و جانبازی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہیں۔ اس لئے ہم نیشنل سوشلسٹوں کو اچھی طرح محسوس کر لینا چاہیئے۔ کہ ہم اس کے متعلق ان لوگوں کے مقابلے کو بھی تیار رہیں جو مکار یہودیوں کے بہکانے میں آکر ایک دفعہ تو ہماری یہ رائے سنتے ہی پاگلوں کی طرح آپے سے .... باہر ہو جائیں گے۔ اگرچہ آج تو ہماری حالت بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسی کہ دریا میں کوئی چٹان کھڑی ہی ہو

کوئی زبردست مطالبہ اپنی زبان پر لانے کی ہمت و جرأت ظاہر نہیں کی +

اسیطرح اس مرتبہ بھی غیر مسلح کر دینے کے متعلق احکام کا منشا سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا۔ کہ ہمیں سیاسی طور پر بالکل ہی بیدست و پا کر دیا جائے۔ ان احکام کی تعمیل و تکمیل کے بعد سے ہی ہماری اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے واقعات بھی یکے بعد دیگرے مسلسل طور پر شروع ہو گئے۔ اس کی غرض صرف یہ تھی۔ کہ ہمارے دلوں میں ایک ایسی بزدلانہ سپرٹ پیدا کر دی جائے۔ کہ ہم جنرل ڈاز کی حمایت و سرپرستی کو بھی اپنے لئے ایک خدائی رحمت اور اپنی خوش نصیبی سمجھنے لگیں۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۳ء کے موسم سرما تک ہم سب یہ محسوس کرنے لگے۔ کہ صلح و امن کے بعد بھی فرانس ایک فولادی ارادے کے ساتھ یہی خواہش دل میں رکھتا ہے۔ کہ جسطرح بھی ممکن ہو۔ وہ ان تمام مقاصد و مدعا کو حاصل کر لے۔ جو دوران جنگ میں اس کے پیش نظر تھے۔ اور جن سے بچنے کے لئے ہی ہم نے صلح کی یہ ذلت گوارا کی تھی۔ کیونکہ اس وقت کوئی بھی یہ یقین نہ کر سکتا تھا۔ کہ فرانس نے اپنے باشندوں کا خون محض اسلئے بہایا ہے۔ کہ وہ اس تمام نقصان کے عوض میں جو اس نے جنگ میں برداشت کیا تھا۔ صرف تھوڑا سا برائے نام معاوضہ حاصل کر کے ہی خاموش بیٹھ جائے۔ کیونکہ آلسیس اور لورین کے علاقہ کی واپسی بھی فرانس کے جنگی لیڈروں کی ان سرگرمیوں کے اظہار کے لئے کافی نہ تھی۔ جنہیں انھوں نے فرانس کے آئندہ عظیم الشان سیاسی پروگرام کے متعلق اپنے دل میں جگہ دے رکھی تھی۔ نیز وہ پروگرام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کہ جرمنی کو بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر کے اس کی مرکزی طاقت کو ہمیشہ کے لئے منتشر کر دیا جائے۔ صرف یہی منشا و مدعا تھا۔ جس کی تکمیل کے لئے چاولنسٹ فرانس میدان جنگ میں کودا تھا۔ اور اسی غرض کے حصول کے لئے وہ

ضرورت کے وقت مدافعت کا حق

(۱۵)

جب ہم نے ۱۹۱۸ء میں ہتھیار ڈال دیئے۔ تو اس وقت ہم نے ایک ایسی پالیسی منظور کر کے اس پر عمل پیرا ہونا منظور کر لیا تھا۔ جس کا نتیجہ ہر انسانی امکان کے رو سے قابلِ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت یہ بات ہماری سمجھ میں آئی۔ کہ ۱۸۰۶ء میں جب پرشیا ایک جنگ میں شکست فاش کھا کر بالکل ہی بیدست و پا ہو بیٹھا تھا۔ تب چھ سات سال کے ہی مختصر زمانے میں ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۳ء کے درمیانی عرصے میں ہی اس کے باشندوں کے دلوں میں ایک کیسی شاندار اور کتنی زبردست جنگی سپرٹ از سر نو پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ انہوں نے اس سپرٹ سے کچھ بھی فائدہ نہ اٹھا کر اپنی طاقت کو اور بھی کمزور اور تباہ کر لیا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ بھی نہ تھی۔ کہ اس شرمناک صلحنامہ پر دستخط کرنے کے بعد وہاں کے کسی بھی محب وطن نے اتنی ہمت و جرأت نہیں دکھلائی۔ کہ دشمن کی طرف سے پرشین لوگوں پر بار بار جو گفتہ بہ مظالم ہوا کرتے تھے۔ اس کی کسی طرح مخالفت کرتا۔ اور ان سے چھٹکارا پانے کی مردانہ سپرٹ اپنے ہموطنوں کے دلوں میں پیدا کرتا۔ انہیں سے ہر ایک ہی شخص اتنا دانش مند و دور اندیش بنا رہا۔ کہ کسی نے بھی کسی وقت

دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء میں جرمنی اور فرانس کے باہمی تعلقات پھر بہت خطرناک ہو گئے۔ فرانس جرمنی پر دبیتے جبر و تشدد کے لئے نئے طریقے سوچ رہا تھا۔ اور ان کے لئے منظوری حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھا۔ یہ امید کی جاتی تھی۔ کہ روہر کے علاقے پر قبضہ کر کے وہ جرمنی کی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالے گا۔ اور ہماری اقتصادی حالت کو بےحد بگاڑ دے گا۔ مگر روہر پر فرانس کے قبضہ کے بعد بدقسمتی نے ایک مرتبہ پھر جرمنی کو یہ موقع دیا۔ کہ وہ دنیا پر اپنی ہستی کا اظہار کر سکے۔ اگرچہ یہ واقعہ بظاہر تو ایک بڑی بھاری بدقسمتی معلوم دیتا تھا۔ لیکن بغور دیکھنے پر ہمیں ایسے شاندار مکان نظر آتے تھے۔ جن سے جرمنی کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اسطرح پہلی مرتبہ فرانس اور انگلستان کے نہ صرف ان مدبروں کے ہی جنہوں نے کہ پہلے سمجھوتہ کیا تھا۔ بلکہ عوام کے باہمی تعلقات میں بھی سخت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور خصوصاً کاروباری لوگوں نے تو براعظم میں فرانس کی اس بڑھتی ہوئی طاقت کو اپنے دل ہی دل میں بہت بری طرح محسوس کیا۔ نیز روہر میں جو کوئلہ کی کانیں ہیں۔ ان پر فرانس کا قبضہ ہو جانے سے انگلستان ان تمام فوائد سے محروم ہو گیا جو گذشتہ جنگ میں اسے حاصل ہوئے تھے۔ اور اسطرح اب انگلستان کے محنتی اور جفاکش مدبروں کی بجائے فرانس کے نمائندہ مارشل فوش کو ہی نمایاں فتح حاصل ہو گئی۔

لیکن سنہ ۱۹۲۴ء کی موسم بہار میں پیشتر اس کے روہر میں فرانس کا قبضہ ہونے پر جرمن قوم کے دل میں اپنی جنگی طاقت کو از سر نو مضبوط کرنے کی سپرٹ پیدا ہوتی۔ اور وہ ان کے قوت آزادی کو مضبوط کر سکتی۔ یہ نہایت ضروری تھا۔ کہ ان لوگوں کا مناسب طور پر قلع قمع کر دیا جاتا۔ جو کہ اندر ہی اندر قوم کی سب سے بڑی طاقت یعنی قوم پرستی کے جذبے کو کمزور کرنے جا رہے تھے۔ جسطرح

اپنی تمام قوم کو بین الاقوامی یہودیوں کے ہاتھوں فروخت کر کے انکا غلام بنا رہا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ نومبر ۱۹۱۸ء میں جرمنی کی طاقت و قوت کا اچانک ہی خاتمہ ہو گیا۔ لیکن جسوقت ملک پر یہ مصیبت نازل ہو رہی تھی۔ ہماری فوجیں اس وقت بھی اپنے دشمنوں کے گھروں میں گھسی ہوئی داد شجاعت دے رہی تھیں۔ اسوقت فرانس کو یہ فکر نہ تھی۔ کہ جرمنی کے اسطرح حصے بخرے کر ڈالے جائیں بلکہ وُہ صرف یہ چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح جرمنی کو جلد سے جلد۔۔۔ فرانس اور بلجیئم کی حدود سے نکال باہر کرے۔ اسطرح پیرس کے لیڈروں نے جنگ ختم ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا۔ کہ انہوں نے جرمن افواج کو غیر مسلح کر کے جتنی بھی جلد ممکن ہوا۔ جرمنی واپس چلے جانے کے لئے مجبور کر دیا۔ اور جبتک اُن کا یہ دلی تمنا پورا نہ ہوا۔ تب تک وُہ اپنی توجہ اُس مقصد کیطرف نہ دے سکے جسے پیش نظر رکھ کر وُہ جنگ میں کود پڑے تھے۔

انگلستان نے بھی صرف اسیوقت جنگ میں اپنی فتح مکمل سمجھی۔ جب کہ ایک نو آبادیوں پر قابض تجارتی و کاروباری حکومت کی حیثیت سے جرمنی کو یہ حیثیت ایک حکومت کے صفحہ ہستی سے مٹا دینا انگلستان کو ہرگز منظور نہ تھا۔ نہ اس کے مفید مطلب ہی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وُہ یورپ میں فرانس کے لئے ایک زبردست رقیب کی موجودگی کا ہمیشہ سے ہی بہ دل و جان خواہاں ہے۔ اس طرح فرانس اپنے اصلی کام کو شروع کرنے سے پہلے جس کے لئے اس نے جنگ کی بنیاد دھری تھی۔ یہ ضروری خیال کرتا تھا۔ کہ صلحنامے پر دستخط ہو جائیں۔ اور اسی لئے وُہ اس کا منتظر تھا۔ ورنہ کلیمنشو نے تو یہ اعلان پہلے ہی کر دیا تھا۔ کہ فرانس کے لئے تو صلح داس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں۔ کہ جنگ برابر جاری رہے۔ غرضیکہ اس طرح ۲۳-۱۹۲۲ء کی سردیوں تک فرانس کی یہ نیت سب پر ظاہر ہو گئی۔ اور کسی سے بھی چھپی نہیں رہی ٭

حکومت کا پہلا فرض یہ ہوگا۔ کہ وہ مارکسزم کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کے لئے مناسب طاقت قوت حاصل کرنے کے ذرایع تلاش کرے۔ اور جب تک مادرِ وطن کے خارجی دشمن اسپر مہلک وار کرنے کے لئے آمادہ و کمربستہ ہیں۔ نیز جب تک یہ مارِ آستین ہر گلی کوچے کے گوشے گوشے میں چھپے ہوئے ہیں۔ تب تک کبھی ایک منٹ کے لئے بھی امن و امان کی بیوقوفانہ وحماقت آمیز خواہش کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ کیونکہ کوئی سچی قومی حکومت کبھی کسی ایسی بدامنی کو ناپسندیدہ نہیں سمجھ سکتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہو۔ کہ مارکسٹوں جیسے خونخوار قومی دشمنوں کا ہمیشہ کے لئے کچھ فیصلہ ہوسکے +

میں نے بارہا نام نہاد قوم پرست پارٹیوں سے یہ درخواست کی۔ کہ وہ ہماری تحریک کو مارکسزم سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت دیکر قسمت آزمائی کر لینے دیں۔ مگر میری آواز کا ان کے بہرے کانوں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ وہ سب جن میں ملک کی مدافعتی فوج کا افسر اعلٰے بھی شامل تھا۔ یہی خیال کرتے رہے۔ کہ وہ ہماری نسبت صورت حال سے زیادہ اچھی طرح واقف ہیں۔ حتٰے کہ ایک نہایت مصیبت خیز حالت سے دوچار ہو کر انکی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ اور انہیں بھی اپنی غلطی کا پتہ لگ گیا۔ اسوقت میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کیا۔ کہ اب جرمن بورژوا درمیانہ طبقہ رعایا کے حسن کا بھی خاتمہ ہوچکا ہے۔ اس لئے انہیں اور کسی غلطی کا مرتکب ہونیکی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔ میں کھلے دل سے یہ بھی اعتراف کرتا ہوں۔ کہ اس وقت میرے دل میں اس عظیم الشان شخصیت کے لئے ایک سچی عزت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ جو کہ کوہ الپس کے جنوب میں قیام پذیر ہے۔ اور جس کی قومی الفت اور ملکی محبت نے اسے کبھی اپنے ملک و قوم کے دشمنوں کے ساتھ

کہ ہمارا سنہ ۱۹۱۸ء کا کشت و خون ہماری سنہ ۱۹۱۴ء و سنہ ۱۹۱۵ء کی اس غفلت کا
کا نتیجہ تھا - جو ہم نے مارکسسٹ سانپوں کو اپنی ایڑیوں سے کچلنے میں ظاہر
کی تھی - اسلئے یہ بھی ضروری تھا - کہ سنہ ۱۹۲۳ء کے موسم بہار میں ہمیں ان
مارکسسٹ غداروں اور قوم کے قاتلوں کو تباہ کرنے کا جو موقع نصیب ہوا تھا -
اسے بھی ہاتھ سے کھونے کی ہمیں کوئی ویسی ہی سخت سزا ملتی +

صرف غلطی میں پھنسے ہوئے بورژوا درمیانہ طبقہ (رعایا) کے دماغ ہی
اس ناقابل قیاس حماقت کا شکار ہو سکتے تھے - کہ سنہ ۱۹۱۸ء میں جن مارکسسٹ
درندوں نے بغیر کسی رنج و افسوس کے تیس لاکھ فدایان وطن کی لاشوں کو زینے
کے طور پر استعمال کر کے تخت حکومت تک رسائی حاصل کی تھی - وہ آج اتنے بدل
جائینگے - کہ از خود صحیح و مناسب طریق پر قومی خدمات سرانجام دینے لگیں
گے - کیونکہ یہ امید کرنا درحقیقت ایک ناقابل اعتبار بیوقوفی تھی - کہ وہ
غداران وطن جرمنی جنگ آزادی لڑنے کے لئے اس طرح اچانک ہی سربکف
سورما ثابت ہونگے - حالانکہ وہ کبھی خواب میں بھی یہ خیال اپنے دل میں
نہیں آنے دیتے تھے - کیونکہ مارکسسٹ کے لئے قومی غداری سے
اس طرح روگرداں ہونا ویسا ہی مشکل ہے - جیسے کہ ایک گدھ کے لئے کسی
سڑی گلی لاش سے -

غرضیکہ سنہ ۱۹۲۳ء میں بھی ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی تھی - جیسی کہ
سنہ ۱۹۱۸ء میں ہوئی تھی - اس لئے حالات موجودہ کا مقابلہ کرنے کے لئے جس
پروگرام کا بھی فیصلہ کیا جاتا - اس کی پہلی اور سب سے ضروری شرط یہی ہو سکتی
تھی - کہ جسطرح بھی ممکن ہو - قوم کے جسم سے اس مارکسسٹ خون کو یکدم
خارج کر دیا جائے - اور میرا تو عقیدہ ہی یہ تھا - کہ کسی بھی سچی قوم پرست

روز سے درحقیقت وُہ صحیح معنوں میں آزاد ہو گیا۔ کیونکہ تاریخ عالم میں ہمارے دشمنوں کی فوجیں ہمیں کبھی بھی فتح کرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں اور ہمیں جب بھی شکست نصیب ہوئی ہے۔ اپنے گھر کے بھیدی دشمنوں اور اپنے ہموطنوں کی نالائقیوں و غداریوں کی بدولت ہی نصیب ہوئی ہے +

لیکن ہماری خوش قسمتی سے عین موقعے اور موزوں ترین وقت پر قدرت نے جرمنی میں بھی ایک مہاپرش پیدا کر دیا۔ اس کا نام نامی ہیر کونو تھا جس نے اپنی دلائل اسطرح پیش کیں +

فرانس روہر پر قابض کیوں ہونا چاہتا ہے؟ وہاں کیا دھرا ہے؟ کوئلہ تو کیا فرانس صرف کوئلے کی خاطر روہر کا قبضہ مانگتا ہے؟ ہر کونو کو اس خیال کے سوا اور کون سی بات ایسی آسانی سے سوجھ سکتی تھی۔ کہ روہر میں ہڑتال کرا دینے سے فرانس وہاں کے کوئلے سے محروم رہ سکتا ہے اس لئے اس طرح جلد یا بدیر اسے روہر کے قبضے سے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ سودا اس کے لئے کسی طرح بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتا +

لیکن وہاں سٹرائک یا ہڑتال کرانے کے لئے قدرتاً مارکسسٹوں کی ضرورت تھی۔ کیونکہ یہ کام مزدور کارکن ہی سرانجام دے سکتے تھے۔ اور کونو جیسے بورژوا مدبر کی نظر میں مزدور اور مارکسسٹ مترادف الفاظ تھے۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ وُہ ایک متحد محاذ قائم کرنے کے لئے مزدوروں کو بھی دوسرے جرمنوں کا ہم خیال بناتا۔ چنانچہ مارکسسٹوں نے بھی بظاہر بہت جلد منظور کر لیا۔ کیونکہ ان کی نظر تو کونو کے روپیہ پر تھی۔ اور کونو کی نظر ایک متحد محاذ قائم کرنے کی غرض پر

سودا طے کرنے کی اجازت نہیں دی - اور جو ہر ذریعے و ہر طریقے سے انہیں تباہ کرنے کے لئے جنگ وجدل میں مصروف رہا ہے - کیونکہ جس صفت نے مسولینی کو دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کی صف میں جگہ دلائی ہے - وہ اس کا اٹلی کی ملکیت میں مارکسزم کے ساتھ شرکت نہ کرنے کا اٹل ارادہ ہی تو ہے - جس کی طاقت سے وہ اپنے ملک و قوم کی قومیت کے ان جانی دشمنوں سے حفاظت کر رہا ہے - اسکے مقابلے میں ہمارے جرمن مدبر کتنے ہیچ اور کیسے ناچیز معلوم ہوتے ہیں +

برخلاف اس کے جو روش ہماری بورجیوس جماعت نے اختیار کی - اور جو سلوک انہوں نے مارکسزم کے ساتھ روا رکھا - اس نے شروع سے ان تمام کوششوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا - جو دہر کو دشمنوں کے قبضے میں آنے سے بچانے کے لئے کی گئیں - آن آستین کے سانپوں کو اپنے پہلو میں موجود رکھتے ہوئے فرانس سے کسی مخالفت کا خیال تک بھی اپنے دل میں لانا ایک ایسی فاش غلطی تھی - جس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۲۳ء کے سرما میں ہی اس امر کی بہ آسانی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی - کہ مستقبل قریب میں کیا کچھ ہونے والا ہے -

فرانس کے خلاف ہماری کشمکش کا انجام کیا ہو سکتا تھا؟ ابھی اس سوال پر ہمارا بحث کرنا ہی فضول ہے - کیونکہ جب تک رذہر کے قبضہ کی کوئی مخالفت جرمنی میں مارکسزم کا خاتمہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتی - تب تک ہم کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے - ایک اپنے اس جانی دشمن کے پنجوں سے آزادی حاصل کر کے ہی ہم میں وہ طاقت پیدا ہو سکتی تھی - جس کا دنیا میں کوئی بھی طاقت گلا گھونٹنے میں کامیاب نہیں ہوتی - جس روز بھی جرمنی کو مارکسزم کی غلامی کی زنجیروں سے آزادی نصیب ہوگی - اسی

قربانی کے بعد یہ شرمناک سمجھوتہ ہوگیا۔ تو اس بدنصیب ملک سے یہ افسوسناک عیاری اور دھوکا کئے جاتے پر عوام کے غم و غصے کی آگ ایک دم بھڑک اٹھی تھی۔ اور جرمنی کے کروڑوں آدمیوں کو یہ یقین ہوگیا۔ کہ یہاں کے موجودہ طریق حکومت کی تمام و کمال کایا پلٹ کئے بغیر موجودہ ذلت و رسوائی سے ہماری نجات کسی صورت میں بھی ممکن نہیں۔ مگر اس کے لئے وہ مناسب موقع کے منتظر تھے۔

چنانچہ ۱۹۲۴ء کے عظیم الشان مقدمہ کے موقع پر جو تقریر میں نے کی تھی اس کے آخری فقرے میں میں نے یہ کہا تھا۔ کہ اس ملک کے جج صاحبان اپنے فیصلہ میں خواہ ہمارے اعمال و افعال کی مذمت کر کے خوشی و مسرت حاصل کرلیں۔ مگر پھر بھی تاریخ جو کہ اعلیٰ صداقتوں اور بہترین قوانین کی ایک دیوی ہے۔ اپنی خوبصورت آنکھوں میں آنسو بھر کر آپ کے اس فیصلہ پر زہر خندہ کرتی ہوئی یہ اعلان ضرور کریگی۔ کہ ہم میں سے ہر ایک شخص اس الزام سے قطعی بیگناہ و معصوم ہے۔ جو ہمارے اوپر لگایا گیا ہے۔ اور ہم نے کوئی بھی پاپ ایسا نہیں کیا۔ جس کے لئے کچھ بھی پرائشچت کرنے یا کفارہ دینے کا کوئی فرض ہمارے اوپر عائد ہوتا ہو۔"

میں یہاں ان واقعات کو بیان کرنے کی بالکل کوشش نہیں کرونگا جنکے نتیجے کے طور پر ۱۹۲۳ء کے واقعات رونما ہوئے تھے۔ یا ان کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کیونکہ میں یہ خیال نہیں کرتا۔ کہ دہرانے سے ہمارے مستقبل کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اور پھر چونکہ ان زخموں کو جو ابھی تک اچھی طرح مندمل بھی نہیں ہونے پائے ہیں۔ پھر چھیڑنا اور ان سب لوگوں کے جرائم کا ذکر کرنا بالکل بے سود ہے۔ جنہوں نے کہ یہ زخم لگائے ہیں۔ اور جو شاداب بھی

لیکن اگر ہیر کونو اس وقت روپیہ کے زور سے عام ہڑتال کیلئے متحدہ محاذ قائم نہ کرتا۔ اور اس مقصد کیلئے ہر ایک جرمن سے معمول سے دو گھنٹے زائد کام کرنے کا مطالبہ کرتا۔ تو اسے تین دن میں ہی اپنا مقصد حاصل ہو جاتا۔ کیونکہ بغیر ذاتی قربانی کے کب کوئی قوم آزادی حاصل کر سکتی ہے۔

مگر یہ نام نہاد خاموش مقابلہ PASSIVE RESISTANCE زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ جس شخص کو جنگ کے متعلق کچھ بھی علم نہ ہو اس کے سوا کوئی بھی دوسرا شخص ایسے فضول طریقوں سے کسی قابض فوج کو ملک سے نکال باہر کرنے کا خیال تک بھی اپنے دل میں نہیں لا سکتا۔ اگر روہر کے ویسٹ فیلین لوگوں کو یہ احساس ہوتا۔ کہ اسی یا سو ڈویژنوں کی ایک فوج ذخار بھی ان کی مدد کے لئے کمربستہ ہے۔ تو فرانسیسیوں کو ان کے علاقے پر قبضہ رکھنا کانٹوں کی سیج کی مانند تکلیف دہ ہو جاتا۔ لیکن اب اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جب مارکسسٹ ٹریڈ یونینوں نے کونو کے روپیوں سے اپنی تھیلیوں کو خوب بھر لیا۔ اور تقریباً یہ فیصلہ ہو گیا۔ کہ مقابلے کی اس سست اور دھیمی رفتار کو ایک تیز حملے کی صورت دی جائے۔ تو یہ سب قوم پرست بھیڑیں سرخ بھیڑیوں کی شکل اختیار کر کے اپنے اسی اصلی رنگ و روپ میں ظاہر ہو گئیں۔ جیسا ہمیشہ سے ہی ان کا وطیرہ رہا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر بیچارے ہیر کونو کے لئے اپنے جہازوں میں جا کر گوشہ نشین ہو جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اور اس طرح جرمنی کے بہت سے گذشتہ تجربات میں ایک تجربہ کا اور اضافہ ہو کر اس کی ایک اور امید خاک میں مل گئی۔

لیکن جب یہ تباہی خیز انقلاب شروع ہوا اور کروڑہا روپیہ اور لاکھوکھا نوجوان جرمنوں کی جو اتنے اعتقاد پسند اور سادہ لوح تھے۔ کہ اپنی ریش کے ارباب حل و عقد کی باتوں پر فوراً ایمان لے آتے تھے۔ بیش بہا جانوں کی

تتمہ

زراعت پیشہ آبادی کاشتکاری کے متعلق نیشنل شوسلسٹ ڈیموکریٹک ایسوسی ایشن پارٹی کی پوزیشن

اس کے بارے میں پارٹی کا اعلان

مورخہ چھ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

۱ - جرمنی میں کاشتکاری پیشہ جماعت اور پیشہ زراعت کی اہمیت
جرمن قوم اپنی خوراک کا ایک بہت بڑا حصہ غیر ممالک سے حاصل کرتی ہے
عالمگیر جنگ سے پہلے ان اشیا کی قیمت اپنی مصنوعات کی تجارت اور اس
سرمایہ کی آمدنی سے ادا کرتے رہے ہیں - جو غیر ممالک میں ہمارا جمع تھا
لیکن جنگ کے نتیجے نے اب اس امکان کا خاتمہ کر دیا ہے - اس لئے آجکل

اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اپنے قوم و ملک سے بالکل ایسی ہی سچی محبت کرتے ہیں۔ جیسی کہ ہم۔ لیکن اس وقت وہ راہ راست سے بھٹک اور بہک گئے تھے۔ اور اسی لئے ہمارے طریق عمل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یا اس راستے پر چل نہیں سکتے تھے جس پر کہ ہم چل رہے ہیں۔ اور اس وقت بھی چلنا چاہتے تھے +

کی بے حد گنجائش ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں پڑی ہوئی ہیں۔ اور ان کی سب سے بڑی وجہ ہمارے کسانوں کی روز افزوں قرضداری ہے۔ جو اپنی زراعتی ضروریات کے لئے بھی ضروری سازوسامان بروقت حاصل نہیں ہونے دیتی۔ اس طرح چونکہ زراعت کاشتکاروں کے لئے کچھ بہت منفعت بخش ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے انہیں بھی اس طرف زیادہ پیداوار بڑھانے کے لئے کوشش اور محنت کرنے کی کوئی خاص ترغیب نہیں ہوتی۔ اگر اس صورت حال کی مناسب غور و خوض سے تحقیقات کیجائے۔ کہ زراعت سے کاشتکار کو اپنی محنت و مشقت کا پورا پورا معاوضہ کیوں حاصل نہیں ہوتا؟ تو اس کی وجوہات مندرجہ ذیل معلوم ہوں گی ۔

(۱) موجودہ حکومت کی پالیسی زراعت کے اوپر نامناسب بار ڈال رہی ہے اس کا باعث پارٹی بازی کی سپرٹ اور دنیا بھر کے بازار سرمایہ میں یہودیت کے رسوخ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ وہ درحقیقت آجکل جرمنی کی پارلیمنٹری جمہوریت پر قابض ہو رہی ہے۔ اور وہ اس لئے جرمن زراعت کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔ کہ ایک روز تمام قوم مزدوری پیشہ ہو کر ان کی دست نگر ہو جائے۔ اور ان کے رحم پر زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور رہے ۔

(۲) غیر ملکی کاشتکاروں کا مقابلہ جو بہتر حالت میں زراعت کرتے ہیں اور جرمنی میں تحفظ کی پالیسی نہ ہونے کے باعث جنہیں ہم اپنے مزعدوں کا مقابلہ کرنے سے کسی طرح بھی نہیں روک سکتے ۔

(3) کھتوک فروش آڑھتی اور دکاندار جو کاشتکار اور خریدار کے درمیان

ہمیں اُن غیر ممالک سے آنے والی اشیاء خوراک کی قیمت زیادہ غیر ممالک
سے حاصل کردہ قرضے کی مدد سے ادا کرنی پڑتی ہے جس کی بدولت جرمن قوم
اُن بین الاقوامی سرمایہ داروں کے قرض تلے حد سے زیادہ دبتی جا رہی ہے
جو کہ اسے قرضہ دے رہے ہیں۔ اور یہ صورت حالت جب تک بھی جاری رہیگی۔
جرمن قوم کا افلاس و غربت تب برابر بڑھتے ہی جائینگے۔ اور اسے کبھی
خوشحالی نصیب نہ ہوگی +

اس غلامی سے نجات پانے کا امکان صرف اسی حقیقت میں پوشیدہ
ہے۔ کہ جرمنی اپنی خوراک کی تمام ضروری اشیاء خود تیار کرنے لگے۔ اس
لئے اب جرمن قوم کے لئے اپنی زراعتی پیداوار کو بڑھانا ایک زندگی یا موت کا
سوال بن گیا ہے۔ مزید براں ہماری صنعت و حرفت کے لئے بھی یہ نہایت
ضروری ہے۔ کہ ہماری دیہاتی آبادی کی اقتصادی حالت نہایت مضبوط ہو۔
اور وہ خوب روپیہ پیدا کرنے والی ہو۔ کیونکہ آئندہ ہماری مصنوعات کو بھی
روز بروز اپنے ملکی بازاروں پر زیادہ انحصار رکھنا پڑے گا۔ نیز ہم دیہاتی
آبادی کو ملکی صحت و تندرستی کی وراثت کے محافظ قومی نوجوان بہم رسانی
کا ذخیرہ اور اپنی مسلح طاقت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایک
ہوشیار اور ماہرین زراعتی جماعت کی روز افزوں تعداد کو عام آبادی
کے طور پر برقرار رکھنا ہی ہمارے نیشنل سوشلسٹ پلیٹ فارم ہی سے
اہم اور مضبوط پایہ ہیں۔ کیونکہ ہماری تحریک آئندہ تمام نسلوں میں عوام
کی بہتری و بہبودی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتی ہے +

۲۔ کاشتکاری پیشہ جماعت اور زراعت کی طرف سے
موجودہ حکومت کی لاپرواہی حالانکہ زراعتی پیداوار میں از خود ترقی و نشوونما

لیکن اس نئی اور بالکل مختلف جرمن حکومت میں جس کی قائمی کی ہم خواہش رکھتے ہیں۔ کسانوں اور مزارعوں کے ساتھ وہ رعایتیں مدنظر رکھی جائیں۔ جو کہ ان کا حق ہیں۔ کیونکہ وہی درحقیقت قومی جرمن حکومت کا سب سے بڑا سہارا ہو سکتے ہیں۔

(۱) جرمنی کی تمام زمین جو جرمن قوم کی حاصل کردہ اور حفاظت کردہ ہے۔ بطور ان کی رہائش اور ذریعہ روزی کے جرمن قوم کی خدمت کے لئے ہی مخصوص ہوگی۔ اور جن لوگوں کا اس زمین پر قبضہ ہوگا۔ وہ اسی نقطہ خیال سے خود اس کا انتظام بھی کرینگے۔

(۲)۔ صرف جرمن قوم کے افراد ہی اس زمین کا حق ملکیت حاصل کر سکیں گے۔

(۳) جس زمین کو وہ جائز طور پر حاصل کرینگے۔ وہی ان کی جائداد سمجھی جائیگی لیکن اس حق ملکیت کے ساتھ یہ پابندی بھی ضرور ہوگی۔ کہ اس کا استعمال قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر کیا جائے۔ اور خاص عدالتیں اس امر کی نگران رہیں گی۔ کہ ان شرائط پر ٹھیک طور سے عمل درآمد بھی ہوتا ہے۔ یا نہیں ان عدالتوں میں ان ہی سب لوگوں کے نمائندے شامل ہوں گے۔ جن کا کہ تمام اراضی جماعتوں اور صیغوں سے تعلق ہوگا۔ اور حکومت کا بھی ایک نمائندہ ان کے ساتھ شریک رہے گا۔

(۴) جرمن اراضیات مالی خرید و فروخت کا ذریعہ بن سکیں گی۔ (سب سے اہم نکتہ دیکھو۔ قومی پروگرام ہیرا، اور نہ اپنے مالکان کے لئے کسی نا پیدا کردہ آمدنی کا باعث ہونگی۔ انہیں صرف وہی حاصل کر سکیں گے۔ جو کہ خود انہیں کاشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اسی لئے حکومت کو ہر اراضی کی

بیٹھے ہیں۔ اس خرید و فروخت سے بے حد دلالی اور نفع کماتے ہیں +

(4) کسانوں کو برقی طاقت۔ مصنوعی کھاد اور اپنی دیگر ضروریات کے لئے (جن کی تجارت زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھوں میں ہے) بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے +

اس طرح کاشتکاری سے کسانوں کو جو محدود سا منافع اپنی محنت کے معاوضے میں حاصل ہوتا ہے۔ وُہ بڑھے ہوئے سرکاری محصولات کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی لئے انہیں بہت بھاری شرح سود پر قرض لینے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اور وُہ اس ظلم سے دبا ہُوا روز بروز گہرے سے گہرا نیچے ہی نیچے چلا جاتا ہے۔ اور آخر جو کچھ بھی اسکے پاس ہوتا ہے۔ اسے اپنے قرضخواہ یہودی کے حوالے کر کے خود تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ اس طرح جرمن کاشتکار کو اس کے مال و جائداد سے بے قبضہ کیا جا رہا ہے +

(5) - ہماری یہ خواہش ہے کہ ریش میں حقوق اراضی کا احترام کیا جائے۔ اور جرمنی میں ایک خاص زراعتی پالیسی کو مدنظر رکھا جائے!

رعایا و ملک کے افلاس و ناداری کی اس حالت میں عالمگیر ترقی یا زراعت پیشہ جماعت کی کسی بہتری و بہبودی کی اس وقت تک کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ جب تک کہ جرمنی کی حکومت پر بین الاقوامی سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ اور موجودہ پارلیمنٹری و جمہوری طریق حکومت اس کی امداد پر ہے۔ کیونکہ ان کی دلی خواہش تو یہ ہے۔ کہ جرمنی کی اس طاقت و قوت کو بالکل تباہ و برباد کر دیا جائے۔ جو اراضیات پر انحصار رکھتی ہے +

ج - کسی اراضی پر آزاد کاشتکاروں کو آباد کرنے کی غرض سے جبکہ اس اراضی کا مالک خود اُسے کاشت نہ کرتا ہو -

د - جب کسی قومی مفاد کے پیش نظر (مثلاً سڑک وغیرہ نکالنے یا قومی مدافعت وغیرہ کی غرض سے) حکومت خود اس کا استعمال ضروری خیال کرے جو اراضیات (جرمن قانون کی رو سے) ناجائز طور پر حاصل کی گئی - وہ بلا معاوضہ بھی ضبط کی جائیں گی +

(8) حکومت کا یہ فرض ہے - کہ وہ آبادکاری کی پالیسی کے اعلیٰ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھ کر اراضیات کو جو اسے حاصل ہو سکیں آباد کرنے کی تجویزوں پر عمل درآمد کرتی رہے - اور آبادکاروں کو ایسی شرائط کے ماتحت جو انکی بسر زندگی کے لئے ضروری ہوں - مختلف قطعات الاراضی پر قبضہ دے کر ان کے حق وراثت کو قائم کرے - آبادکاروں کا انتخاب ان کی شہری اور پیشہ ورانہ قابلیت کا امتحان لینے کے لئے ہونا چاہیئے - کسانوں کے ان بچوں کا خاص خیال رکھا جائے - جنہیں اپنے بزرگوں کی اراضیات میں قانوناً کوئی حصہ نہ مل سکتا ہو - (دیکھو صفحہ ۷) +

مشرقی سرحدوں کی آبادکاری نہایت ضروری ہے - وہاں صرف کھیت بنا دیئے جانا، تو کافی نہ ہوگا - بلکہ یہ بھی ضروری ہے - کہ نئی صنعتوں اور حرفتوں کے خیال سے وہاں نئے شہر آباد کئے جائیں - اور بازار منڈیاں وغیرہ بھی قائم کی جائیں - کیونکہ صرف اسی طرح دور دراز علاقوں میں چھوٹے چھوٹے کھیتوں اور کاروباروں کو منفعت بخش بنایا جا سکتا ہے +

حکومت کی خارجہ پالیسی کا یہ فرض ہوگا - کہ وہ جرمنی کی روز افزوں

فروخت میں حق شفع حاصل ہوگا +

نجی طور پر پیشہ ور ساہوکاروں کے پاس زمین گرو رکھنے کا اختیار کسی شخص کو نہ ہوگا ۔ زراعتی ضروریات کے لئے کسانوں کو قرضہ دینے یا دلانے کا انتظام یا تو حکومت خود کرے گی ۔ یا اپنی مصدقہ انجمنوں کے ذریعہ کرائے گی +

(5) تمام اراضیات کے استعمال کے لئے ان کی وسعت اور خاص اوصاف کے لحاظ سے مقرر شدہ سرکاری محاصل قابل ادائیگی ہونگے ۔ اس محصول کے سوا اراضیات پر اور کوئی محصول نہ لگ سکے گا +

(6) ۔ زراعتی پیداوار کی مقدار کے متعلق کوئی سخت اور خاص قانون نہیں بنائے جا سکتے ۔ آبادکاری کے متعلق ہماری پالیسی یہی ہے ۔ کہ ہمیں چھوٹے اور درمیانہ درجے کے کھیتوں کی ایک تعداد کثیر درکار ہے جنہیں ایک وسیع پیمانے پر کاشت کرایا جائے گا ۔ کیونکہ زراعت کو قومی ترقی اور نشوونما میں ایک نہایت ضروری حصہ لینا چاہیئے ۔ اور یہ تبھی حق بجانب ہو سکے گا ۔ جبکہ یہ چھوٹے چھوٹے کاروبار کے ۔ انھو اپنے صحت مند تعلقات قائم رکھ سکیں گے +

(7) حکومت کو یہ حق حاصل ہوگا ۔ کہ وہ مناسب معاوضہ ادا کر کے ہر ایک اراضی یا زمین پر مندرجہ ذیل حالات میں قبضہ حاصل کر سکے +

(ا) ۔ جب کہ وہ قوم کے کسی فرد کے قبضے میں نہ ہو ۔

ب ۔ جب کسی عدالت کے فیصلے سے یہ قرار دیا جائے ۔ کہ اس کا مالک ٹھیک طور پر کاشت نہ کرنے یا اس زمین کے استعمال میں قومی مفاد کو مدِنظر نہ رکھنے سے اپنے حق ملکیت کو زائل کر چکا ہے +

ان انجمنوں کو یہ خدمات سرانجام دینے میں ہر طرح پوری پوری امداد و سہولیت عطا کرے۔ اور خصوصاً مصنوعی کھاد اور بجلی کی طاقت کو چھوٹے بھی سستے داموں پر کسانوں کو بہم پہنچا سکے۔ اس میں کسی طرح دریغ نہ کرے +

3 - مجلس نقطۂ خیال سے یہ ہر طرح حق بجانب ہوگا۔ کہ یہ انجمنیں زراعتی مزدوروں کو بھی تنظیم دیکر انہیں ایک ایسی زراعت پیشہ جماعت کے طور پر منظم کریں۔ تاکہ وہ لوگوں کو ان کے کھیتی کیاری کے کاموں میں ٹھیکے پر مدد دے سکیں۔ حکومت کو ان انجمنوں کے طریق عمل کی نگرانی کرنی چاہیئے۔ نیز ان کے باہمی جھگڑوں کو بہ سہولت ارزاں طریق پر نپٹانے کی صورت پیدا کرنی چاہیئے۔ ساتھ ہی یہ بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ یہ زراعتی مزدور آہستہ آہستہ خود اراضیات حاصل کر کے چھوٹے چھوٹے کسان بن جائیں۔ اس طرح زراعت کی حالت سدھرنے اور ان زراعت پیشہ مزدوروں کے منظم ہونے سے ان کی اجرتیں بھی خود بخود بڑھتی جائیں گی۔ اور اس سے معیار زندگی روز بروز بہتر ہوتا جائیگا۔ جب یہ صورت حال ہو جائے گی۔ تو پھر کسی اور سے کھیتی کیاری میں کام لینے کی کچھ ضرورت نہ رہے گی۔ اور آئندہ حکماً و قانوناً بھی اس کی ممانعت کی جا سکے گی +

4 - زراعت پیشہ جماعت کی قومی اہمیت اس امر کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ کہ حکومت کی طرف سے زراعت کی فنی تعلیم کو بھی ترقی دیجائے۔ اور اس غرض سے نوجوانوں کے لئے زراعتی سکول اور کالج جاری کئے جائیں۔ جن میں انہیں زراعت سے تعلق رکھنے والے ہر صیغہ کی نہایت آسان و پُر کفایت طریقوں پر تعلیم دی جائے +

5 - پیشہ ورانہ سنتکاؤں سے ہی زراعت پیشہ جماعتوں کی

آبادی کی پرورش اور بسر زندگی کے لئے نئے وسیع قطعات زمین حاصل کر کے انہیں آباد کرنے کی کوشش کرے۔

(۴) زراعت پیشہ لوگوں کی اقتصادی و تعلیمی حالت کو بہتر بنایا جائے۔

۱۔ محصولات معاف کر کے اور دیگر ضروری ذرائع استعمال کر کے زراعت پیشہ جماعتوں کی موجودہ مفلسی و ناداری کا فوراً خاتمہ کر دیا جائے۔ قرضہ جات پر کم شرح سود مقرر کر کے اور جبراً وصولی کے خلاف پابندیاں لگا کر قرض کو روکا جائے

۲۔ حکومت کی یہ پالیسی ہونی چاہیئے۔ کہ وہ زراعت کو بطور ایک پیشہ کے منفعت بخش بنائے۔ اور جرمنی کی زراعتی پیداوار کو محصولات و خرچ بار برداری کے بارگراں سے تحفظ بخشے۔ اور قومی تعلیم کی مفید سکیمیں جاری کر کے نیز تجارت درآمد کے متعلق مناسب قوانین نافذ کرا کے کسانوں کی حالت کو بہتر بنائے۔

زراعتی پیداوار کی قیمت مقرر کر کے بازاری اتار چڑھاؤ کو قابو میں کرے۔ اور بڑے بڑے سرمایہ دار، دلال، آڑھتی وغیرہ نے جو لوٹ گھسوٹ مچا رکھی ہے۔ اس کا تدارک کرے۔ اور اس امر کی حوصلہ افزائی کرے۔ کہ یہ سب کاروبار آہستہ آہستہ زراعت پیشہ لوگوں کی اپنی انجمنوں کے ہاتھوں میں آجائے۔ اور ایسی پیشہ ورانہ انجمنوں کا یہ فرض ہو۔ کہ وہ اخراجات کاشتکاری اور پیداوار کو حتی الوسع کم کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس غرض کے لئے کسانوں کو برائے نام معاوضے پر اور آسان شرائط پر آلات زراعت۔ کھاد، بیج۔ مویشی و دیگر جاندار پرورش و افزائش نسل بہم پہنچائیں۔ اور ان کی مزید ترقی و بہتری۔ نقصان دہ کیڑوں و مکوڑوں کے دفعیہ کے متعلق انہیں مفت ہدایت و تعلیم دیں۔ اور کیمیائی تحقیقات وغیرہ کے کام کو روز افزوں نشو و نما دینے کی کوشش کریں اور عوام میں ان کے نتائج کا مناسب پرچار کرتی رہیں۔ وغیرہ وغیرہ حکومت

جدوجہد سے عوام کو کچھ کم وبیش آرام نصیب ہو سکے۔ کیونکہ درحقیقت یہی ہمارے اس نئے اقتصادی نظام کی بنیاد رکھے گی جس کے لئے یہ موجودہ حالات کسی طرح بھی موزوں و مناسب نہیں کہے جا سکتے۔ کیونکہ آزادی کی یہ جنگ کسی ایک پیشے کی بہتری و بہبودی کے لئے ہرگز نہیں لڑی جا سکیگی بلکہ اسمیں تمام قوم کی مجموعی بہتری کو ہی ہمیشہ مدنظر رکھنا پڑے گا۔ اور جو تحریک حصول آزادی کے اس جنگ کو کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔ وہ یہ ہماری نیشنل سوشلسٹ ڈیموکریٹک ایسوسی ایشن پارٹی کی تحریک ہی ہے اسکے سوا کوئی دوسری تحریک یہ معجزہ پورا کرکے نہیں دکھا سکتی۔

دستخط ایڈولف ہٹلر

تمام ضروریات پوری نہیں کی جاسکتیں۔ بلکہ آزادی کے لئے
نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کی سیاسی سرگرمیاں ہی ان ضرورتوں
کو پورا کرسکتی ہیں۔

زراعت پیشہ جماعتوں کے غربت وافلاس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے۔
کہ تمام جرمن قوم ہی مفلس و نادار ہے۔ یہ خیال کرنا بالکل غلطی ہے۔ کہ
مزدوروں کی کوئی ایک جماعت جرمن قوم کی مجموعی حالت میں اپنا حصّہ
لینے سے کسی طرح بچ سکتی ہے۔ اس لئے شہری اور دیہاتی عوام میں
مخاصمت و منافرت پیدا کرنے کا خیال بھی دل میں لانا ایک قومی جرم
ہے۔ کیونکہ وُہ کسی صورت میں بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے
بلکہ نیکی بدی میں ہر طرح اور ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ اور
اسی میں سب کی بہتری ہے +

موجودہ سیاسی حالات میں اقتصادی امداد سے کبھی کوئی مستقل ترقی
رونما نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ سیاسی غلامی ہی عوام کے افلاس کا اصلی باعث
ہے۔ اس لئے سیاسیات کی بدولت ہی ان سب خرابیوں کا مستقل علاج
ہوسکتا ہے۔ یہ پرانی سیاسی تقسیم و تفریق یعنی پارٹی بازی ہی قوم کی موجودہ
و گذشتہ سیاسی غلامی کا موجب بن رہی ہے۔ اور یہ کبھی آزادی کی منزل کی
طرف قوم کی رہنمائی نہیں کرسکتی +

ہماری آئیندہ قومی حکومت میں پیشہ ورانہ سنگھٹن بھی نہایت ہی اہم
اقتصادی خدمات کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ جو گویا اس کا انتظام ہی کر
رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ اب بھی وُہ اس پہلو میں بہت کچھ ابتدائی
خدمات سرانجام دے سکتی ہیں۔ بشرطیکہ حصول آزادی کی اس سیاسی

2 - ہم دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ اپنے تعلقات میں جرمن قوم کے لئے بھی برابرانہ حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس لئے یہ چاہتے ہیں۔ کہ ورسیلز اور سینٹ جرمن کے معاہدہ جات ان کو بالکل منسوخ قرار دیا جائے +

3 - ہم اپنے عوام کی پرورش اور اپنی فالتو آبادی کی آباد کاری کے لئے علاقہ جات (نو آبادیوں) کا مطالبہ کرتے ہیں +

4 - سوائے ہماری قوم کے افراد کے اور کوئی بھی ہماری حکومت کا شہری نہ ہو گا۔ جرمن خون اور نسل کے افراد کے سوا خواہ ان کا عقیدہ کچھ کیوں نہ ہو کسی اور کو جرمن قوم کا فرد نہیں سمجھا جائے گا۔ اسلئے کوئی یہودی کسی صورت میں جرمن نہیں ہو سکے گا +

5 - ملک کی حکومت اور قانون سازی میں صرف ملک کے شہریوں کو ہی حق رائے دہی حاصل ہوگا۔ اس لئے ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ ہر طرح کی تمام سرکاری ملازمتیں خواہ وہ ریش کے ماتحت ہوں یا ملک کی چھوٹی چھوٹی مقامی انجمنوں میونسپلٹیوں وغیرہ کے۔ صرف ملک کے شہریوں کو ہی دی جائیں گی +

6 - ہم پارلیمنٹ کے خرابی پھیلانے والے طریق کے مخالف ہیں جس کے ماتحت "قابلیت اور چال چلن کی کچھ پرواہ بھی نہ کر کے صرف پارٹی بازی کی سپرٹ میں ملازمتوں کو پر کیا جاتا ہے +

7 - ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ حکومت کو اپنا یہ فرض اولین خیال کرنا چاہیئے۔ کہ وہ صنعت و حرفت کو ترقی دیکر حکومت کے شہریوں کے لئے ذریعہ روزگار پیدا کرے۔ اگر ملک کی تمام قومی آبادی کی پرورش اس طرح

ہمارے پروگرام کے پچیس اہم نکات

۲۵ فروری سنہ ۱۹۲۰ء کو نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی نے میونچ کے ہاف بِرا ہوس فیسٹ ہال میں عظیم الشان عام جلسہ کر کے اپنا مندرجہ ذیل پروگرام دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور ہماری پارٹی کے قانون ساخت (کنسٹی ٹیوشن) کی دفعہ ۲ میں اسے ناقابل تبدیل قرار دیا گیا ہے +

پروگرام

رہنمایان پارٹی کا یہ ارادہ ہرگز نہیں۔ کہ جن مقاصد کا اس پروگرام میں اعلان کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ان کے حاصل ہو جانے پر پھر ملک و قوم کے سامنے کوئی اور مقاصد پیش کر کے مصنوعی طور پر عوام کے اندر کوئی نئی بیچینی و اضطراب پیدا کیا جائے۔ اور اس طرح اس پارٹی کی ہستی کو حق بجانب قرار دیکر اسکی موجودگی کے لئے کوئی یقینی صورت پیدا کی جائے +

۱ - ہمارا یہ مطالبہ ہے۔ کہ فیصلہ ذاتی کے حق کی بنیاد پر جس سے کہ دنیا بھر کی تمام قومیں بہرہ اندوز ہیں۔ جرمن قوم کے تمام افراد کو بھی متحد کر کے ایک عظیم الشان جرمن قوم کی بنیاد رکھی جائے +

حاصل ہوئے ہیں۔ وہ سب قوم میں تقسیم کر دیئے جائیں +

14 - ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ عمر رسیدہ بوڑھے لوگوں کی گذر بسر کے لئے مناسب انتظامات کو نشوونما دی جائے +

15 - ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ ایک صحت مند درمیانہ طبقہ قائم کر کے اسے برقرار رکھا جائے۔ اور تمام تھوک تجارت کے کاروبار کو فوراً قومی ملکیت قرار دے کر ان کا مال ارزاں نرخ و آسان شرائط پر چھوٹے چھوٹے سوداگروں کو پٹہ پر دے دیا جائے۔ اور ملک کے تمام چھوٹے چھوٹے مقامات کے افسران ضلع و حکومت ملک کے تمام چھوٹے چھوٹے رسد رسانوں کا حد درجہ خیال رکھیں +

16 - ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ ملک میں ایسی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ جو ہماری ضروریات کے مطابق ہوں۔ قومی ضروریات کے لئے بغیر کسی معاوضے کے اراضیات کی ضبطی کے لئے قوانین نافذ کئے جائیں۔ اراضیات پر سودی قرضے دیئے جانے۔ یا ان کی خرید و فروخت سے نفع کمائے جانے کی ممانعت کی جائے[1] +

---

[1] ۱۳ اپریل ۱۹۲۸ء کو ہٹلر نے مندرجہ ذیل اعلان جاری کیا تھا۔
ہمارے مخالفین کی طرف سے نیشنل سوشلسٹ ڈیماکریٹک ایسوسی ایشن پارٹی کے پروگرام کی مد ۱۷ کی غلط طور پر تشریح کر کے اس کے خلاف جو غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ ان کا جواب دیا جانا نہایت ضروری ہے۔ اسلئے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ:-
نیشنل سوشل ڈیموکریٹک ایسوسی ایشن پارٹی ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرتی ہے۔ اسلئے "بلا معاوضہ ضبطی" کے الفاظ۔ بشرطیکہ ضروریات۔ ان ممکن قانون اختیارات ضبطی کے لئے استعمال کئے ہیں جنکی وہ ناجائز طور پر حاصل کردہ اراضیات یا زمینیں ضبط ہو سکیں گی جنکا استعمال یا انتظام قومی مفاد کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیا جا رہا ہوگا۔ اسلئے قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر یہ ہدایات نافذ کی جائینگی اور سب سے پہلے ان یہودی کمپنیوں کے خلاف استعمال ہوگی۔ جو زمین کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتی ہیں۔ دستخط ایڈولف ہٹلر مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۲۸ء از میونچ۔

ناممکن ہو۔ تو تمام پردیسیوں کو جو ملک کے شہری نہیں۔ ریش کے ماتحت علاقہ جات سے باہر نکال دے +

۸ - حکومت کے تمام شہری اپنے حقوق و فرائض کے لحاظ سے یکساں درجہ رکھیں گے +

۹ - ہر ایک شہری کا فرض اولیں ہوگا - کہ وہ اپنے جسم و دماغ سے کچھ نہ کچھ کام کیا کرے۔ اور اس کا کوئی فعل مجموعی طور پر قومی مفاد کے کسی طرح خلاف نہ ہو۔ بلکہ لازمی طور پر عوام کی بہتری و بہبودی کی خواہش کی حدود میں آسکے۔

اس لئے یہ مطالبہ کرتے ہیں - کہ :-

۱۰ - تمام ایسی آمدنیوں کے صیغہ جات کو مسدود و منسوخ کر دیا جائے جو بغیر کسی جائز کار کردگی کے حاصل ہوں -

مفادات کی ماتحتی کو منسوخ کیا جائے

۱۱ - ہر ایک جنگ کے موقع پر قوم کو جان و جائداد کی جو عظیم الشان قربانی طلب کرنی پڑتی ہے۔ اسے پیش نظر رکھ کر دوران جنگ میں ذاتی دولت و سرمایہ جمع کرنے کی ہر کوشش کو قوم کے خلاف ایک جرم قرار دیا جائے - اس لئے ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں - کہ دوران جنگ میں جن لوگوں نے کسی طرح دولت جمع کی ہے۔ وہ سب بغیر کسی رحم و ہمدردی کے ضبط کر لی جائے +

۱۲ - ہم مطالبہ کرتے ہیں - کہ اب تک کمپنیوں یا ٹرسٹوں کی صورت میں جو کاروبار جاری ہیں۔ ان سب کو قومی کاروبار بنا لیا جائے -

۱۳ - ہم مطالبہ کرتے ہیں - کہ اب تک حقوق تجارت سے جو منافع جات

بچوں کی محنت مزدوری خلاف قانون دے کر قومی صحت کے معیار کو بلند کرنا چاہیئے۔ نیز لازمی کسرت و ورزش کو قانونی طور پر لازمی قرار دیتے ہوئے کھیلوں کے کلبوں کو خوب وسیع پیمانے پر سرکاری امداد دے کر قوم کے نوجوانوں اور مردوں اور عورتوں کی جسمانی صحت کو بہتر بنانے کی توجہ دینی چاہیئے۔

21- ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ تنخواہ دار افواج کو توڑ کر ان کی بجائے قومی افواج تیار کی جائیں۔

22- ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ جو اخبارات جان بوجھ کر غلط بیانیاں کرتے ہیں۔ اور غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں۔ ان کے خلاف قانونی جنگ شروع کی جائے۔ اور ایک قومی جرمن پریس کی قائمی کے لئے سہولت پیدا کرنے کی غرض سے طریق عمل اختیار کیا جائے۔

(الف) جرمن زبان کے تمام اخبارات کے ایڈیٹر اور ان کے ماتحت نائب ایڈیٹرز جرمن قوم کے ہوں۔

(ب) غیر جرمن اخبارات کی اشاعت کے لئے حکومت سے خاص اجازت حاصل کی جائے۔ خواہ غیر جرمن زبانوں میں کیوں نہ شایع ہوں۔

(ج)۔ غیر جرمنوں کو قانوناً اس امر کی ممانعت ہو۔ کہ وہ جرمن اخبارات کی کسی طرح مالی سرپرستی کریں۔ یا ان پر کسی طرح سے رسوخ انداز ہوں۔ اور احکام کی خلاف ورزی کی سزا یہ ہو۔ اس اخبار کو فوراً بند کر کے ایسے شخص یا اشخاص کو ملک بدر کر دیا جائے

17 - ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ ان لوگوں پر بغیر کسی ہمدردی یا رحم کے مقدمات چلائے جائیں۔ جن کی سرگرمیاں قومی مفاد کے خلاف ہیں جو قوم کے سنگدل مجرم ہیں۔ سود خور ہیں۔ منافع خور ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ایسے لوگوں کو خواہ کسی بھی مذہب و نسل سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں سزائے موت دی جانی چاہیئے +

18 - ہم مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ رومن قانون کی بجائے جو دنیا داروں کی مادہ پرستی کا حامی ہے۔ تمام جرمنی میں ایک دوسرا موزوں قانون نافذ کیا جائے۔

19 - اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر کہ ہر ایک قابل اور محنتی جرمن کو اسے اعلےٰ تعلیم ملے۔ تاکہ اس طرح وہ تا حدِ امکان ترقی کر سکے۔ حکومت کو ہماری قومی تعلیم کے موجودہ طریق کے پورے طور پر کایا پلٹ کر دینی چاہیئے۔ تمام درس گاہوں کے نصابِ تعلیم کو قومی ضروریات اور عملی زندگی کے عین مطابق بنانا چاہیئے۔ جس میں ساخت حکومت (سٹیٹ سوشیالوجی یعنی حکومت مجلسی) کا بھی پورا پورا تخیل ہو۔ اور سکولوں میں نوجوانوں کو معمولی سی سمجھ بوجھ شروع ہوتے ہی درجہ بدرجہ حکومت مجلسی کے اصولوں کی ترقی کی تعلیم دی جائے۔ ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ غریب والدین کے ہونہار۔ ذہین اور محنتی لڑکوں کو خواہ وہ کسی طبقہ یا پیشہ سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں۔ سرکاری اخراجات پر تعلیم دی جائے۔ اور ہر طرح اُن کی حوصلہ افزائی کی جائے +

20 - حکومت کو ماؤں اور ان شیر خوار بچوں کی حفاظت کر کے اور

عام قوانین وضع کرے۔ اُن پر عمل درآمد کرانے کے لئے مختلف جماعتوں اور پیشوں کے ایوانات (CHAMBERS) قائم کئے جائیں +

پارٹی ہذا کے تمام لیڈر (رہنما) یہ حلف لیتے ہیں۔ کہ وُہ ان مندرجہ بالا مقاصد کی تعمیل و تکمیل کے لئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے +

میونچ مورخہ ۲۴ر فروری سنہ ۱۹۲۰ء

تمت بالخیر

ایسے اخبارات کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے۔ جو قومی مفاد کے خلاف ہوں۔ ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ جو صاحب فن یا ادیب ہماری قومی زندگی میں انتشار پیدا کرنے کی ذرا بھی رغبت کا اظہار کرے۔ اسی کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ اور جو سنستھائیں ایسے لوگوں کی حمایتی ہوں انہیں فوراً دبا دیا جائے +

23 - ہم ملک میں تمام مذہبی فرقوں کے لئے آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک کہ وہ ہمارے ملک کے لئے خطرناک نہ ہوں۔ اور جرمن نسل کے اخلاقی احساس کے خلاف نہ ہو جائیں +

اس پہلو میں ہماری پارٹی اثباتی عیسائیت (Positive Christianity) کی حمایت کرتی ہے۔ لیکن عیسائیت کے کسی خاص فرقے کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ نہیں کرتی۔ یہ یہودیوں کی سی مادہ پرستی کی سپرٹ کے خلاف برسر جنگ ہے۔ جو ہمارے اندر یا باہر پھیل رہی ہے۔ اور یہ عقیدہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ ہماری قوم صرف اس اصول پر عمل کر کے ہی مستقل صحت حاصل کر سکتی ہے۔ کہ

ہر شخص مفاد قومی کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دے۔

24 - تمام متذکرہ بالا مطالبات کو حاصل کرنے کے لئے ہمارا یہ مطالبہ ہے۔ کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کی جائے۔ جیسے ریخس اور اس کے تمام نظام پر مرکزی سیاسی پارلیمنٹ کی حیثیت سے ناقابلِ اعتراض طاقت حاصل ہو۔ اور مختلف مشترکہ حکومتوں (States of Confederation) کی ریخس جو

منشی پریم چند کی دیگر تصانیف

افسانے

واردات — منشی پریم چند کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ — عہ

زادِ راہ — منشی پریم چند کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ — عہ

پریم پچیسی — منشی پریم چند کے بہترین افسانے — حصہ اول عہ حصہ دوم [illegible]

پریم بتیسی — منشی صاحب کے ۳۲ افسانے — حصہ اول [illegible] حصہ دوم [illegible]

خاک پروانہ افسانے [illegible]

خواب و خیال مجلد " [illegible]

سوز وطن " ۱۲ ار

پریم چالیسی — چالیس افسانوں کا مجموعہ — حصہ اول [illegible] حصہ دوم [illegible]

فردوس خیال افسانے [illegible]

جلوۂ ایثار " ۱۲ ار

دودھ کی قیمت " عہ

ناول

گئودان — منشی پریم چند کا آخری ناول — [illegible]

میدان عمل — منشی پریم چند کا ماسٹر پیس ناول — [illegible]

گوشۂ عافیت ناول مکمل دو حصوں میں ہے ۱۲ ار

چوگان ہستی " " [illegible]

پردۂ مجاز " " [illegible]

غبن " " [illegible]

بازار حسن " " [illegible]

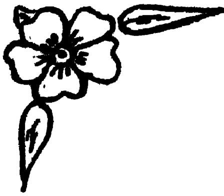
نرملا " " [illegible]

بیوہ " " [illegible]

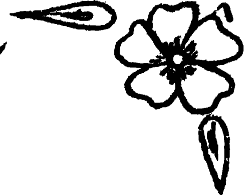
رام چرچا رامائن " [illegible]

روحانی شادی اصلاحی ڈرامہ ۶ر

ملنے کا پتہ:- نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ - لاہور



آخری تحفہ



یہ وہ افسانے ہیں جو منشی پریم چند نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں لکھے تھے انکی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں حسب ذیل امور کے مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے:۔

(۱) مختصر افسانہ ادب کی سب سے زیادہ مؤثر اور دلچسپ صنف ہے۔ جس میں قلم کا مصور کم سے کم خطوط میں زندگی کی جیتی جاگتی۔ چلتی پھرتی تصویر کھینچتا ہے۔

(۲) ہندوستان کے ادیبوں میں مختصر افسانہ پریم چند کا حصہ ہے۔ وہ متفقہ طور پر اس قلمرو کے بادشاہ تسلیم کئے جاچکے ہیں۔

(۳) پریم چند نے ترقی پذیر طبیعت پائی تھی۔ وہ اپنے فن میں یکے بعد دیگرے مدارج کمال کو طے کر رہے تھے۔ ان کا ہر نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہوتا تھا۔

(۴) آخری تحفہ پریم چند کے افسانوں کا نقش آخر ہے۔ یہ اس زمانہ کی تصنیف ہے جب ان کا ذہن زندگی کے نشیب و فراز سے آشنا ہو کر دنیا کے گرم و سرد کا مزا چکھ کر پختہ کار ہو چکا تھا۔ انکا اسلوب بیان منجھتے منجھتے صاف سادہ سلیس اور ہموار ہو گیا تھا۔ اس لئے ان کی ادبی کوششوں کا ماحصل ان کے فنی کمالات کا نچوڑ یہی ۲۵۰ صفحے کی کتاب ہے۔ جسے "آخری تحفہ" کہتے ہیں۔ آخری تحفہ اتنا مقبول ہوا ہے۔ کہ پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا اور دوسرا ایڈیشن قریب ہے کہ ختم ہو جائے۔

حجم ۲۵۶ صفحات۔ لکھائی چھپائی کاغذ نفیس۔ قیمت مجلد صرف ایک روپیہ ۴ر

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

مہاشعراء ایشیاء رابندرناتھ ٹیگور کے دو شاہکار

خاموش حسن

خیالات کی نوعیت۔ مذاق کی پاکیزگی زبان کی لطافت اور نگاہ کی وسعت میں کوئی زندہ مصنف ٹیگور کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ وہ سادگی اور پرکاری بے خودی اور ہوشیاری دونوں کا بادشاہ ہے۔ وہ ساز کے تاروں کو اس طریقہ پر چھیڑتا ہے۔ اور ان سے وہ موسیقی پیدا کرتا ہے کہ پڑھنے والے پر وجد کا عالم طاری ہوجاتا ہے۔ یہ کتاب ان کے بہترین دس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت ...... عہ

پھول اور کلیاں

از

ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور

ڈاکٹر صاحب کے افسانوں کے متعلق لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے (ان) افسانوں کا ترجمہ پنجاب کے کہنہ مشق ادیب منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اعلےٰ کاغذ بڑھیا چھپائی اور دیدہ زیب جلد کے قیمت عہ

ملنے کا پتہ۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

تین رنگین کتابیں

۱ ایکٹرس کی آپ بیتی

مس ملّا کی آپ بیتی ایک تعلیم یافتہ فیشن زدہ لڑکی کے دردناک حالات ایکٹرس کی زندگی ایک ہولناک عریانی میں پیش کی گئی ہے تعلیم کا غلط استعمال عورت کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ وہ اس کتاب میں دیکھئے لکھائی چھپائی دیدہ زیب اعلیٰ کاغذ حجم قریباً ۲۰۰ صفحات (مجلد) ایک روپیہ ......

۲ معیار محبت

جناب سیاح سنامی کے چیدہ و برگزیدہ افسانوں کا مجموعہ جنمیں سے ہر ایک کہانی تخیل کی رنگینی اور بلند پروازی کا نمونہ ہے۔ حسن نشاط کے یہ افسانے ایک بار پڑھ کر آپکو مدت العمر نہ بھولینگے مطلب کی گہرائی۔ درد اور تاثیر ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے لکھائی چھپائی دیدہ زیب اعلیٰ کاغذ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات (مجلد) ایک روپیہ عہ

۳ نازک کٹار

روس کے عہد شاہی کا حیرت ناک افسانہ کسطرح ایک پری پیکر حسینہ نے زار کے دربار تک رسائی کی اور کسطرح اسکا نازک ہاتھ بادشاہ کے سینہ میں خنجر بھر سکتے ہوئے رہ گیا۔ حسن بیان، مناسب الفاظ اور فقروں کی ہمواری کے اعتبار سے بہت کم کوئی کتاب اس پایہ کی آپ نے دیکھی ہوگی۔ اعلیٰ کاغذ رائل ایڈیشن بمعہ سنہری جلد عہ سستا ایڈیشن قیمت صرف ۸/ حجم ۴۰۰ صفحات۔

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

کھانی چاہیئے۔ خوراک کا جسم اور رُوح پر کیا اثر ہوتا ہے۔ تو آپ کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بہت سی بیماریوں سے نجات دلائیگا۔ اس کتاب میں درج شدہ ہدایات پر عمل کرنے سے آپ کا گھر سورگ دھام بن سکتا ہے۔ قیمت ۱۲/

۴۔ **برہمچریہ** یہ کتاب مہاتما گاندھی کی ۴۲ سالہ تجربات کا نچوڑ ہے۔ جو اُردو دان اصحاب کے لئے براہ راست انگریزی سے ترجمہ کر کے چھپوائی گئی ہے اس کتاب میں بتایا گیا ہے۔ کہ برہمچریہ کیا ہے۔ برہمچریہ کی عظمت۔ برہمچریہ کی پابندی کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ برہمچریہ کے سادھن برہمچریہ کے اصلی معنے۔ برہمچریہ کی محدود صورت۔ برہمچریہ کے احساس وغیرہ وغیرہ۔ اہم مضامین پر بڑی وضاحت کیساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مہاتما جی کے ان پریمیوں کے لئے جو اسقدر ضروری اور اہم مضامین پر مہاتما جی کے خیالات سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بہت ہی مفید کتاب ہے نوجوانوں کو خاصکر اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اسکا مطالعہ ان کیلئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ قیمت ۶/

نوٹ :- تینوں کتب اکٹھی صرف ۱۲/ میں خرید فرماویں۔ محصولڈاک بذمہ خریدار

دیگر کتب مصنفہ مہاتما گاندھی

قوم کی آواز	عہ/
سوراجیہ کیلئے ملسکتا ہے	۸/
مہاتما گاندھی کی بنسری	۸/
اہنسا کی راہ پر	۱۲/
گیتا بودھ	۶/
ارد گیہ وگ درشن	۸/
تلاش حق خودنوشت سوانحمری	سے

ملنے کا پتہ

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

مہاتما گاندھی کی نادر زمانہ تین تصانیف

جوکہ آپ نے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر لکھی ہیں جنکا مطالعہ اردو دان اصحاب کیلئے بہت مفید ہے

(۱) **گرہست جیون** یہ نہایت ہی مفید کتاب مہاتما گاندھی جی کے خیالات کا آئینہ ہے۔ جوکہ مہاتما جی نے بڑے غور و خوض اور مطالعہ کے بعد پبلک پر ظاہر کئے ہیں۔ اور جنکا مطالعہ ہر پڑھے لکھے مرد عورت کیلئے فی زمانہ جبکہ دنیا کا رجحان عیش و عشرت کی طرف بہت ہوتا جا رہا ہے بہت ضروری اور مفید ثابت ہوگا آجکل ملک میں کام شاستر کے متعلق بہت سی نئی کتب شائع ہو رہی ہیں جن کو عوام بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بجائے فائدہ کے نقصان اٹھاتے ہیں۔ یعنی غیر قدرتی طریقوں پر عمل کرنے سے اپنی صحت تک کھو بیٹھتے ہیں لیکن اس کتاب کا مطالعہ آپکے رہنما کا کام دیگا اور اس سے آپکو معلوم ہو جائیگا۔ کہ زن و شوہر کے تعلقات اصلی معنوں میں کیا ہیں۔ اور ان پرکار بند ہوتے ہوئے اصلی خوشی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور انسان غیر ضروری عیش و عشرت اور بدچلنی سے بچتا ہوا کیسے سکھ اور شانتی کی زندگی بسر کر سکتا ہے

قیمت صرف ۱۲ آنے۔

(۲) **خوراک صحت** اس کتاب میں ہمیں کیسی خوراک کھانی چاہیئے۔ قدرتی ورزش برہمچریہ نفسانی جذبات۔ صحت اور پوشاک مرض اور اسکا علاج۔ علاج بذریعہ پانی۔ مٹی کے ذریعہ علاج۔ بخار اور اسکا علاج وغیرہ وغیرہ مضامین پر مہاتما جی نے اپنے تجربات کی بنا پر روشنی ڈالی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں۔ کہ آپکی صحت برقرار رہے۔ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ آپ کو کونسی خوراک

برداری کے واقعات اور اسباب ۔

علی احمد جان کی غداری اور ہوس ملک گیری کا حسرت ناک انجام
بچہ سقہ کی زندگی کے حیرت انگیز واقعات ۔ چوری ۔ ڈکیتی ۔ ملازمت
بغاوت بادشاہت ۔ شکست ۔ فراری ۔ گرفتاری ۔ اور اس کا عبرت
ناک انجام ۔

غازی نادر خاں کا عزم و ارادہ اور اس کے نتائج بچہ سقہ سے مقابلہ
دلیرانہ والعزمی ۔ فتحیابی ۔ تخت نشینی ۔ افغانستان کا درخشندہ دور جدید

ایک بے نظیر حسینہ

کی عدیم المثال جرأت و شجاعت ۔ حسن و عشق کے دل گداز مسرت خیز اور نہایت
دلچسپ واقعات نہایت بلند پایہ اور بیحد دلچسپ ناول ہے ۔ اس کی خوبیاں
اسکے مطالعہ پر منحصر ہیں ۔ ناممکن ہے ۔ کہ اسکا ایک باب پڑھ کر بغیر تمام ناول ختم
کئے چین آجائے ۔ ایسا ناول آج تک نظروں سے نہ گذرا ہوگا ۔ اسکا مطالعہ
کرنے والا یہ سمجھتا ہے ۔ کہ تمام واقعات اسکی نظروں کے سامنے ہو رہے ہیں ۔
سینما اور تھیٹروں میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا ۔ جو اسکے مطالعہ سے ہوتا
ہے ۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب کاغذ عمدہ ۔ ٹائیٹل پر دلفریب اور جاذب
نظر تصویر ضخامت ۶۰۰ صفحات باوجود ان تمام خوبیوں کے دونوں حصوں
کی قیمت تین روپے (۳ے) ہے ۔ جلد طلب کرکے ملاحظہ فرمایئے ۔ ورنہ تیسرے
ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا ۔

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

زمانہ حال کی بہترین تصنیف نہایت دلچسپ تاریخی ناول
کابل کی دوشیزہ المعروف انقلاب افغانستان دو جلدوں میں مکمل

بینظیر و مشہور افسانہ نویس مولانا محمد صادق حسین صادق صدیقی سردھنوی کا بہترین اور
اور بیحد دلچسپ شاہکار۔ انقلاب افغانستان کی سنسنی خیز عبرتناک مکمل تاریخ
حیرت انگیز اور بیحد دلچسپ واقعات حسن و عشق کی دل میں چٹکیاں لینے والی۔ پاکبازی
اور دلآویز داستان۔ مولانا موصوف کا طرز بیان۔ واقعات کی ترتیب دلچسپی اور زبان کی
شگفتگی قابلِ تعریف ہے۔

ناول کابل کی دوشیزہ میں کیا ہے؟

افغانیوں کی تہذیب۔ تمدن معاشرت۔ انقلاب افغانستان کے اسباب۔
سازشوں کا جال۔ سازشیوں کی چالیں۔ پیروں اور ملاؤں کا زور۔ بچہ سقہ کے دل
ہلا دینے والے مظالم۔ افغانستان میں بدامنی۔ افغانیوں کی بیکسی و بےبسی باغیوں
کی چیرہ دستیاں۔ جلال آباد قندھار و کابل کی تاراجی۔ شرافت و صداقت کی فتح۔

افغانستان کے پانچ بادشاہ

غازی امان اللہ خاں کی زندگی کا نشیب و فراز۔ ملکہ ثریا سے محبت
ملکہ کا ایثار و استقلال۔ اسکی سرشارانہ الفت کا تاثر غازی کے بے تخت و تاج
ہو کر غریب الوطنی کا دردناک نظارہ۔
شاہ عنایت اللہ خان کی دو روزہ حکومت اور تخت و تاج سے دست

گلدستۂ سخن

یہ کتاب انتظار شدید کے بعد چھپ کر تیار ہوئی ہے۔ اسکے مؤلف پنجاب کے مشہور افسانہ نگار مہاشہ سدرشن ہیں۔ کتاب کے شروع میں قریباً ۵۰ صفحات کا ایک مفصل دیباچہ دیا گیا ہے جس سے اردو شاعری کے مختلف زمانوں کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اور مختلف شعرا کے انداز بیان پر رائے زنی بھی کی گئی ہے۔ جس نے کتاب کی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔ حسب ذیل شعرا کے کلام کا انتخاب بمعہ انکے مختصر حالات زندگی اسمیں دیئے گئے ہیں۔ اس سے اعلےٰ اور پسندیدہ انتخاب اس سے پہلے آپکی نظروں سے نہ گذرا ہوگا۔

(۱) شیخ ولی محمد صاحب نظیر (۲) مولینا الطاف حسین صاحب حالی (۳) ڈاکٹر سر محمد اقبال (۴) لسان الملک سید اکبر حسین صاحب (۵) منشی درگا سہائے صاحب سرور (۶) پنڈت برج نارائن چکبست (۷) مولوی محمد حسین صاحب آزاد (۸) منشی نادر علی نادر (۹) غلام بھیک صاحب نیرنگ (۱۰) چوہدری خوشی محمد صاحب ناظر۔ (۱۱) آغا شاعر صاحب قزلباش (۱۲) منشی سورج نرائن صاحب مہر (۱۳) منشی تلوک چند صاحب محروم بی۔ اے (۱۴) مولوی احمد علی صاحب شوق (۱۵) رشید احمد رشید (۱۶) منشی مہاراج بہادر برق (۱۷) منشی عبد الخالق صاحب خلیق وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ انکے اور بہت سی متفرق نظمیں بھی اس کتاب میں درج ہیں۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں ضخامت کتاب نہ اندازاً ۴۰۰ صفحات کاغذ لکھائی۔ چھپائی نہایت اعلیٰ قیمت مجلد عہ

میرا سفرنامہ روس

اس کتاب کے مصنف میرٹھ سازش کیس کے اسیر کامریڈ شوکت عثمانی ہیں کامریڈ صاحب مہاجرین کے ہمراہ ہندسے روانہ ہوئے تھے۔ اپنی انقلاب پسند طبیعت اور قومیت کے جذبات کے سبب ٹرکی جانیکی بجائے روس جا پہنچے۔ اور چونکہ دوران سفر میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ اسلئے آپکو بیشمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ کے بہت سے موقع پر آپ بال بال بچے۔ کتاب ہذا میں کٹر اور متعصب مسلمانوں کی ہجرت اور خلافت کیمتعلق خیالات پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے مسلمانوں کو ایک عمدہ سبق حاصل ہوسکتا ہے۔

سفرنامہ روس میں افغانستان ترکستان اور روس کی مجلسی اور پولٹیکل ترقی کے نہایت دلکش حالات درج کئے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ افغانستان اور روس اس زمانہ میں کس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس کتاب کا اہم ترین حصہ وہ ہے۔ جو روس سے تعلق رکھتا ہے۔ اسمیں روس کی اس وقت کی حالت اور ترقی کے حالات کو بڑے دلکش اور دلفریب انداز سے درج کیا گیا ہے۔ موجودہ روس نے بہت زیادہ ترقی کرلی ہے۔ موجودہ پولٹیکل دنیا میں وہ ایک انوکھا اور اہم درجہ رکھتا ہے۔ اور دنیا بڑے شوق سے اسکی رفتار کو دیکھ رہی ہے ہندوستان کی عام پبلک جسے اس ملک کی حالت کا بہت کم علم ہے اور جسکی حالت بہت حد تک انقلاب روس سے ملتی جلتی ہے اس کتاب کے مطالعہ سے اپنی معلومات میں بہت کچھ اضافہ کرسکیگی۔ کتاب کا مضمون بہت دلچسپ طرز تحریر دلکش اور پر لطف ضخامت ۱۴۰ صفحات ۱۲

منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم

قسمت کا شکار - بالکل تازہ ناول ۸/
لعل مقدس - ایلن اپلوڈ کے زبردست ناول اکیوز ڈ پرنس کا پُرلطف ترجمہ ۸/
ستم ہے شریا - ڈبلیو کلارک رسل کے زبردست تصنیف انہی دی مین کا پُرلطف ترجمہ ۸/
دغا کا پتلا - مارس لیبلانگ کے مشہور ناول ریٹرن آف آرسین لوپن کا ترجمہ ۸/
چڑیا کی تکلی - ولنسٹان ولیمز کے مشہور ناول تھری آف کلبس کا اردو ترجمہ ۸/
نیلا ہیرا - حیرت انگیز ناول دی بلو ڈائمنڈ کا دلکش ترجمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸/
انمول ہیرا ہے - ایس فلیچر کے لاجواب ناول دی میں ڈالرڈ ڈائمنڈ کا ترجمہ عہ/
زہری بان - حیرت انگیز ناول دی نیشنم فارلنڈن کا بہترین اردو ترجمہ قیمت صرف ۸/

خونی چکر - میری رابرٹ رینہارٹس کے ناول سرکلر سٹیرکیس کا پُرلطف ترجمہ قیمت ۸/
ہیروں کا بادشاہ - جیکس فیوٹرل کے ڈائمنڈ ماسٹر کا ترجمہ عہ/
کرنی کا پھل - دلفریب ناول دی پیرا ایبلرڈ دی دومن کا اردو ترجمہ ۸/
نازک کٹار - رچرڈ ہنری سیویج کے زبردست ناول مائی افیشل وائف کا ترجمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸/
آرسین لوپن جاسوس - مارس لیبلانگ کے مشہور ناول جم بانٹ کا دلکش ترجمہ ۸/
انصاف - ایڈگر والیس کے مشہور ناول فور جسٹ مین کا ترجمہ ۸/
وطن پرست - الیگزنڈر ڈوماس کے مشہور ناول رجنٹس کا اردو ترجمہ ۸/

ہر گھر اور لائبریری کی زینت

چند بہترین اور مشہور ادبی کتب

- میری جد و جہد - ایڈولف ہٹلر عا/۸
- میری کہانی مکمل - پنڈت جواہر لال نہرو للعہ
- تلاش حق مکمل - مہاتما گاندھی سے
- خوراک صحت " ۱۲/
- برہمچریہ " ۶/
- گرہست جیون " ۱۲/
- خاموش حسن ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور عہ/۴
- آخری تحفہ منشی پریم چند بی-اے عہ/۴
- میدان عمل " عا/۸
- گودان " عا/۸
- نگارستان نیاز فتحپوری عا/
- دردناک افسانے نسیم انہونوی عا/
- پیام اقبال عا/
- حیات اقبال عہ
- چندن سدرشن عہ/۸
- پارس " ۴/
- گلدستہ سخن مجلد عا

- مسولینی سوانح حیات عہ/۸
- باپ کے خط بیٹی کے نام جواہر لال نہرو عا/
- سوویٹ روس " عہ/
- مہاتما سقراط بھائی پرمانند عہ/۸
- میری روس یاترا شوکت عثمانی ۱۲/
- سوویٹ روس کا نظام کار منظر علی اظہر عہ/۱۲
- آتش پارے سعادت حسن منٹو ۸/
- آزادی ہند چودھری افضل حق عا/
- انقلاب افغانستان صادق حسین صدیقی سے/
- کلام محروم ۲ حصے منشی تلوک چند محروم عا/۱۲
- تواریخ کانگرس ڈاکٹر پٹابی سیتا رمیہ عا/۸
- شہید میکسوینی ۱۲/
- کسان اور اسکی تنظیم ۱۲/
- بربادی ہند کے اسباب ایس ایس نور ۴/
- ترانۂ وطن ۱۰/
- ترانۂ قوم ۱۲/

ملنے کا پتہ۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

بہترین افسانے

نام کتاب	مصنف	قیمت
خاموشی حسن	ٹیگور	۱۲/
غریب کی آہ	ہری چند	۱۲/
پھول اور کلیاں	ٹیگور	۸/
آخری تحفہ	پریم چند	۱۲/
زادِ راہ	"	عہ/
واردات	"	عہ/
خواب وخیال	"	۸/
فردوس خیال	"	عہ
سوزِ وطن	"	۱۲/
پریم چالیسی ہر دو حصہ	"	[illegible]
پریم پچیسی	"	[illegible]
پریم بتیسی	"	[illegible]
جلوہ ایثار	"	۱۴/
خاکِ پروانہ	"	۱۲/
سدا بہار کے پھول	سدرشن	۱۴/
صبح وطن	"	عہ/
بنگال ہتیسی ہر دو حصہ	"	[illegible]
سولہ سنگار	"	۸/
قوس وقزح	سدرشن	۱۲/
چشم وچراغ	"	۸/
چغتائی کے افسانے ہر دو حصے		[illegible]
معیار محبت	سیاح سنامی	عہ
تین پیسے کی چھوکری		۸/
مجنوں کے افسانے		۱۲/
عروس ادب		عہ/
سوزِ ناتمام		عہ/
لاشوں کا شہر		۸/
نگارستان		[illegible]
موج تبسم		[illegible]
سیلاب تبسم		[illegible]
طوفان تبسم		[illegible]
دنیائے تبسم		۱۲/
عورت		عہ/
طلسمات		عہ/
دردناک افسانے		[illegible]
اندھا دیوتا		عہ/

ملنے کا پتہ:- میسرز نراین دت سہگل اینڈ سنز بک سیلرز لوہاری گیٹ لاہور

گمنام مسافر۔ حیرت انگیز ناول دی سائن آف سیٹر ینجر کا پرلطف ترجمہ ۸؍عا؍

شاہی خزانہ۔ بینظیر ناول دی ہالو نیڈل کا ترجمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عا؍

کارنامہ جات آرسین لوپن بینظیر ناول اکسپلائٹس آف آرسین لوپن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عا؍

ڈاکٹر نکولا۔ مشہور ناول اے بڈ فار چپل کا دلکش ترجمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸؍عہ؍

تلاش اکسیر۔ مشہور ناول ڈاکٹر نکولا کا ترجمہ عا؍

سنہری بچھو۔ سیکس روہمر کے زبردست ناول گولڈن سکاربین کا اردو ترجمہ ۸؍عہ

آتشی کتا۔ دی ہاؤنڈ آف باسکرولیز کا ترجمہ ۸؍عہ؍

قاتل ہار۔ پُراسرار ناول دی ڈائمنڈس کا ترجمہ ۸؍عا؍

آزادی۔ حیرت انگیز ناول دی لاسٹ لاڑ کا ترجمہ عا؍

مقدس جوتا۔ دی کرسٹل آف سیکرڈ سلیپر کا ترجمہ عا؍

تبدیل قسمت۔ دی مین فرام ڈاؤننگ سٹریٹ کا (اُردو) ترجمہ عا؍

مہر خاموشی۔ ہوشربا ناول دی سائن آف سائیلنس کا پرلطف ترجمہ عا

مصری جادوگر۔ پُراسرار ناول فاروس دی "ایجپشن" کا ترجمہ ۸؍عا؍

لعل شب چراغ دلکش ناول مائی سٹر یجنٹ کیس کا دلکش ناول عا

سراب زندگی۔ زبردست ناول وائلڈز آف دی ولڈ کا دلکش ترجمہ ۸؍عہ

گردش آفاق۔ رینالڈس کے جوزف ولٹ کا ترجمہ ۲۰ حصے فی حصہ ۱۲؍

ملنے کا پتہ

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

مشاہیر عالم کی سوانح حیات کا شاندار سلسلہ

سٹالن

روس کے آہنی ڈکٹیٹر کی سوانح حیات جو بچپن میں لڑکوں کا گروہ بنا کر پھل والوں کی دکانیں لوٹا کرتا تھا۔ اور جو آج دنیا میں ایک زبردست شخصیت مانا جاتا ہے۔ عمدہ کاغذ خوبصورت لکھائی چھپائی اور مجلد کتاب کی قیمت صرف ۱۲ ار

روزویلٹ

صدر جمہوریہ امریکہ کی سوانح حیات۔ اس نیک دل آدمی کی زندگی کے حالات جس نے دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے از حد کوشش کی ہے مجلد ۱۲ ار

چیمبرلین

برطانیہ کے مشہور وزیر اعظم کی سوانح حیات مجلد ۱۲ ر آنے

ڈی ویلیرا

آئرلینڈ کے زندہ شہید جس کے لئے باغی کی حیثیت میں پھانسی کی سزا مقرر ہو چکی تھی مگر جسکو انقلاب زمانہ نے صدر آئرلینڈ بنا دیا اور جس نے اپنی ہمت اور شجاعت سے آئرلینڈ کو ترقی یافتہ ملکوں کی صفت میں لا کھڑا کیا ہے۔ مجلد ۱۲ ر آنے۔

ملنے کا پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

پنجاب کے مشہور و معروف شاعر منشی تلوک چند صاحب محروم بی۔اے کا کلام

کلام محروم تین جلدوں میں جلد اول
میں آپ کی اخلاقی ادبی و نیچرل نظموں
کا مجموعہ ہے۔ چونکہ بہت کچھ ترمیم و اضافہ
کے بعد دوسری بار چھپی ہے۔ اور دان
پبلک میں بے حد مقبول ہے پنجاب
گورنمنٹ نے از راہ قدردانی اس
کے مصنف کو دو صد روپیہ انعام
دیا تھا۔ اور ٹیکسٹ بک کمیٹی کی
طرف سے اس کی کافی تعداد خریدی
گئی تھی سررشتہ تعلیم پنجاب اور شمال
مغربی سرحدی صوبہ و بمبئی کے
مدارس کی لائبریریوں کے لئے منظور
فرمایا ہے سررشتہ تعلیم ریاست
ہائے حیدرآباد دکن و کشمیر نے بھی
حوصلہ افزائی کی ہے۔
قیمت حصہ اول عہ ۔ حصہ دوم ۱۲ار حصہ سوم ۱۲ار

قوم اور ملک میں بیداری پیدا کرنیوالی چھوٹی چھوٹی کتب

کتاب	قیمت
ترانہ قوم	۳ر
ترانہ وطن	۱۰ر
انقلابی نغمے	۲ر
نغمہ آزادی	۱ر
گاندھی اروِن سمجھوتہ	۲ر
لاہور سازش کیس مکمل	۸ر
انقلاب بلا تشدد	۲ر
انقلاب مذاہب	۲ر
گول میز کانفرنس	۱ر
انجمن اقوام عالم اور اہل ہند	۱ر
سوراج اب یا کبھی نہیں	۱ر
بھارت سوراج کی راہ میں گورنمنٹ ہند کے روڑے	۱ر

ہمارے یہاں ہر قسم کی پولیٹیکل کتب
مل سکتی ہیں :-

سراج الدولہ

یہ ناول بنگال کے مشہور ناول نویس بابو بنکم چندر لاہری کے ایک مشہور بنگالی ناول بنگیر شیش نواب کا پرلطف ترجمہ ہے۔ جس میں بنگال کے آخری نواب سراج الدولہ کی زندگی کے تمام حالات ناول کے پیرایہ میں درج کئے گئے ہیں۔ سراج الدولہ انگریزوں کا کیوں دشمن تھا۔ انگریزوں کا بنگال سے نکالا جانا۔ کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کرنا۔ بلیک ہول کا واقعہ پلاسی کی جنگ اور دیگر اہم واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول بڑا دلکش اور بار بار پڑھنے کے لائق ہے قیمت ۸/ مجلد

جھانسی کی رانی

ہندوستان کی جان آف آرک مہارانی لکشمی بائی کے صحیح حالات زندگی جس نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں دوست دشمن سے مساوی خراج تحسین حاصل کیا مرہٹی زبان سے بڑی تحقیق کے بعد حاصل کر کے اردو زبان کا جامہ پہنایا گیا ہے اس کتاب میں دکھایا ہے۔ کہ کس طرح حالات نے اسکو مجبور کیا۔ اور کس طرح اس نے مردانہ لباس میں ویرتا سے لڑتے ہوئے راجپوتی آن کو قائم رکھا۔ اپنے ڈھنگ کی اردو زبان میں واحد اور پہلی کتاب۔ قیمت عہ/

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

غریب کی آہ

از

ڈاکٹر ہری چند صاحب ہری

یہ ڈاکٹر صاحب کے بہترین افسانوں کا مجموعہ جس کے پہلے افسانے پر گورنمنٹ کشمیر کی طرف سے بیش بہا انعام دیا گیا تھا۔ افسانے نہایت پاکیزہ اور نصیحت آموز ہیں کتاب بچوں اور عورتوں کے ہاتھ میں بے کھٹکے دی جا سکتی۔ خوبصورت مجلد کتاب کی قیمت صرف ۱۲ ر

بچوں کے لئے چند شاندار کتب

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
مہابھارت سدرشن	۸ ر	مداری کا تھیلہ	۴ ر	امر سنگھ	۶ ر
رامائن بالکوں کیلئے	۱۲ ر	علی بابا چالیس چور	۶ ر	سیواجی مرہٹہ	۶ ر
گھر کی باتیں	۸ ر	کامیابی کے راز	۶ ر	ستی شکنتلا	۶ ر
مہاراجہ اشوک اور راجہ کے فرمان	۱۲ ر	باپا راول	۸ ر	ستی دروپدی	۶ ر
دلکش کہانیاں	۵ ر	نرالی کہانیاں	۴ ر	ستی سیتا	۶ ر
دس کہانیاں	۲ ر	کرشن چرتر	۱۲	ستی ساوتری	۶ ر
گلدستہ	۶ ر	دلچسپ تاریخی کہانیاں	۴ ر	راجکمار پرہلاد	۶ ر
چاند	۶ ر	پنچ تنتر	۶ ر	کرشن سداماں	۶ ر
انوکھی کہانیاں	۴ ر	پرتھوی راج	۶ ر	حقیقت رائے	۶ ر

[illegible]

مستقل خریداروں کے لئے خاص رعائتیں

(۱) آٹھ آنہ ارسال کرنے پر ہر شخص ہمارے کتب خانہ کا مستقل خریدار بن سکتا ہے
ناول ڈیپارٹمنٹ کے مستقل خریداروں کو وغا پتلا ناول سے کتاب کا سپیشل ایڈیشن
ارسال کیا جا رہا ہے جسکا کاغذ بڑھیا اور کتب مجلد سنہری ہوتی ہے۔

(۲) ہمارے ہاں سے ہر سال تقریباً ۱۲ کتب شائع کیجاتی ہیں۔ جن کی مجموعی
قیمت ۲۰ روپے سے ۲۵ روپے تک ہوتی ہے۔

(۳) کتاب شائع ہونے سے پہلے مستقل خریدار کو اطلاع دے دیجاتی ہے
انکی خاموشی رضا سمجھی جاتی ہے اگر کتاب درکار نہ ہو۔ تو تحریر کر دینا چاہئے۔ تاکہ ارسال نہ کی
جائے وی۔ پی بھیجے جانے کے بعد وصول نہ کرنا مستقل خریداری ضائع کر دینے کے
مترادف ہے۔

(۴) دوبارہ درخواست آنے پر بصورت کسی خاص وجہ کے دوبارہ مستقل خریدار
بنا لیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ پہلا محصولڈاک ادا کر دیا جائے۔

(۵) اسوقت تک تقریباً دوسو اردو اور پچاس کے قریب ہندی کتب شائع ہو
چکی ہیں۔ جو مستقل خریداروں کو ¾ قیمت پر بھیجی جا سکتی ہیں محصولڈاک بذمہ خریدار
(ماسوائے سلسلہ ناول تیرتھ رام فیروزپوری جسمیں ڈاک خرچ بذمہ کتب خانہ ہوگا

(۶) ہمارے ہاں سے لمبے چوڑے اور نام نہاد رعایتی اعلان اخبارات
میں شائع نہیں کئے جاتے بلکہ خریداروں کو ٹھوس اور مفید لٹریچر کم سے کم قیمت
پر مہیا کرنیکی کوشش کیجاتی ہے۔

(۷) ہر مستقل خریدار کو کم از کم ۶ روپیہ کی سالانہ کتب ضرور خریدنی چاہئیں
(۸) لٹریچر کے متعلق مستقل خریدار کی رائے کو بھی وقعت دیجاتی ہے
(۹) سکونت کی تبدیلی پر اطلاع دینا ہر حالت میں ضروری ہے جواب طلب امور کیلئے ٹکٹ ارسال کریں
مینجر